

جملہ حقوق محفوظ

غالب نامہ

پہلے

شیخ محمد اکرم ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ ایس۔ (لنڈن)
آئی۔ سی۔ ایس۔

سب ڈویژنل افسر سورت۔ احاطہ بمبئی

۱۹۳۴ء

فہرست

صفحہ			تمہید
۵			تذکرہ
۱۱			
۱۳	۱۸۰۳.....	۱۷۹۶	اکبر آباد
۲۰	۱۸۲۶.....	۱۸۱۳	دہلی
۳۱	۱۸۳۰.....	۱۸۲۶	لکھنؤ - کلکتہ
۴۵	۱۸۴۰.....	۱۸۳۱	باب چہارم
۵۵	۱۸۵۰.....	۱۸۴۱	باب پنجم
۶۶	۱۸۵۷.....	۱۸۵۱	لال قلعہ
۷۳	۱۸۵۸.....	۱۸۵۷	غدر
۸۲	۱۸۶۱.....	۱۸۵۸	باب ہشتم
۹۲	۱۸۶۹.....	۱۸۶۱	چراغ سحر
۱۰۳			تبصرہ
۱۶۱			انتخاب

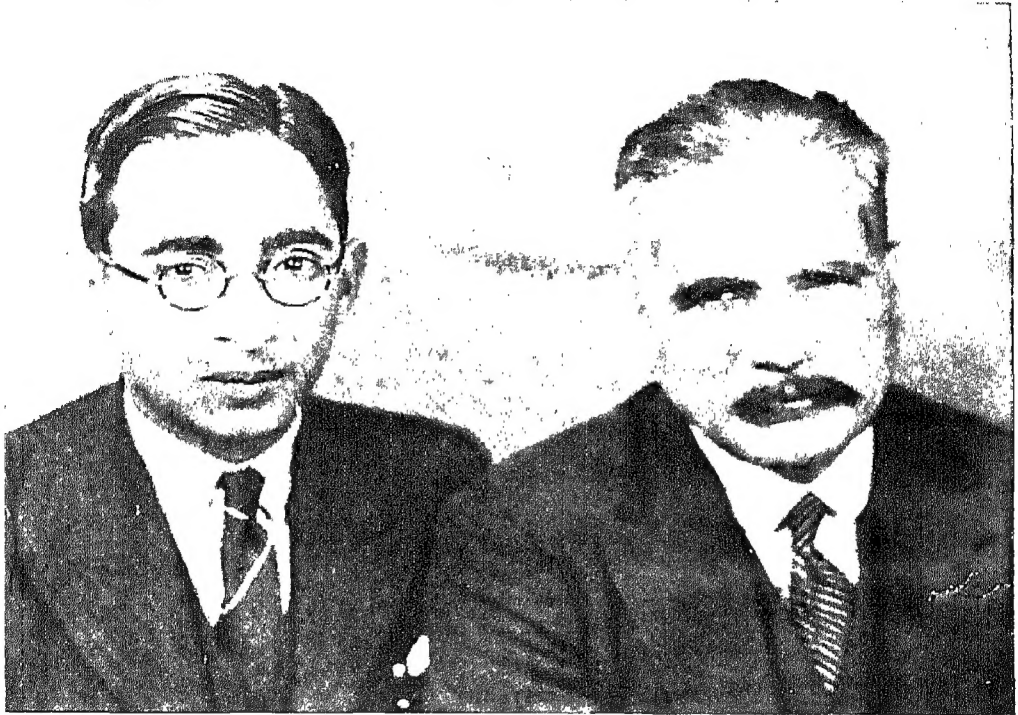
تہ

ترجمان حقیقت علامہ محمد اقبال مدظلہ

کی خدمت میں

ع حدیث اہل دل با اہل دل گو

اکرام



تہمت

یادش بخیر۔ آج سے سات آٹھ سال اُدھر کی بات ہے۔ حصولِ تعلیم کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ حسن اتفاق سے نہایت قابل اور شفیق استاد میسر آئے تھے۔ لیکن شاید اس سے بھی بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ چند ایسے احباب کا حلقہ جمع ہو گیا جنہوں نے بالعموم سائنس، فلسفہ، انگریزی ادبیات اور دوسرے مغربی علوم و فنون میں امتیازی کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن جن کی عزیز ترین خواہش ”گیسوئے اردو“ کی شانہ کشتی تھی۔ ہم جب جمع ہوتے تو گہرے شکستہ ریشے، مار ڈمی۔ سپنگر کے ساتھ ساتھ اقبال۔ غالب۔ حالی۔ ردھی کا ذکر رہتا۔ اور جب ہم شیکسپیر کے متعلق سرواڑا لے لے اور پروفیسر بریڈے کی کتابیں پڑھتے۔ جنہوں نے شعرا و ادب کے مطالعہ کو حیاتِ انسانی کی عمیق گہرائیوں اور اسکے اہم ترین پہلوؤں کا مطالعہ بنا دیا تھا۔ تو ہمیں اپنے تبصرہ نگاروں کی سطحی تنقید پر افسوس آتا۔ جنکے نزدیک فنِ تنقید کا اہل اتنا ہے کہ ایک شاعر کے اشعار میں زبان اور بیان کی خوبیاں بتا دی جائیں اور اسکی چند غزلوں کا دوسرے شعرا کی ہم طرح غزلوں سے مقابلہ کر دیا جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ دیوان سے پہلے ایک طول طویل ویبا چہ میں آرٹ کی قسمیں اور آرٹ کی متعلق چند نظریئے مغربی کتب سے اخذ کر کے درج کر دیئے۔ جن سے شاید پڑھنے والا مرعوب تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اُسکے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہمارا حلقہ احباب بہت وسیع نہیں تھا۔ لیکن جلد ہی ہم میں سے دو کو آئی سی۔ ایس کی کششِ آہام

اور بنگال گئی۔ ہم تین باقی رہ گئے۔ چوہدری محمد علی۔ ممتاز حسن اور میں۔ چوہدری صاحب اسوقت لاہور
 اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل تھے۔ ممتاز اور میں ابھی کالج اور یونیورسٹی کے امتحانات کے چکر سے نہیں نکلے تھے
 ممتاز صاحب بی۔ اے میں فلسفہ عربی اور انگریزی تینوں مضامین میں اول آئے تھے۔ انکی بڑی خواہش تھی
 کہ وہ انگریزی ایم۔ اے میں فسط کلاس حاصل کریں۔ انہیں پی۔ ای۔ ایس کے درجہ میں کوئی ملازمت
 مل جائیگی۔ اور وہ تمام عمر اردو ادب کی گیسو آرائی میں گزار دیں گے۔ لیکن انہیں ایم۔ اے میں فسط کلاس
 نہ مل سکی۔ اور انہیں فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ایک امپیریل سروس یعنی پڑی مجھے فسط کلاس مل گئی لیکن
 محکمہ تعلیم میں کوئی ملازمت نہ ملی۔ ناچار مجھے بھی سول سروس کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ لیکن حسن اتفاق
 سے پیشتر اسکے کہ ہم اس طرح منتشر ہوتے۔ میری اس کتاب کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم تینوں ابھی لاہور
 میں ہی تھے۔ کہ غالب کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی انگریزی کتاب شایع ہوئی۔ اسے پڑھ کر ہم سب کے
 دلوں کو ایک ٹھیس سی لگی۔ ہم غالب پرست ہیں تھے۔ لیکن غالب کی عظیم اور دلادیر شخصیت کا جادو ہم پر
 بھی تھا۔ ہمیں اس کتاب کے بعض حصے بہت تلخ سے معلوم ہوئے۔ ممتاز صاحب کی رائے تھی کہ غالب
 کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی تنقید لقاوانہ غیر جانبداری سے عاری اور معاندانہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا
 چھٹا باب جمیں انہوں نے شاعرانہ عظمت کی مثالیں دی تھیں پسند نہ تھا۔ اول تو جو مثالیں دی گئی تھیں
 ان سب کا میں مداح نہیں تھا۔ دوسرے مجھے یہ طرز تنقید بھی عجیب معلوم ہوتا تھا۔ کہ نقاد بجائے اسکے کہ
 شاعر کے کلام کا حسن و قبح بوجہ خود دیکھے۔ مغربی ادبیات کے چند نمونے مقرر کرے۔ اور جو نظمیں ان نمونوں
 کے مطابق نہ ہوں انہیں ناقص قرار دے۔ چوہدری محمد علی کہتے تھے کہ ڈاکٹر لطیف نے غالب کے متعلق تو
 کتاب نہیں لکھی۔ ان اصولوں پر ایک رسالہ لکھ لے۔ جن کے مطابق ایسی کتاب لکھی جانی چاہئے۔ اب یہ
 کسی اور کا کام ہے۔ کہ وہ ان اصولوں کے مطابق مواد جمع کرے۔ اور کتاب لکھے۔ مجھے چوہدری صاحب کا
 بیہرہ درست معلوم ہوا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ غالب کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھی جانی چاہئے جو ڈاکٹر لطیف
 کے کرشمے معیار پر بھی پوری اترے اور جنہیں مولانا حالی کی میانہ روی اور انکے مقدمہ دیوان کی بالغ نظری
 کی پیروی بھی ہو۔ یادگار غالب مجھے بہت پسند تھی۔ لیکن تسلیم کئے بغیر چارہ نہ تھا کہ اس میں سوانحی تسلسل تریاقاً

فقود تھا۔ اور شاعر کے کئی اہم واقعات زندگی کے متعلق مصنف کا بیان نہایت سرسری اور سن وقوع یا طرح کی ضروری تفصیلات سے عاری تھا۔

میں نے اس کتاب کے لئے ہندوستان میں ہی مواد جمع کرنا شروع کر لیا تھا۔ سب سے پہلی چیز غالب کا یہ ایسا تذکرہ مرتب کرنا تھا۔ جس میں واقعات سن وقوع کی ترتیب سے درج ہوں، وہاں ہفت بیگناہ کی طرح ٹھنڈا نہیں۔ غالب کے اردو خطوط اس مقصد کیلئے بہت کارآمد تھے۔ اس لئے فارسی کلیات نظم و نثر ابغور مطالعہ کرنا پڑا۔ اور میں جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ غالب کی تعلق جو تذکرہ نگاران کی فارسی تصنیفات و دھیان میں نہیں رکھیں گے۔ وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گا۔ چنانچہ میں نے مرزا کے فارسی خطوط و تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا شروع کیا۔ چونکہ وہ اکثر تاریخ تحریر سے معرا تھے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔

یکن جب میں ۱۹۳۱ء میں آکسفورڈ گیا۔ تو وہاں بوڈلین لائبریری میں مجھے ایک ایسی جنتری ملی جس کی مدد سے اگر ہجری سال اور عیسوی سال اور عیسوی معلوم ہو سکتا تھا۔ اور اگر عیسوی اور ہجری دونوں عینوں کی تاریخیں معلوم ہوں تو عیسوی اور ہجری سال معلوم ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کی مدد سے میں غالب کے کئی خطوط کا سن تحریر اور ان کی زندگی کے کئی واقعات (مثلاً تاریخ ولادت، سفر کلکتہ، واپسی وغیرہ) کی صحیح تاریخ عین کر سکا۔ اس کتاب کے علاوہ بوڈلین لائبریری میں اور کئی انگریزی کتابیں تھیں۔ جو اس کتاب کے ابواب سوم اور چہارم مرتب کرنے میں مفید ثابت ہوئیں مثلاً سلیمن کی "سیہ و سیاہت" اور "نائلین کی ایک مشرقی بادشاہ کی خاتمی زندگی" پہلی میں مجھے نواب شمس الدین کے مقدمہ کے حالات ملے اور دوسری میں شاہانِ اودھ کے متعلق ایسی واقفیت حاصل ہوئی جس سے میں خالی کی کسی غلط فہمیوں سے بچ سکا۔ لیکن ان سے بھی قیمتی چیز جو قیام انگلستان میں میرے ٹانہ آئی۔ گلشن بیچار کا ایک بیش قیمت قلمی نسخہ تھا۔ جو پہلے نگار سن و تاسی کے پاس تھا۔ اور اب برٹش میوزیم کی ملکیت ہے۔ اسکی مدد سے میں غالب کی کئی ایسی غزلوں کو تعین کے ساتھ علیحدہ کر سکا۔ جنکا انتخاب سٹنٹن میں ہوا تھا۔ اور جو اس قلمی نسخہ میں موجود تھیں لیکن مجھے جس چیز کی سب سے زیادہ تلاش تھی۔ وہ دیوان غالب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا۔ جو سٹنٹن میں دہلی میں چھپا۔ یہ مجھے انگلستان کی کسی لائبریری میں نہ ملا۔ اور جب میں ہندوستان واپس آیا۔ تو رام پور

اسکی تلاش میں گیا۔ وہاں میں نے دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ دیکھا جو شاعر نے ۱۸۵۵ء میں نواب رامپور کو لکھکر بھیجا تھا۔ اور جس سے نقل کر کے بعد میں متداول دیوان شایع ہوا۔ اسکے علاوہ دیوان غالب فارسی جو ۱۸۶۱ء میں چھپا تھا۔ اسکی ایک نقل ملی۔ پہلا مطبوعہ منتخب دیوان نہ ملا۔ لیکن میری اس محنت اور کوشش کو کامیاب ہونا تھا۔ یہاں سے مجھے یہ اطلاع ملگئی کہ مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ جس میں عام ایڈیشن سے نصف اشعار ہیں پہلی بھیت کے لکھڑ خان بہادر سید ابومحمد صاحب کے پاس ہے۔ یہ انکی بڑی کرمفرمانی تھی کہ انہوں نے مجھے یہ نسخہ عاریتاً دیا۔ اور میں اسکی مدد سے دیوان غالب کی تاریخی تدوین اپنی امیدوں بہتر طور پر کر سکا (یہ کتاب جو سات آٹھ سال کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور جسکی تیاری میں محنت اور اخراجات کی سطح کا نخل نہیں کیا گیا اب ناظرین کے سامنے ہے۔ اگر اسکے ذریعہ سے غالب اور کلام غالب پر زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں سے تبصرہ نگاری کی مثال قائم ہوگئی اور بہادر شاہی دور پر جو پردے ہماری ناواقفیت سے پڑتے جا رہے ہیں کبھی ہٹ کر اٹھ گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں بہت حضرات سے قیمتی مدد ملی ہے۔ لیکن میرے محسنوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ فرداً فرداً سب کی کرمفرمانی کا اعتراف کرنا بہت مشکل ہے۔ میں ان کا مجموعی طور پر ان سطور کے ذریعہ سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اکرام
کمپنی پھل ۵۔ مئی ۱۹۳۶ء

استدراک میں اپنی کتاب اسکالریا چمک چکا تھا۔ اور اشاعت کے متعلق خط و کتابت میں غلام رسول تہرنے بھی غالب کی تعلیق ایک کتاب لکھی ہے۔ جو جلد شایع ہونیوالی ہے اور جس میں غالب کے حالات زندگی اسکی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔ چونکہ میں نے بھی تذکرہ لکھتے وقت زیادہ تلاش و تحقیق فارسی خطوط میں کی تھی۔ مجھے اس امر کا خدشہ پیدا ہوا کہ چونکہ ہر صاحب کی تصنیف اور میری کتاب کے ماخذ ایک ہیں۔ شاید بعض میں بھی ایک ہو جائیں۔ اور اگر انکی کتاب پہلے شایع ہوگئی تو میری بیسویں محنت رائیگاں جاسکتی ہے۔ کوشش کی کہ کتاب بہت جلد شایع کر دوں لیکن صوبہ ممبئی میں دوکی کتابت اور طباعت کے انتظامات نہایت ناقص ہیں۔ اسکے علاوہ میں

سُورت سے باہر دورہ پر تھا۔ اور صوبہ بلوچی میں جب تک برسات کی وجہ سے سب مرگئیں اور راستے بند نہ ہو جائیں
 ہمیں مسلسل دورے پر رہنا پڑتا ہے جب میں سُورت واپس آیا۔ تو انقلاب کے ایک پرچہ میں جو اتفاقاً
 خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب کے دستیاب ہوا یہ پتہ چلا کہ مہر صاحب کی کتاب کی ”چھپائی شروع ہو گئی“
 اب میرے لئے زیادہ کوشش کرنا بسیود تھا۔ باقی ترودات موقوف کر کے میں اس امر کا منتظر رہا کہ مہر صاحب
 کی کتاب شائع ہو تو میں دیکھوں کہ اسکے بعد میری کتاب کی گنجائش سے یا نہیں ۲۸ اگست کو یہ کتاب مجھے ملی
 اسکے پڑھنے سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوئی (مولینا کی کتاب بہت طویل اور مفصل تھی۔ اور انکی نظر بھی عالی کی اُن
 غلط فہمیوں پر پڑ گئی تھی۔ جنکی اصلاح میں اپنی کتاب کی امتیازی خصوصیت سمجھتا تھا اسکے علاوہ چونکہ انکی رسانی
 خاندان لارڈ کے بعض افراد تک ہو گئی تھی۔ غالب کے خاندان اور جاگیر کے قضیوں کمنٹری انکی معلومات مجھے
 زیادہ تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی کتاب میں وہ سوانحی تسلسل برقرار نہیں رکھا تھا جو ایک مربوط اور
 مکمل تذکرہ کیلئے ضروری ہے مثلاً انہوں نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں مرزا کے سفر کلکتہ کا ذکر کیا ہے جو میری
 تحقیق کے مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۳۱ء کو ختم ہوا اور اسکے فوراً بعد پانچویں باب میں رام پور اور میرٹھ کے سفروں کے
 حالات ہیں جو اسکے قریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۵۰ء میں مرزا کو پیش آئے چھٹے باب میں پھر پیش کے مقدمہ کی
 تفصیلات ہیں۔ جن کا ذکر حقیقتاً سفر کلکتہ کے ساتھ ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح مرزا کی زندگی کے
 کئی اہم حصوں کی نسبت (مثلاً ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۰ء تک) کوئی مسلسل بیان نہیں۔ قلعہ سے تعلقات کا ذکر دونوں
 سے زیادہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ مولینا کی کتاب پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ انہوں نے چند عنوانات کی تحت
 میں مرزا کی کتابوں سے اور دوسرے ذرائع سے مفصل اقتباسات جمع کر دیئے ہیں اور کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے مگر ان
 کی کتاب میں مرزا کی مسلسل اور مربوط سوانحی لکھنے کی کوئی کوشش نہیں۔ اور ڈاکٹر لطیف کے اعتراضات کا
 جواب دینا باقی ہے۔ مولینا کی کتاب کا تنقیدی حصہ بھی مختصر تھا۔ اور وہ بھی بیشتر مورخانہ۔ غالب اور کلام غالب
 کے متعلق ادنیٰ تبصرہ چند سطروں سے زیادہ نہ تھا۔ اسکے علاوہ میں نے دیکھا کہ اگرچہ مرزا کے واقعات حیات کے
 متعلق مہر صاحب کی معلومات بہت مفصل اور صحیح تھیں مگر غالب کی تصنیفات سے متعلق انکے اندراجات اکثر غلط
 اور کئی جگہ غلط تھے مثلاً وہ صفحہ ۱۳۹ پر لکھتے ہیں غالب ۱۸۵۰ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لیکر ہارون الرشید

کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا مکمل ہوا۔ اس کا نام ہر نیمروز تھا۔ یہ کتاب جیسا کہ غالب کے دو فاضل خطوط سے جلتا ہے ۵۲ صفحہ میں ختم ہوئی تھی۔ شادی اور گھر بار کی تاریخ تصنیف کے متعلق مولانا کو کوئی واقفیت نہیں۔ اسی طرح منتخب اردو دیوان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی نسبت انہیں کوئی اطلاع نہیں۔ مولوی کریم الدین کا اندراج ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں خان بہادر سید ابومحمد وائے نسخے کی نسبت انہیں کوئی خبر نہیں ہو سکتا نہ ہی طرح اردو اور فارسی دو ادین کے جو ابتدائی قلمی نسخے رام پور لائبریری کی زینت ہیں وہ مولانا کی نظر سے نہیں گزرے۔ بالکل پور لائبریری میں فارسی دیوان کا چوتھی اور نہایت پرانا نسخہ ہے۔ اس کے وجود کے متعلق مولانا کو کوئی خبر نہیں۔ میں نے ان کتابوں کی تلاش میں برسوں محنت کی تھی۔ اور غالب کے اردو فارسی ظلام کی جو تاریخی تدوین مرتب کی تھی۔ اس کی بنا انہیں پر گئی تھی۔

(مولانا مہر کی محنت اور تحقیق و تفتیش کی داد نہ دینا بے انصافی ہے لیکن مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں سیاق پر پہنچا کہ میری کتاب کے دو حصے یعنی مقصرہ اور انتخاب کو تو انہوں نے پھیرا لکھا نہیں۔ پہلے حصہ میں بھی جو کہ بیٹے سوانحی تسلسل خاص طور پر ملحوظ رکھا تھا۔ میری اور ان کی کتاب میں کئی اصولی باتیں مختلف تھیں۔ اور میری خود شائی کہنے یا ادب اردو کی خدمت کی خواہش کہ مولانا مہر کی کتاب پڑھنے کے بعد بیٹے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی کتاب شائع کر دینی چاہیے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ مولانا مہر کی کتاب شائع ہوئی ہے بہت پہلے میری کتاب مکمل تھی مولانا کی کتاب پڑھنے کے بعد چیڈفٹ نوٹ میں نے بڑھادیے اور غالب کی بیوی اور عارف کی والدہ اور والد کے نام ان کی کتاب سے نقل کر دیئے تاکہ علاوہ انہی کتاب میں کوئی اندراج نہیں بدلا اور واقعات کی تفصیل کہ جنوں کا توں بہتے دیا۔

اخیر میں میں جناب سالک کی اس تمنا میں ان کا ہم نوا ہوں کہ خدا تمہارا صاحب کو صحت کامل عطا کرے اور انہیں مرزا کے رفعت تھے میرے سے مرتب کرنے کا موقع دے میرے خیال میں اردو فارسی دونوں زبانوں کے رفعت کا انتخاب ہونا چاہئے۔ اور وہ بھی تاریخی ترتیب سے۔ اگر مولانا اس کام کو ہاتھ میں لیں تو فاضل قیادت کی جو سرسری سی تاریخی ترتیب بیٹے کی تھی۔ یا تاہم تاریخ تحریر متعین کرنے کیلئے جو کتابیں فراہم کی گئیں انہیں مولانا کے حوالے کر سکتا ہوں۔

محمد اکرام
۱۹۳۶ء۔ سورت

تذکرہ

۲۹

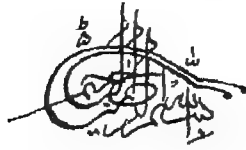
بواویئے کہ دران خضر را عصا خفتست
بسینه می سپرم راه گرچه پا خفتست
غالب

لجم الدوله دبيرالمالك مرزا الحداده خان

غالب



MS. B. 2. 1. 1.
National General Archaeology, DELHI



باب اول

اکبر آباد

مغلوں کا بیشتر زمانہ دہلی میں گزرا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ اکبر آباد میں ہے۔ بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر کا مولد بھی وہی بلدہ حسن و شرف ہے مرزا اسد اللہ خان خود ترکہ کی نسل سے تھے۔ اور ان کے دادا سلطان زادہ رستم خاں ان کے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے انکی پیدائش سے فقط پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔

مرزا شب ششم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دو لہا، پہلے لکھنؤ اور اسکے بعد عرصے تک جید آباد میں ملازم رہے۔ لیکن غالب نے اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کیداں کے پاس آکر ہی بیچ و بیش پائی۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کو اپنے سائے عاطفت میں لیا۔ جب اسکے چار پانچ برس بعد ۱۲۱۶ھ میں چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔

مرزا کو ان کا وارث ہونے کی وجہ سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملتی رہی۔ لیکن مرزا کے خطوط اور معاصرانہ تذکروں سے ظاہر ہے کہ آگرے میں اُن کا قیام اپنے نانا کے ہاں ہی تھا۔

غالب کے ننھیال کی نسبت ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ لیکن ہر خط انہوں نے منشی شیونرائن کو لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھا۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ ایسی آزادی کا اثر ایک نوجوان امیر زادے پر جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو، جو ہو سکتا ہے، وہی غالب پر ہوا۔ اناب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

”اسد اللہ خاں مرزا نوشہ از سمرقند مولدش

جوان قابل و یار باش و درو مند ہمیشہ

بخوش معاشی بسر بردہ و رفاظ رنگین

غہمائے عشق مجاز تریبت یافتہ غمکہ نیاز“

غالب نے اپنے خطوں میں اس رنگین زمانہ کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ ان کے ایک

ابتدائی فارسی قصیدے کی تشبیب ہے:۔

بود آشیان من شکن طرہ بہار

فیض نسیم و جبرہ گل داشت پیشکار

از غنچہ بود محمل نازے برگزار

در رنگ کاروانی بیدار روزگار

فہرست روزنامہ اندوہ انتظار

آں بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار

ہر غنچہ از دم بنضائے شگفتگی

ہر جلوه راز من بقاضائے دلبری

ہم سینہ از بلائے جہا پیشہ دلبران

ہم دیدہ از اولائے مغال شہداں

ہموارہ ذوق سستی و لہو سرور و سُور

پیوستہ شور و شاہد و شمع دئے و قمار

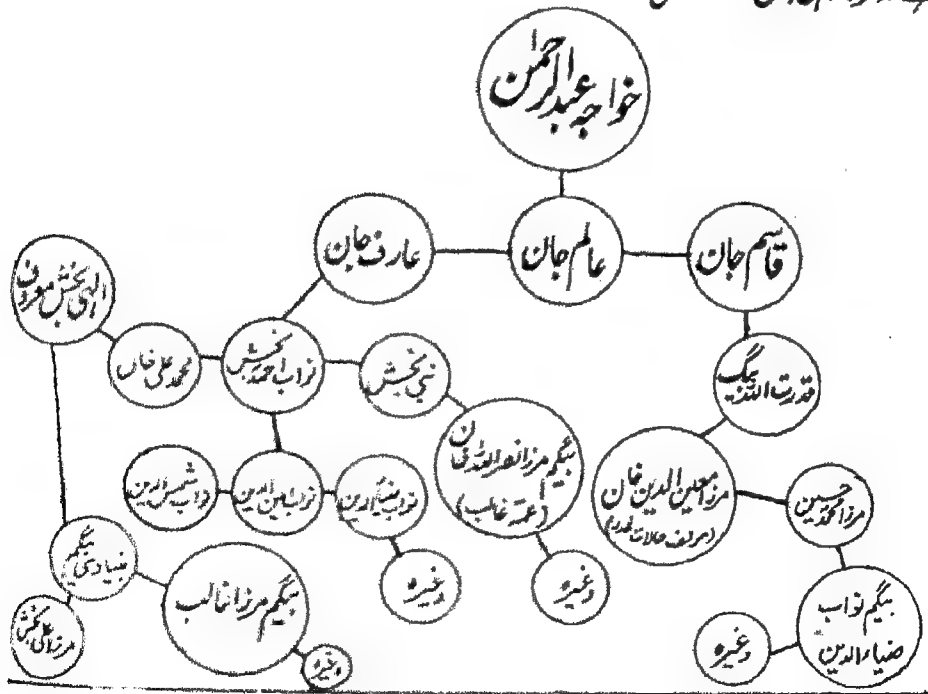
لیکن اس آزادی اور مطلق العنانی کے باوجود مرزا کی تعلیم سے بے پردہی نہیں برتی تھی۔ اور

آگرے میں جو قابل ترین استاد مل سکتے تھے۔ مرزا کی تعلیم ان کے زیر اثر ہوئی۔ انکے ایک استاد نظیر اکبر آبادی تھے۔ اور اگرچہ غالب اور نظیر میں طبعی تفاوت کی وجہ سے غالب پر نظیر کا اثر نہ پڑ سکا۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ غالب جیسا ذہین طالب علم آگرے کے مشہور ترین عالم مولوی محمد سے کسب فیض نہ کر سکے۔ مرزا کی تصانیفات سے یہ جلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی۔ منطق۔ فلسفہ اور علم ہیئت کی علمی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کے ماتحت علم طب کی واقفیت پر تعلیم یافتہ انسان کیلئے ضروری تھی۔ اور مرزا کی تصانیف اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے بخوبی واقف تھے۔ عربی صرف و نحو سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے۔ اور بقول حالی جن ٹیڑھی رویوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں غزلگوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم سے واقفیت سے زیادہ جو چیز مرزا کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرتِ اظہار ہے۔ انہوں نے ۱۱ برس کی عمر میں ہی فارسی شعر کہنے شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری فارسی کتابیں زیر مطالعہ رہی تھیں۔ فارسی سے دلچسپی مولوی محمد معظم کی شاگردی کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی۔ لیکن غالب اس بارے میں ملا عبدالعزیز ہرمز کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ مرزا اور ہرمز کے تعلقات بہت واضح نہیں۔ ہرمز سنہ ۱۱۸۷ھ کے قریب آگرے میں سیاحانہ آیا تھا۔ وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا۔ اور جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی آئے تو وہ بھی ہمراہ تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا ہو گا۔

مرزا اپنی تیرہ برس کے تھے۔ کہ میر محمد کاظم ہقیر جو ولی عہد شاہ دہلی ظفر کے استاد تھے ایکسپارت پرائفٹن صاحب کے ساتھ سندھ گئے اور انکی جگہ ذوق ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت ولی عہد کے استاد کا مشاہرہ چار روپیہ ماہوار تھا۔ لیکن چونکہ ولی عہد کی تخت نشینی کے وقت اسکے استاد کا استاد شاہ ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اس تقرر سے مرزا کا

راستہ بند ہو گیا۔ جب ہم یہ دھیان میں رکھتے ہیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ کہ ذوق کی زندگی میں غالب کا استاد شاہ نہ ہونا بہادر شاہ کی بد ذوقی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اتفاقی حوادث کا نتیجہ تھا۔

لیکن غالب کیلئے اس سال کا اور بھی اہم واقعہ مرزا آہنی بخش معروف کی صاحبزادی امرا بیگم سے شادی تھی۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو انہوں نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو دائم سخت ہی سمجھتے رہے۔ اور "اُڑنے" سے پہلے گرفتار ہو جانا انہیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کے لئے یہ شادی ہزار آسانوں کا موجب ہوئی۔ اور ان کی زندگی کے اکثر واقعات سمجھنے کیلئے مرزا ہی ہے کہ مرزا الہی بخش کے خاندانی حالات ذرا وضاحت سے بیان کر دئے جائیں۔



غالب نامہ

غالب کے خسرو مرزا الہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے "آب حیات" میں کئی صفحے لکھے،
ذوق کے شاگرد تھے۔ اور نہایت پاکیزہ اور موثر شعر کہتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش جہ
نے لارڈ لیک کی فتوحات میں نام پیدا کیا تھا۔ مرزا الہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب
اولاد سے غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئیگا۔ لیکن مندرجہ بالا شجرہ پر سرسری نظر ڈا۔
سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مرزا کی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی۔ جو نہ صرف جاہ و ثناء
کے لحاظ سے ممتاز اور رو بہ ترقی تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔

غالب نے قیام آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخہ حمید یہ میں محفوظ ہیں بیکر
فیصلہ کرنا کہ کون سے آگرہ اور کون سے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں آ
شعار کے دو تذکرے ہیں۔ "تذکرہ سرور" اور "عیار الشعرا" جن میں غالب کو اکبر آباد کا ساکن
ہے۔ لیکن ان فلمی نسخوں کی تاریخ کتابت موجود نہیں! اور چونکہ "تذکرہ سرور" کے مصنف
غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوئی رہی۔ ناممکن نہیں کہ اس میں کتنا
ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس میں تذکرہ
کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخہ بھوپال میں بھی نہیں اور کئی اشعار ایسے
جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً۔

نیا ز عشقِ خرم سوز اسبابِ ہوس بہتر جو ہو جائے نثار برق مشقتِ خارِ خس بہتر
جگر سے ٹوٹی ہے سوئی ہوئی سناں پیدا دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پسیدا
"عیار الشعرا" میں جو خوب چند "ذکا" نے اپنے استاد شاہ نصیر کی مرزا بخش پر لکھی۔ غالب
متعلق ذیل کا اندراج ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا ذیشان مخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف
مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین خاں کسیدان ساکن بلدہ اکبر آباد
شاگرد مولوی محمد معظم۔ شاعر سی ہندی"

اس تذکرہ میں دو شعرا ایسے انتخاب ہوئے ہیں۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے نہیں گزرے۔
 زخمِ دل تنے دکھایا ہے کہ جی جلنے ہے ایسے ہنسنے کو نہ لایا ہے کہ جی جلنے ہے
 صبا نگاہ طمانچہ طرف سے نبل کی! کہ روئے غنچہ گل سوئے آشاں پھر طے

ان تذکروں کے قلمی نسخے ہندوستان کے چند کتب خانوں میں بھی ہیں۔ ان میں کوئی ایسا مل گیا
 جس پر تاریخ کتابت درج ہوئی تو مرزا کے چند نہایت ابتدائی اشعار کے متعلق کہا جاسکے گا۔ کہ
 وہ کس عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ تاہم اب بھی اتنا یقینی ہے کہ مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر
 میں اردو اور دس گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً
 ان اشعار کا مقدمہ حصہ جنہیں مرزا نے دس پندرہ سال بعد دیوانِ ریختہ سے حذف کیا۔ اگر سے
 میں ابھی لکھا جا چکا تھا۔ ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالاتِ احمد اور دوسرے میں غالب
 کے تحت میں دئے ہوئے ہیں۔ مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔
 اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اردو میں بھی غالب
 تخلص لکھنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص
 تسلیم رکھا۔ اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے چند ایک بعد کی غزلوں میں آسم بھی استعمال کیلئے۔
 مرزا کا دہلی آنا جانا اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ ان کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی۔
 لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کس زمانہ میں وہ متقدماً آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے۔ البتہ ان کے
 چند خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً پندرہ سولہ برس کے ہونگے۔ جب انہوں نے آگرہ چھوڑ کر دہلی
 میں رہائش اختیار کی۔ لیکن چونکہ انھیال آگرہ میں تھا۔ وہاں بھی اکثر شجاستہ اور دیرینہ قریبی
 اس زمانہ میں انکی والدہ زندہ تھیں۔ اور انھیال خوش حال۔ ایسی حالت میں ان کا آگرہ چھوڑنا
 ممکن ہے طلبِ علم کی خاطر ہو۔ جس کے لئے دہلی کی نفعا آگرہ سے زیادہ سازگار تھی۔ یا پوری
 کے میکہ سے کسی ایسی خواہش کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس زمانے کے متعلق انہوں نے ایک اردو خط
 میں لکھا ہے:-

”روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا کبھی کچھ الور سے دلوادیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھجوا دیا۔“

مرزا کی پھوپھی کے متعلق کسی تذکرہ نگار نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اُن کی چچی جو اُن کی بیوی کی پھوپھی بھی تھیں۔ نواب احمد بخش کی ہمیشہ تھیں۔ ممکن ہے انہیں کی طرف مودبانہ اشارہ ہو۔ اور قرین قیاس بھی یہی امر معلوم ہوتا ہے کہ آگرے سے آکر مرزا اپنی بیوی کے اقلب کے ہاں مقیم ہوئے ہونگے۔ اور ”زندانِ دہلی“ کی حراست بھی اسی مقدمہ کے سلسلہ میں ہوئی ہوگی۔ جس کا فیصلہ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو سنایا گیا تھا۔

مرزا کے اس زمانے کے حالات کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھے۔ اور نہ ان کے اس زمانے کے خطوط محفوظ ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ادبی عظمت کی بنا اسی زمانے میں پڑی۔ ہم ان کے گرد و پیش کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ آئندہ باب میں درج کریں گے۔



۱۔ مرزا نے فارسی خط و کتابت پر جو رسالہ لکھا۔ اس میں نواب احمد بخش کو ”عظم عالی مقدار“ لکھا ہے اس صدمت میں نواب کی ہمیشہ کو پھوپھی لکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی۔

باب دوم

دہلی

مرزا کا دہلی میں آنا جانا اسی وقت سے شروع ہوا۔ جب شاہ عالم ثانی جنہیں غلام قادر علی نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا تخت شاہی پر متمکن تھے۔ روہیلہ کی بغاوت کے بعد دہلی میں نہیں کا اقتدار بڑھا۔ تو سندھیلے انہیں قید خانے سے نکال کر قلعہ میں بادشاہی تخت پر بٹھادیا۔ اور اسکے بعد جب سندھیلے میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی ظم و سق قائم ہوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ مسٹر آرچبیا لڈسٹین ریڈیفنٹ دہلی۔ بادشاہ کے بذبات کا برات میں خیال رکھتے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی۔ بادشاہ کی جو فرائض کی جاگیر میں قیام انکی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں سکوں پر بادشاہ کا ہی نام ہوتا تھا۔ اور جائیدادوں اور زمینوں کی دراشت پر بادشاہ کی تہر توشیح کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۵۷ء میں ہوئی اور انکی بجائے شاہ اکبر ثانی جانشین ہوئے۔ انکے زمانہ میں سندھیا لڈسٹین کی پاسی قائم نہ رہی تھی۔ لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ اور شہر میں بھی شاہی جہاز اور سواکی

کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا۔ جو اس سے پہلے تھا۔ علاوہ انہیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہ شہنشاہ سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہتے۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو انکی ملاقات بادشاہ سے اسی وجہ سے نہ ہو سکی کہ بادشاہ نے انکو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا۔

قلعہ سے قطع نظر اسوقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانہ سے بہت مختلف تھی۔ شہر کے گرد اگر فصیل تھی۔ اور سارا شہر اس کے اندر آباد تھا۔ شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دیئے جاتے۔ جہاں شہر دہلی کا موجودہ شیشن ہے۔ وہاں اس زمانے میں مکانات تھے اور غدر سے پہلے ایک آباد محلہ تھا۔ جہاں امرا دار اکین سلطنت رہتے تھے۔ چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی۔ جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دہلی میں مرہٹوں کا راج رہا۔ شہر اور شہر کا قرب و جوار لیسروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں تھا۔ جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں قدرتی اسباب کہ علم دفن عروج نہ پائے چنانچہ دہلی میں جو کوئی شہر و سخن یا کسی اور فن میں نام پیدا کرتا۔ اسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لی جاتی۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا نظم و نسق قائم ہوا۔ تو نہ صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ علم دفن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حسامی ”دارالخلافت دہلی میں چند ایسے اہل کمال جمع ہو گئے۔ جنکی صحبتیں اور جلسے عہدی اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے۔“ سر سید احمد خاں نے آثار العناوید میں اس زمانے کے اکابر علما اور شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعرا میں شاہ نصیر ذوق۔ مومن۔ علما میں شاہ عبدالعزیز شاہ اسماعیل شاہ عبدالقادر حضرت سید احمد بریلوی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ اہلباء میں حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں حکیم ضامن اور نقادوں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفہ موجود تھے۔ اور یہ دہی لوگ ہیں جن کے زیر اثر مرہٹہ کی حالی۔ نذیر احمد۔ آزاد۔ ذکا۔ افندہ۔ داغ کی تربیت ہوئی۔ جو اگرچہ خود پرانے نظام کے پروردہ تھے

تیس سال کے عرصہ میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دیئے۔ تو ہمیں غالب کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہر تانبے جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جسکی نادافیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معرہ بکرہ ہوئی ہے حالی اس زمانے میں دہلی آئے جب یہاں پت چھڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم اے کدھنی غم و ہزن کی تیسے اک عالم میں غم
تھے ہنر و تج میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم تھا افانہ تیرا جاری ہند سے تماشہ دروم
زیب دتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا نام روشن تجھ سے تھا غناط و بغدا کا

تیری طینت میں ولایت تھا مذاق علم و دیں جیسے امی تجھ میں تھے۔ عالم نہ تھے ایسے نہیں
ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ ہیں تھی محدث خیز اسے پاؤں تخت تیری سرزمین
تھا لطف بھی سلمہ تیری خاک پاک کا یہی وقت تھا ایک ایک نقیہ اس خاک کا

طب میں گورناریوں کا سب سے آگے تھا قدم آن کر اس نے بیا تھا دوسرا تجھ میں بنسم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم بھرتے تھے تیرے اہلباحی میحالی کا دم
ہند میں جاری تھی سے طب یونانی ہوئی شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم جن میں تھی اسلامیوں کی یاد سو عالم میں غم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم تھیں تیرے پر تیری برائے تھے ان کے جہوم ہجوم
آئی گلشن میں نہ تیرے جہل کے فصل خواں تیری سرحدیں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دور آخر میں کہ تیرا سب تھا سب جل چکا
خاک نے یاں پھر تیری اُگلے وہ لعل بے بہا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سالیہا
جس نے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عبدالاحسن کا سماں آنکھوں میں سب کی چھایا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و کنت قریب کی گونج میں کچھ باقی نہ تھی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی
پر نہ کی عرض ہنریں تو نے اب بھی کو تھی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری

علم دین و شہر و حکمت طب و تائید و نجوم
ڈال دی پھر تو نے اپنی چار سو ہنریں میں مہم

جن جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ ریفارمیشن (REFORMATION یعنی اصلاح مذہب) اور رینائیسنس (RENAISSANCE یعنی حیاتیاتی) کی دو تحریکوں سے واقف ہونگے۔ جنہوں نے سولہویں صدی میں دہائی نئی روح پھونک دی تھی۔ اور علمی اور مذہبی نقطہ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ مرزا جس وقت دہلی آئے یہاں بھی وہی حالات رونما تھے۔ جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کاپیا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپ خانہ کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی۔ اور اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ دہلی میں چھاپہ کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعت علم کو وہی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہوا۔ "رینائیسنس" کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی ابتدا میں سمید مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے دہلی اور اسکے ساتھیوں کو سخت ایذائیں پہنچانی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ کرنے پر شاہ ولی اللہ کو تنگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان کی جرأت اور قابلیت سے سترہویں صدی میں ہی ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہو گیا۔ جس کیلئے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی "رینائیسنس" کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی بجگہ اردو

رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہنچاتے تھے مارو و نثر کی سب سے پہلی کتابیں قرآن مجید کا اردو ترجمہ تھا۔ جسے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے سترہویں دہائی سے شائع کیا۔ علاوہ ازین حطیح مغربی ریناٹینسن کی ایک اور قابل ذکر بات درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرہ آفاق تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیز کی ذات والا صفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی۔ صحیح قوت فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی ریناٹینسن کی ایک قابل احترام ہستی ایرازمس (ERASMUS) سے بہت مشابہ ہیں۔ اور جن کے درس کیلئے کشمیر۔ افغانستان اور بلخ بخارا سے طلباء نکلتے آتے تھے۔ ان کے ملقبہنر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ نہ نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہنچتے تھے۔ چنانچہ جب مرکار انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا۔ اور لوگ وہاں اولا د بھیجنے کے متعلق متامل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے دہلی تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علیگزہ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور مرکار کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتویٰ دیا۔

جنرل سیلین جو ٹھکی کے افسدہ کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے بھٹنے کا اتفاق عام پریمین افسردہ سے زیادہ ہوتا رہا۔ اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں: "دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی۔ جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جسطرح ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی ہیں۔ وہ بڑے مہربان اور مستعدی ہوتا ہے وہ اپنے زکوٰۃ کی اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ عربی اور فارسی زبانوں میں سمجھتے ہیں۔ اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے پاس شدہ طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ اس کی نسبت کہتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کے پاس شدہ طالب علم اظلالین بقراط۔ جالینوس اور بوعلی سینا کی نسبت کہتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کے پاس شدہ طالب علم

جنرل سلین نے ایک اور جگہ لکھا ہے، "ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے۔"

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم سے یا اکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پیست نہیں تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جاسکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جن معلموں کے حلقہ درس سے سرسید، حالی، آزاد، داغ، شیفتہ (اور غالب!) دستاویضیت بااثر کر نکلیں۔ وہ اپنے درس و تدریس پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریک اصلاح تھی جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک "ریفارمیشن" کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے لکھا ہے کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو یورپ کی غلامی سے نجات دلائی۔ اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید کی مخالفت میں تھی۔ اور سید احمد بریلوی نے ان فضول اور مضرتوں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں، یکوشش کر کے زمرہ مذہبی بلکہ معاشرتی نقطہ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا۔ ہمیں اس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ماحول سمجھنے کیلئے اس کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں تمام اہل الرائے یا اس تحریک کے طرفدار تھے یا مخالف۔ شاہ نصیر دہلوی نے جن کی خوش اعتقادی کی آزادتے آب حیات میں کئی مضحکہ خیز مثالیں دی ہیں اُن ایک کے خلاف نظمیں لکھیں۔ برخلاف اسکے مشہور شاعر مومن مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ اور دیوان مومن کا آغاز مولانا کی تعریف سے ہوتا ہے۔ غیر مقلدین میں سب سے زیادہ رسائل شاہ اسماعیل اور سرسید احمد خاں نے لکھے۔ اور مقلدین کی ترجمانی مولوی فضل حق نے کی۔ جو قدیم علم پر و خیر آبادی خاندان

کے رکن تھے۔ اور غالب کے نہایت عزیز دوست۔ مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی حصہ لیا۔
 اور عقائد و بائیس کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی۔ لیکن جیسا کہ عالی نے یادگار غالب میں واضح
 کیا ہے ان کا اپنا نقطہ نظر شاہ اسماعیل سے بہت ملتا تھا۔ اس مثنوی کے مصائب بہت کم نہیں
 ہیں اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی تقابلی ہے۔ جو شاہ اسماعیل اور مرزا کے مابین نقطہ نظر
 میں تھا۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد کیا ہیں لیکن نشان کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف
 جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قابل تھے۔ لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے
 تھے۔ وہ یا تو رسوم و عقائد کا وہ ملو مار تھا۔ جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا اگر اہل
 کی کو رائے تقلید۔ شاہ اسماعیل اس میں کسی کے بھی قابل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصانیف
 پڑھتے ہیں تو خیال برتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے صادر اور مسلک سستیوں کی مخالفت
 کر رہے تھے۔ اور جس بیباکی سے صدیوں کے معبودیت گزارے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پر
 نہ ہو۔ اور اس کی طبعی آواز خیالی اور راسخ ہو گئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی
 راہیں مختلف تھیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید
 کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود غنیمت اور غنیمت شہر تو فی میں استادوں پر آزادانہ گفتگو
 کی۔ اور صاحب شاہ بڑے بڑے بزرگوں کے نام لگاتار لکھتے تھے۔ مگر خود انسان تھے۔ اور
 غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہتے وہ سب سچ نہیں۔ اور ہم
 پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی۔

ان دونوں ترکیبوں کا مرزا پر جو اثر ہوا ہو گا۔ وہ تو بیشتر ذہنی ہے۔ لیکن وہی آنے سے جو
 اثر ان کی شاعری پر ہوا۔ وہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اگر کسی میں شعر اور شعور فہم حضرات کی
 وہ کثرت نہ تھی جو وہی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب و غریب اشتہار پر جب یہ ایک معترف ہوتا تو
 وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو دیکھ کر ایک عجیب و غریب لکھی تھی۔
 مشکل ہے کہ میں کام میرا ہے وہی
 آسمان پہن لی کہتے ہیں ذرا
 حرم مستمل در گرد کریم مشعل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولینا فضل حق اور دوسرے مسلمہ استادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے مہر جھکانا پڑا۔ اور جرح مندرجہ بالا رباعی کا دوسرا مصرعہ تبدیل کیا۔ اور اپنے معترفوں کو بجائے ”جاہل“ کے ”سخنورانی کامل“ کہا۔ اسی طرح اپنی شاعری کا رخ بدلا۔ دیوان ریختہ کا انتخاب انہی کے مشورے سے ہوا اور اگرچہ انتخاب کرتے وقت بعض بلند پایہ اشعار رہ گئے ہیں۔ یہ حیثیت مجموعی یہ انتخاب ذوقی سلیم کا ثبوت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دیوان غالب تمام کا تمام شایع ہو جاتا۔ تو خدشہ تھا۔ کہ جہاں اتنے سیپ اور کوڑیاں تھیں۔ وہاں نیچے موقی بھی نظر سے پنہاں ہو جاتے۔

مرزا کے اس زمانے کے احباب کی نسبت ہمیں پوری واقفیت نہیں۔ لیکن چونکہ ان کی شادی نواب مرزا الہی بخش معروف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور جن کے اکثر شعرا سے مربیانہ تعلقات تھے۔ یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب سے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ہونگے۔ معروف ذوق کے شاگرد تھے۔ اور زبان میں صفائی اور روزمرہ کے بڑے مداح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری بہت پسند ہوگی لیکن یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیر اثر زبان کی صفائی کی طرف مرزا زیادہ متوجہ ہوئے ہونگے۔ معروف خود بھی شاعر تھے۔ نئی نئی زمین نکالتے۔ اور ان میں شعر کہتے اور کہلاتے چنانچہ مرزا کی وہ غزل جس میں ذیل کا شعر مشہور ہے۔

پلا دے ادب سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا۔ نہ دے۔ سسٹراب تو دے

انہی کی نکالی ہوئی زمین میں ہے۔ اور اس میں غالب کے علاوہ دہلی کے اور مشہور شعرا نے بھی طبع آزمائی کی۔

ہرگز کی نسبت ہم کچھ چکے ہیں کہ مرزا دہلی آئے تو وہ ہمارا کاب تھا۔ انکی صحبت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہو گیا۔ جو عموماً اہل زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح عام ایرانی ہندوستانیوں

کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع سے ہی ہندی زبان ان فارسی نویس کو تسخیر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہر مرز کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پر ایک آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ ہر مرز کے عقائد کے متعلق ہمیں پوری خبر نہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو۔ اور مرزا کا اپنے خاندان کے طریقہ کو چھوڑ کر شیعہ ہونا اسی کے زیر اثر ہو۔

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب بچانے تیسرے اور سووا کے انہیں تبدیل اور مغربی کا جانشین سمجھا جائے۔ بیشک انہوں نے اردو شعر لکھے۔ مگر انہوں نے کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے تبدیل اور بعد میں مرنی نظیری کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ تیسرے مداح تھے۔ لیکن تیسرے کی غزلوں پر بھی جو غزلیں انہوں نے کہی ہیں۔ وہ تیسرے نہیں بلکہ تبدیل کے رنگ میں ہیں۔ اور اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اردو اور فارسی کلام میں وہ حد فاصل نہیں رکھتے تھے جو اس زمانے میں عوام کی فارسی سے ناواقفیت سے ہو گئی تھی۔ وہ کل رعنا کے دریاچہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اردو اشعار کے لکھنے میں وہی وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی اشعار کے لکھنے میں۔ ان کی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں ایک اردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلہ میں باقی اردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان شعرا کی نظروں سے پہلے نہیں جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے۔ جن کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بسیدل ظہوری۔ عرفی۔ نظیر کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز تبدیل کے رنگ میں کیا۔ لیکن جب انہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور شیخ علی حزیں نے سسلا کر

ان کی بے پرواہی۔ روی انہیں جتائی۔ اور طالبِ آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا۔ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا۔ تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں۔ اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ سکے۔ جس میں بیدل کی شغریّت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں دکھائینگے۔ مرزا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اردو کے اور شعرا میں نہیں۔ لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعرا کی دہی معاملہ بندی ہے۔ جو عرفی اور دوسرے شعراء میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دیکر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا ہے۔ مرزا کو وہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن فارسی کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعر کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے۔

اسکے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا۔ وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا۔ جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہو گئی تھی۔ یعنی جوانِ شباب میں انسان اپنے تمکین دنیا کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے۔ کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ تجحان جیسا کہ ان کے خاص طرزِ شاعری (یا انکے بھائی کی علالت سے بھی) خیال ہو سکتا ہے۔ عوام سے بہت زیادہ تھا۔ اور اس انتہائی انفرادیت کے بقول ایڈلر وہی نتیجہ ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے کہ اپنا ابتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سڑی پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی

تھی کہ مرزا کی طبعی رجحانات پر ان کی عقل غالب آئی۔ اور انہیں خوش قسمتی سے ایسے دوست
 میسر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیوں کو ہموار کر دیا۔ شخصی انفرادیت مٹانے
 اور مناسب حسن تناسب کھانے کے لئے سو سائیں کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جسے
 کچھ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ دہرا س آتی ہے۔ اور جوں جوں مرزا کا حلقہ احباب وسیع
 ہوتا گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زوہی کم ہوئی۔ تو ان کی
 انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آہٹ گئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی
 بیہوشی کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی۔

باب سوم

لکھنؤ، کلکتہ

دیوان غالب کا بھوپالی نسخہ اس وقت مرتب ہوا۔ جب غالب آلام دنیا سے بالکل آزاد تھے۔ اور جس رنگین زمانہ کی یاد سے ان کا ابتدائی کلام معمور ہے۔ غالب اس وقت نواب علی بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب احمد بخش نے مرہٹوں کے خلاف لارڈ لیک کے معرکوں میں نام پیدا کیا تھا۔ اور ۱۸۵۵ء میں لازمو صوف نے ان خدمات کے عوض میں انہیں فروز پور جبر کا علاقہ جو اب ضلع گڑگاؤں کا حصہ ہے۔ تفویض کیا تھا۔ نواب نے ہمارا جگان اور اور سرکار انگریزی کے درمیان تعلقات قائم کرنے میں بھی بہت حصہ لیا۔ اور ہمارا جہ الور نے ان خدمات کے صلہ میں پرگنہ لوہاروا انہیں بخش دیا تھا۔ نواب کی جاہلاد کافی تھی۔ اور حبطرح بڑے گھروں میں بہت سے متعلقین آسانی سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ نواب کے برادر زادہ مرزا علی بخش اور غالب نواب کے ساتھ بہت عرصہ مقیم رہے۔ اس سلسلہ میں غالب نے بہت سا وقت فیروز پور جبر کے میں گزارا۔ اور جب انگریزی فوج نے ۱۸۵۷ء میں ہمارا جہ بھرتپور کے خلاف چڑھائی کی۔ تو غالب اور مرزا علی بخش بھی نواب کے ہمراہ تھے۔ غالب کی سب سے پہلی نشر کی تصنیف اسی زمانے

کی یادگار ہے۔

مرزا علی بخش نے جو غالب کی بیوی کے بھائی بھی تھے۔ غالب سے اسد خاکی کہ فارسی خود کتابت کے قواعد اور القاب خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیے۔ چنانچہ مرزا نے ایک مختصر رسالہ میں جہاں کلیات فارسی میں موجود ہے۔ فارسی مکتوب نویسی کے قواعد جمع کئے ہیں۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب انہوں نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا (اور جس سے اُنکے فارسی خطوط بیشتر عادی ہیں) اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ وہ اس رسالہ میں لکھتے ہیں:-

”مکتوب الیہ را بلفظیکہ فراخ و حال اوست آواز و ہم وزم و مزہ سنج مدعا گردم القاب و آداب گوئی و خیریت گوئی و عادت جوئی خوش و ناخوش است۔ و پنجگانہ خوش و ناخوش ہند نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گذارش و دورتر نموده بشنن را ہمگ گفتن و ہند فارسی زبان میں انہوں نے بہت حد تک رواج عام کی پیروی کی ہے۔ لیکن اردو رقعات میں مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول اپنے ”مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ دور سے بیٹے بڑا زبان قلم باتیں کیا بیٹے!“

اس رسالہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زبان دانی سے جو لغت انہیں تمام عمر رہی۔ اور جس نے بعض اوقات تصحیح بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس وقت بھی موجود تھی۔ اور غالباً ہر مری کی صحبت کا اثر تھی۔ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں۔ ”اندازہ خوبی زبان نگاہدار و دریں پارسی آیت تہ بازی را در کشاکش لغات ہندی زبانان پارسی نویس ضایع و خوار“۔ بھر تپہ کا معرکہ ۱۲۵۷ھ میں ہوا۔ لیکن اگرچہ اس تصنیف سے غالب کی جا بجا دوسے جگہوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ غالباً ان کی ابتدا اسی زمانہ میں ہوئی۔ نواب احمد بخش کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین۔ جن کے نام غالب نے اپنا دیوان فارسی معنون کیا ہے۔ نواب ضیاء الدین تیرہ خشاں جو غالب کے شاگرد اور عزیز دوست تھے۔ اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر و ادیب کے والد نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۲۵۷ھ میں سرکار انگریزیوں کو ہار دیا۔

کی اجازت سے نواب شمس الدین ہی کو تمام جائیداد کا وارث قرار دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ پر سب بھائی متفق نہ تھے۔ اور اس میں بعد کو کچھ ترمیم بھی ہوئی۔ چنانچہ فروری ۱۸۲۲ء میں اپنے والد کے مشورہ پر نواب شمس الدین نے پرگنہ ٹوڑو ایک اقرار نامے سے اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۲ء میں جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانہ میں ہوا ہو گا۔ جب نواب احمد بخش کی جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ ہوا ان کو جاگیر اپنے چچا مرزا نصر اللہ خاں بہادر کے وارث ہونی کی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرزا کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اور جب لارڈ لیک کی عملداری ہوئی۔ تو چار سو سو اداوں کے رسالہ دار مقرر ہوئے۔

انہیں اسی کے صلہ میں علاوہ ذاتی زیر معاضہ کے معقول جائیداد میں حیات ملی تھی۔ لیکن ایک سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر ان کے وارثوں اور مقلبتین کے لئے سرکار نے فیروز پور جھڑک کی ریاست سے نشستیں مقرر کر دیں۔ جو نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل تھی۔ مرزا کا دعویٰ تھا کہ ان کے اپنے اور شرکائے حقیقی کیلئے دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے تھے۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصہ فقط سڑھے سات سو روپیہ کا تھا۔ شروع میں تو ان کے نواب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور نواب ان کی مدد اور ضروری کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۲۳ء کے قریب اختلافات کا آغاز ہوا۔ مرزا کے خسر نواب الہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے۔ اسی سال فوت ہو گئے۔ اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کا اثر کم ہو گیا ہو۔ مرزا کی عمر اس وقت تیس اسی سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا مرحہ ختم ہو گیا تھا۔ دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا قصور اس موقع پر یہ ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا۔

غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعہ معاش کی تنگی بمبائی کی بیماری، قرضخواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابل برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نواب کی خدمت میں جا کر رورول کہو۔ ممکن ہے وہ مدد کرے۔ چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز پور بھڑکائے۔ نواب ان دنوں آنور تھا۔ اور مرزا کو فیروز پور بھڑکار کر پڑا۔ یہاں سے انہوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے پھیل کھتری کے نام لکھے ہیں۔ ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-
 "چونکہ لا کہ از بیم رسوائی از دل تاب نہاں ز سیدہ خون میگرد و دچہ نو بہا کہ از دود بیکس کسوت اشک پوشیدہ اند چشم بیرون میرود۔ چارہ رنج میدی معلوم و پائان کار نامہ معلوم است پیداست کہ از نفس بدام افتادہ راجہ حال خواہد بود۔ اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بیقراریاں ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ "ہر چند در وطن نیم اما قرب وطن نیز قیامت است۔ ہنوز بالال کاشانہ راہ نامہ و پیام است۔ ہرچہ دیدہ میشد آشوب چشم بود ہرچہ شنیدہ میشد زحمت گوش است۔ نیز جانے کہ اذال و طہ بردل آوردہ ام و دیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرزا میں اقامت اضطراری اتفاق افتاد۔ آخر جب خدا خدا کر کے نواب الہ کے نقیضوں سے فارغ ہوا۔ اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورہ سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے۔ ان کی بنیادیں پرے۔ اور نواب سے کسی طرح کی توقع نہ کھنکھاتی ہے۔ چنانچہ بقول غالب "نواب معاحب مرزا بہ لطف نہائی زینعتد و پر شمرہ ستہ کہ بالصفات میماست از راہ بردند۔ چنانچہ مرزا کو دہلی ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی۔ تو انہوں نے نواب کی تفسیر کے خلاف کلکتہ میں اپیل کر نیکا ارادہ کیا۔ بقول عالی ریڈیٹ دہلی نے انہیں کامیابی کی امید بھی دہلی جٹا چڑھتیں برس کے ہونگے۔ جب وہ اس دور دراز سفر کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔
 مرزا دہلی سے کب روانہ ہوئے۔ اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں۔ لیکن دہلی سے وہ کلکتہ گئے اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۴ جون ۱۸۶۲ء یا ۱۷ اگست ۱۸۶۲ء ہے۔ مگر دہلی میں غالب

نے بہت دیر قیام کیا۔ اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جانہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی تھی۔ درست مان لیا جائے۔ تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ کم از کم دوم محرم الحرام ۱۲۶۱ھ ذیقعدہ تک یعنی قریباً ۱۱ مہینے وہ لکھنؤ مقیم رہے۔

مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو دلاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علیاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک ورنہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے۔ لیکن جب ۱۱۸۱ھ میں لاہور لکھنؤ نے نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ (اور مشہور ہے کہ انام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا) تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ اور سال ۱۱۸۱ھ میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہوئی۔ جس کی تاریخ بھی "مع بگو" تاریخ کہ ظل اللہ گردید" انہیں شہر سے تھوڑی بہت دچھی ضرور تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ انہوں نے تاریخ کو ملک اشتر کا خطاب دیکر اپنے دربار سے متعلق کرنا پڑا لیکن تاریخ نے یہ کہہ کر غازی الدین کو نہ ٹھاننا دہلی کا مرتبہ حاصل ہے۔ اور نہ سرکار انگریزی کا زور و اقتدار۔ خطاب واپس کر دیا۔

جب مرزا لکھنؤ پہنچے۔ تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کیلئے نائب السلطنت کی مدد کی ضرورت تھی۔ نائب السلطنت اس وقت مستند الدولہ آغا میر تھے۔ جنہوں نے ملازمت کا آغاز بطور ایک خدمتگار کے کیا تھا۔ لیکن نواب بیگم اور ریڈیٹنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اختیار حاصل کر لیا تھا۔ کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوط بتہ چلتا ہے۔ ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی شہر کوئی سے تھوڑی بہت دچھی ضرور تھی۔ اور (شاید اپنے مد مقابل حکیم جہدی کی خدمت سے) وہ تاریخ کی کے مربی بنے جاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مدعیہ

۱۔ غالب لکھنؤ سے جانیے چند مہینے بعد ہی آغا میر معزول ہو گیا۔ اور قریباً چار سال تک لکھنؤ کے چہرے میں اپنے گھر کے اندر قید رہا۔ (سہیہ)

کا انتقال ہو گا۔ اور انکی جگہ نصیر الدین حیدر جو انکے بیٹے کہلاتے تھے تخت نشین ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت یہ قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا۔ اور وہاں سے پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم ہوا۔ لیکن بقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار متوسط یعنی انشی محمد حسن نے۔ غالب بیچارے کو پانچ روپے بھی نہ ملے۔

حالی نے مرزا کے قیام لکھنؤ کی نسبت ایک آدھ لطیفہ لکھا ہے اس سے زیادہ اس قیام کی نسبت ہمیں بہت واقفیت نہیں۔ ناسخ سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن چونکہ اس نے بادشاہ کا خطاب حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اندول بادشاہ کے زیر عتاب تھا۔ اور اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ ورنہ قرین قیاس ہے کہ (اگر غالب سے اس کے تعلقات بعد کے نہیں) تو وہ آغامیر کے پاس رسائی میں مفید ہوتا۔

مرزا کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں اردو شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ لکھنؤ میں فارسی کا قدردان کوئی نہ تھا۔ اس قیام میں انہوں نے چند ایک اردو غزلیں لکھی ہونگی۔ ایک غزل توحس سے اخیر میں ذیل کے قطع جدا شعار ہیں۔ یقیناً اس زمانے کی یا گرا ہے۔

لکھنؤ آنیکا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوں میر و تماشا سودہ کم ہے ہمسکو
مستطیع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر خف و طرف حرم ہے ہمسکو

مئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادہ روکشش کاف کرم ہے ہمسکو

غالب ۲۶ ذیقعد یعنی ۲۷ جون ۱۸۵۷ بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اور تین روز میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے بآندا گئے۔ جہاں مولوی محمد علی صدرا میں نے باوجودیکہ مرزا سے پہلے تعارف نہیں تھا۔ اسے بہت نیک سلوک کیا۔ قیام بآندا میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیے۔ بآندا اسے وہ موڈ آگئے۔ اور موڈ اسے چکنا چار

غالب نامہ

آہوی حصہ منہ کیلئے انہوں نے گھوڑا گاڑی لی۔ لیکن جب انہیں اس سفر میں معلوم ہوا کہ سواری
آسانی سے نہیں ملتی۔ اور جو جانور ملتے ہیں۔ وہ غالب نیم جان سے بھی سست رفتار۔ تو انہوں
نے چلہ تار سے کشتی لی۔ اور دریا کے راستے سے الہ آباد پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں باتے وقت
یا وہاں کسی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا۔ جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے۔

نفس طرزدہ ز باد نہیں نکلتے
نگاہِ بخیرہ ز ہنگامہ الہ آباد

یہاں ان کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا۔ لیکن غالباً وہ ڈھوسکا۔ اور وہ بنارس پہنچے جس وقت
بنارس پہنچے تو طبیعت نامساوی تھی۔ چنانچہ رائے پھیل کر ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ نو سیر کر رہا تھا
و مثبتیہا پر تہیست افتادہ ام۔ اگر از داخلات غفۃ آید۔ بحال رنجِ معذہ دامعاست۔ وہاں
برودت جگر حرارت قلب و ضعف قرا و اگر از خارجیات سخن را نہ شود بیش ازین نیست تو
مطلوب سلوٹ وں غالب حزیں کہ نہ رتشن ز ضعف آگفت جلاں بود
گویند ز ذہ تباہ بنارس رسید اس مارا ازین سیاه ضعیف میں کماں بود

بنارس پہنچے وقت انکی طبیعت علیل تھی۔ لیکن بنارس میں کے پر فضا مناظر نے حزیں کے پاؤں
میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ غالب کیلئے بھی جنت نگاہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت کمال
ہو گئی۔ اور اب سوائے اسکے کوئی افسوس نہیں تھا کہ دن کے عزیز دوستوں نے انہیں چھوڑا
ہے۔ چنانچہ چراغِ دہر میں لکھتے ہیں۔

کس ازہ دل وطن غمخوار من نیست

مردود و مرپند روی وطن نیست

مردی نفس حق۔ غالب میں امین رئیس و لار و اور غالب حسام الدین حیدر علی کویر کے افسوس کا
شر قلم کو جہاں آباد قسٹم
مردیوں کو جہاں آباد قسٹم
مردیوں کو جہاں آباد قسٹم

اسکے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور شاہجہاں آباد پر اسے ترجیح دی ہے۔

جہاں آباد اگر بنود الم نیست
جہاں آباد بادا جائے کم نیست
بناشد قحط بہر آشیلانے
سر شاخ گلے در گلستانے
بخاطر دارم انیک گلزینے
بہار آئیں سواد و نشینے
کہ می آید بدخواگاہ لافش
جہاں آباد از بہر طوافش

تعال اللہ بنارس چشم بد دور

بہشت خرم و فردوس معمور

معلوم ہوتا ہے بنارس مرزا کو بہت پسند آیا۔ (چنانچہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں دہلی جاتا تو وہیں بس جاتا) لیکن جب پسماندگان کا خیال آتا ہے تو طبیعت بیکار ہو جاتی ہے۔

فروماندن بکاشی نارسانی است
خدا را ایں چہ کافر ماجرائی است
بکاشی ملختے از کاشانہ یاد آر
دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
درینفا در وطن داماندہ چند
بجوں دیدہ روزنی زندہ چند
ہوس رایائے دروا من شکستہ
بامید تو چشم از خویش بستہ
بشہر از بنگسی صحرائشیناں
بروئے آتش دل جاگزیناں

از انانت تغافل خوشنایست

بدایغ شاں ہولے گل روانیت

بنارس سے غالب کا ارادہ تھا کہ باقی ہفت روزہ سے طے کریں۔ لیکن چونکہ دریائی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ بنارس سے وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "ناخدا یاں ناخدا شناس بنارس در باب کشتی مضائقہ کردند۔ چہ ہر کہ بر خوروم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید۔ و تا پٹنہ افزول از بست روپیہ خواست۔" ناچار ہماں اسپ سوار تا بنداں بقعہ محرا خواہم پیو۔" عرض

اس طرح وہ پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ چار شعبان ۱۲۴۳ھ بمطابق ۲۱ فروری ۱۸۲۰ء کو کلکتہ پہنچے۔ یہاں انہوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ مکان دس روپے کرایہ پر لیا۔ اور حصول مدعا کیلئے کوشش شروع کی۔

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ در سے

از سفید داغ و دوری احباب شتہ ایم

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہنچے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ نواب احمد بخش جن کی تقریر کے تحت وہ کوشش کرنے یہاں آئے تھے۔ وفات پائے۔ لیکن انہوں نے جہاد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اب مرزا کا تنازعہ ان سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جب وہ کلکتہ میں حکام سے ملے۔ تو انہیں کامیابی کی بہت امید بندھ گئی تھی۔ اس وقت کلکتہ میں چیف سیکرٹری اینڈ ریویو سٹر لنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر سامن فریڈرکس نے مرزا کی ملاقات ان سے اور شاہ طریقہ سے ہوئی۔ اور معافہ و عطائے عطر و پان تھم کی فوجت آگئی۔ مسٹر اینڈ ریویو سٹر نے بھی جنگی تحریک میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غائب کی مرصداشت لے کر اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ مرصداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہوئی۔ تو وہاں سے حکم ہوا کہ پہلے یہ فریڈرکس کو دکھانی جائے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ گئے۔ اور اپنے وکیل بیراؤل کو دکھانی کیا۔ کہ مناسب مرصداشت پر سرایہ مرزا کو لے کر کسٹ ہاؤس کی سفارش کر کے کلکتہ بھیجوائے۔ جب کہیں ہسپتال کے بعد مرزا کا خط دیکھی گئی۔ اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سرایہ در و در کو لے کر واپس آئے۔ اور مرزا کی پیش نہ ہو سکی۔ اور گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی کونسل کے مختلف اہلکار باہر پڑے تھے۔ مرزا نے اپنے مقدمہ کے متعلق ترکہ نہ ہو سکا۔ ان تمام شرکوں کی وجہ سے ان میں راسخ ہو گیا تھا۔ اسے پورا کرنے کے موقع تھے۔ رستہ کلکتہ میں رستہ قائم نہیں ہو سکا۔ اور مرزا کی حالت اس سے متعلق تھی۔ دونوں دنیاں ایک بزم سخن قائم ہوئی تھی۔ جہاں پر پہنچنے پہنچنے اور مرزا کی حالت

پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔ ان میں ایک غزل تھی جس کا مقطع مشہور ہے۔

مگر وہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب

رسم امید بہانا ز جہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا۔ تو لوگ معترض ہوئے۔

جزو سے از عالم وارہمہ عالم ہمیشہ

ہیچہ موئے کہ بتان راز حیاں برخیزد

اعتراض یہ تھا۔ کہ عالم واحد ہے۔ اور ہمہ بقول قاتل کے واحد سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا۔ کہ زدہ کا استعمال غلط ہے۔

شوراشکے بہ فشار بن مرزاں وارم

طعنہ بریے مرو سامانی طوفان زدہ

غالب کے معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری۔ مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور دوسرے فارسی کے مستند استاد تھے۔ لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی دونوں شاہزادہ کامران کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اس نے غالب کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات اشعار ایسے پڑھے۔ جن میں ہمہ عالم، وہمہ روز، وہمہ جا، اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں۔ اسکے علاوہ نواب اکبر علی متولی امام بارہ اور دوسرے با اثر آدمیوں نے مرزا کی حمایت کی۔ لیکن مرزا طبعاً صلح پسند تھے۔ اور اب بالخصوص اس غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتہ کے با اثر لوگوں سے بگاڑنا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک فارسی شہسوی بادہ مخالف لکھی جس میں محترموں کے جواب استناد و دلائل کے ساتھ دیئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن ادب قلی کی تعریف کر کے صلح و دوستی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے۔ لیکن وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر بخوبی قادر تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں ان کا مشہور اردو قطعہ کلکتہ کی ہی ایک صحبت کی یادگار ہے۔

کلکتہ میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ جن کا اخبار آئینہ انکلت سے کچھ تعلق تھا۔ اور جن کا حکام سے بھی بہت رسوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہئے۔ اور ان کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اردو اور فارسی کلام کا اگل دغنائے نام سے انتخاب کیا۔ بد قسمتی سے اس انتخاب کا کوئی نسخہ اس وقت دستیاب نہیں ہوتا۔ ورنہ غالب کے کلام کا کچھ حصہ یقین سے ترتیب دیا جاسکتا۔ لیکن اس انتخاب کیلئے غالب نے جو مقدمہ اور خاتم لکھا ہے۔ وہ کلیات فارسی میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کیلئے بہت کار آمد ہے۔ شاید کلکتہ میں ہی مرزا کی ملاقات لکھنؤ کے ایک اور قابل ذکر فرد میر حسن علی سے ہوئی۔ جو سنہ ۱۸۵۱ء میں نائن ہندوستانی کے پروفیسر شیکسپیر کے معاون ہو کر رہے تھے۔ اور ولایت سے واپسی پر ایک اعلیٰ کھرانے کی انگریز خاتون سے (بطور اہل کتاب) شادی کر کے ساتھ لائے تھے۔ مرزا حسن علی قربا ۱۲ سال ہندوستان میں رہیں۔ اور اس اثنا میں ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت انہوں نے ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ جس کا نیا ایڈیشن حال میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ اور جس سے بہتر کتاب اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت کسی شرقی یا مغربی زبان میں نہیں۔

غالب کا قیام کلکتہ دو سال سے کچھ کم۔ یا جو کا۔ شروع شروع میں تو نئی نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت جھانکے۔ مگر بڑے بڑوں کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی اور ان کے لئے سات پارچے اور بیضہ۔ سرسج۔ مالائے مرادید۔ تین۔ تم خدمت کا فیصلہ بھی ہوا۔ ہوا نہیں ہوئی۔ ملتا رہا۔ لیکن جب دو سال گزر گئے۔ اور جس منزل کو پیش نظر رکھ کر حرکت نہجے تھے۔ وہاں تک رسائی نہ ہوئی۔ تو مرزا کی طبیعت پر پوری غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط اس فکری ت پر ہیں۔ اور ایک نامہ فی خطہ میں بھی کلکتہ کے متعلق انہوں نے سکا لہ کی صورت میں تلخ مذبذبات کا اظہار کیا ہے۔

سال کلکتہ باز بہتر وقت پایہ قلم پر مشتمل لکھنؤ

گفتم اینجا چه شغل سود دهد گفت از هر که هست ترسیدن
گفتم اینجا چه کار باید کرد گفت قطع نظر از شعر و سخن
گفتم از بهر داد و آئندہ ام
گفت بگیر نزد سر بسنگ بزن

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے سراپڈورڈ کو لبرگ نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی۔ اور کلکتہ سے بھی جو صلہ افزا جواب گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ جواب نہ پونچھا تھا کہ کو لبرگ معزول ہو گیا۔ اور محلے پرستے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتہ میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں ہو رہا تھا۔ اور دہلی میں کوشش زیادہ کار آمد ہو سکتی تھی۔ اور گورنر جنرل خود دہلی کی طرف جانے والا تھا۔ مرزا ابھی کلکتہ سے دہلی واپس گئے۔ اور ۱۱ نومبر ۱۹۲۹ء کو وہاں پونچکے۔ ایجنٹ فرانس مکنس سے مدد چاہی۔ کرنل ہری املاک نے مرزا کی سفارش سے ایجنٹ سے کی تھی۔ اور انہیں کچھ امید بھی ہوئی۔ لیکن ایجنٹ نے رپورٹ ذاب شمس الدین رئیس فیروز پور کے حق میں کی۔ مرزا کو ان کے دوستوں نے اسکی اطلاع دی۔ لیکن وہ مطمئن تھے۔ کہ مسٹر اسٹرننگ چیف سیکریٹری معاطے کو سنبھال لیگا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتہ نہیں پہنچی تھی کہ ۲۳ مئی ۱۹۳۰ء کو سٹرننگ مر گیا۔ اور ۲۷ جنوری ۱۹۳۱ء کو لارڈ ڈوم فرنگ نے فیصلہ مرزا کے خلاف کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جاؤد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی حکم پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتاتے تھے۔ اس کے مطابق نصر اللہ خاں کے وارثوں کی جو پینشن مقرر ہوئی تھی۔ اردو لیک کے احکام کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ ہو گئی تھی جس میں سے دو ہزار چوبیس حاجی کے۔ پندرہ سو مرزا نصر اللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اس کے دو بھتیجوں کے۔ مرزا اس نامہ فارسی بے نام و نشان کی صحت اور اہمیت کے قابل نہیں تھے۔ لیکن سر جان ملکم نے جس سے اس امر میں استقصو اب کیا گیا، اسے درست تسلیم کیا۔ اور ان کے مشورہ پر لارڈ ڈوم فرنگ نے یہ فیصلہ کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ بظاہر مرزا کا کلکتہ کا سفر بیکار ثابت ہوا۔ اور حصول جائیداد کی تمام ٹنگ در رائیگاں گئی۔ لیکن مرزا کے مشاہدہ کی وسعت اور ذہنی نشوونما کیلئے کلکتہ کا سفر بہت مفید ہوا۔ ایک تو مسافری میں طرح طرح کی تکالیفیں اٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ہوا دوسرے کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر حکومت تھا۔ مغرب کی تمام ترقیاں اور ایجادات سب سے پہلے ہندوستان میں وہاں شروع ہوتی تھیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس معاملہ میں ان کی واقفیت اپنے ہموطنوں سے زیادہ تھی۔ اسی طرح لکھنؤ میں بھی مرزا کو دیر تک قیام کرنے اور وہاں کی طرزِ شاعری اور زبان کی صدقائی میں تاسع جو کوششیں کر رہے تھے انہیں مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یقین ہے کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت نے ان تمام باتوں کا ناہیہ اٹھایا ہوگا۔ انہوں نے سفرِ کلکتہ کے بہت دیر بعد تک اردو اشعار بیت کم لکھے ہیں۔ لیکن ان کے بعد کے اور پہلے کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے۔ وہ اس طبیعت اور دماغ کی پختگی کو نمایاں کرتا ہے جن سال کی مسافت سے انہیں حاصل ہوئی۔

باب چہام

مقدمہ کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی اُس کا اظہار کئی خطوں میں ہے چنانچہ مولوی سر اج الدین کہ جنہوں نے اس سلسلے میں ان کیلئے بہت کچھ کیا تھا۔ لکھا ہے: ”کارِ من بداد گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشد تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگب، اماں دہ۔ باز دہاں در سیم و در دہاں بدای ز مومہ ضرور نیم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگیہ یا نم۔ بہیاست اگر معاش من ہمیں پنچہزار روپیہ سالانہ بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ سادہ دلاں آں را معدلت آثار کوئند ثابت شدہ بود۔ بائستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش رانندے و گفتندے کہ ہرزہ خروش۔ آغیہ تو باز یافت و انمودہ یافتنی ازاں فروتر نیست۔ و قرار داد نیز ہماشت لاجرم دیوانہ بودے۔ اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادران من اند۔ بہ ستیزہ برخاستے و بیاطل سیری نام بر آوردے۔“ ان سطور سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ مرزا کو پھر کلکتہ جانے اور صدر میں کوشش کرینکا خیال تھا لیکن غالباً یہ فقط انشا پر دازی ہے۔ مرزا پھر کلکتہ نہیں گئے۔ اور اس خط کے اخیر میں لکھتے ہیں: ”اکنوں مصلحت دلاں می بینم کہ ازیں داری قطع نظر فرمائند و کالت نامہ من کہ نزد منشی نصر اللہ است۔ باز ستانند و از ہم بدرنند و بگزرنند اللہ بس ماسوئی ہوں“ مرزا کو ایک تو

اسی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ دوسرے اٹالیان دہلی کے ملنے جن سے پہلے کیے معلوم ہوتا ہے انہیں شروع شروع میں کچھ عزت میں پناہ دینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شروع کا قابل تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا۔ ان کے عزیز و دوستوں میں سے ان کے تعلقات مردی نقل حق سے ہمیشہ برقرار رہے تھے فابسطی سے رابطہ اسی زمانہ میں بڑھا۔ اور نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے جو نواب شمس الدین سے بہت خوش نہیں تھے۔ رشتہ اخوت اور مضبوط ہو گیا۔ محمد زکریا کے ہیں کہ نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو اپنے دو نوں بھائیوں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ انتظام میں نواب امین الدین کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایک شرط یہ تھی کہ اس کی آمدنی میں سے ۵۶۱۰ روپیہ سالانہ سرکاری خزانہ میں نواب ضیاء الدین کے اخراجات کے لئے جمع کر دیا جاسے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدین یہ رقم باقاعدہ خزانے میں جمع نہیں کرا سکے۔ اس پر نواب شمس الدین نے کوشش شروع کی کہ چونکہ نواب امین الدین دستاویز کی سب شرطیں پوری نہیں کر سکے۔ اس لئے ایک سالانہ رقم سے عوض یہ پیرت انہیں میں بچائے۔ سرمدان ریڈیڈنٹ دہلی نے اسکی تائید کی۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے حکام کے مطابق لوہارو نواب شمس الدین کو واپس ملی گیا۔ سرمدان ریڈیڈنٹ جو کہ ریڈیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ وہ خود کے حق میں نہ تھے۔ ان کے شرف میں نواب شمس الدین سے کہیں ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن بد میں کیشنگ ہو گئی۔ انہوں نے نواب امین الدین کو مشورہ دیا کہ وہ اس فیصلہ کے خلاف لکھتے جا کر کوشش کریں مرنالہی ان کوششوں میں شریک تھے۔ پناہ جب اتھارٹیز میں نواب حکومت کے ترغیب نے انہیں اپنے لکھتے کے دوستوں کے نام نہایت مجھے تعافی غلط دینے۔ موری سرین الدین کے نام ایک خط میں انہوں لکھا تھا۔

”بالجلا بدیں نامہ بخاری۔ عاصی بدیں۔ ایک ست کہ برادر صاحب شمس الدین بن بادشاہ خان جبار بن خزانہ دار و لاہر الملک نواب کوشش نہ کرے۔ جو کہ وہ خود بخود بدیں بنادار کرے بخاری و دہلی و نواب مستور بندید و نوہاد مستور بدید۔ میں بدیں بنادار و مستور بدیں بنادار“

وسگالش گیری بجا آید کہ اس دزد مند و دراز خانماں اسدا لہر رو سیاہ را فرماش کند و شمارا بحبائے او داند۔

مرزا کے عزیز و دوست کئی تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اُن کے باوجود مرزا کی مصائب کم نہیں ہوئیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نواب شمس الدین کا دہلی میں بہت رسوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتہ جانے سے پہلے ہی انہیں گھبرا رہا تھا۔ بہت بڑھ چکا تھا۔ اور چونکہ قرضہ اہل کو بڑی جاؤاد کوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ حصولِ زیر کیلئے بیاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسی سال ان میں سے دو نے دیرانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ زر ڈگری ادا کرنے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ اور قاعدے کے مطابق نہیں جیل جانا تھا۔ لیکن چونکہ بقول ان کے مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چیرا سی انکے گھر نہ جاتا اور جب تک کہ مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کر سکتے تھے۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے تمام حالات لکھے ہیں۔

”چار ماہ است کہ نامہ نگار بہ کنجہ نشستہ در آمد شد بروئے خوش و بیکانہ بستہ اگر بندانہ اندر نیم اما خور دو خفت من زندانیان ماند۔ آچہ دریں چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام۔ کا فر با شتم اگر بیج کا فر بعد سالہ عقوبت جہنم یک نیم ازاں تواند دید“ مرزا اس قید خانہ نشینی میں تھے کہ ۲۷ مارچ ۱۲۸۷ء کی شام کو ولیم فریزر ریڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ مرزا کے فریزر سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انہیں امید تھی کہ شاید اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے۔ چنانچہ اس کی تالیف میں ان کا ایک پر زور قصیدہ بھی ہے۔

ز جیب افق چہ چون سر بر آرد	خسے از سبز دنیا بساغر بر آرد
من و بزم ولیم فریزر بہباد	کہ از جیب ہر گوشہ گوہر بر آرد
خیمہ داو گستر کہ گرد و جھنورش	خسے داو از دست آذر بر آرد
کشد اتمام خس از شعلہ چندان	کہ دو داز نہاد ہر انگہ بر آرد

نامہ

مرزا اگر اسکی موت کا بہت رنج ہوا، چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں: "وہ ستمیال خدا کرے کہ
 نہ بغض ابدی گرفتار باد۔" ولیم صاحب بہادر کا کہ ریڈیڈنٹ دہلی نے غالب غریب دہلی پر۔
 در شب تاریک نصیب تفتنگ شست و مرغم مرگ پید تانہ مگر وہ ان دونوں جو صاحب دہلی میں
 مجسٹریٹ تھے۔ وہ غالب کو جانتے تھے۔ انہوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلہ میں مدد ملانے
 سرکاری تعینات کا نتیجہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور اس کا ایک سپاہی مجرم قرار دیئے گئے
 نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے۔ دہلی کے ٹوٹنے کے بعد کہ نواب بگینا نے
 اور غالب اور فتح الہیہ کے خاں نے کینڈوری سے مل کر کوزے کے خلاف جہری رکھ دیا۔

نواب شمس الدین صاحب سے جنہیں مشرکان کی مزید تحقیقات کے بعد سب سے پہلے گرفتار کیا گیا۔ ان کے پاس سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "میں نے اپنے دوستوں کو بتایا ہے کہ میں نے ایک شخص کو ملوث کیا ہے جو میری خدمت میں آئے گا۔" یہ خط نواب صاحب کے پاس سے ملا تھا۔

نواب کی وفات کے بعد فیروز پور جہڑا کی ریاست تو لاہور سولہوی اور مرہٹوں کی پٹن جواہر
اس ریاست سے ملتی تھی۔ دہلی شہزی سے اور مرہٹوں کی اطلاع پر ان کے لئے یہ امر ضروری
مفضل عرصی گورنٹ اور انڈیا کی خدمت میں نواب کی باہر سے یہ امر ملتا تھا کہ یہ نواب
کی۔ لیکن چونکہ فیروز پور جہڑا کے مرہٹوں کے تعلق سے بھی فیروز پور جہڑا کے مرہٹوں
اس پر مرہٹوں کے گورنٹ اور انڈیا کے ساتھ گورنٹ کے فیروز پور جہڑا کے مرہٹوں کی
مرہٹوں کے ساتھ گورنٹ اور انڈیا کے ساتھ گورنٹ کے فیروز پور جہڑا کے مرہٹوں کی

[illegible]

ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی ارسال کی لیکن یہ سب سچی بے سود ثابت ہوئی۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے مرزا کو باسٹھ روپیہ آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی۔

فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دوبار شاہی میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی سب نزدیکی الٹی پڑ رہی تھی۔ یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ اس زمانے میں تخت شاہی پر اکبر شاہ متمکن تھے۔ اور نظروں کی عہد تھا لیکن چونکہ ظفر کی دماغی حالت بہت اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ نے ۱۸۶۲ء میں کوشش کی کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائیں۔ مرزا غالب سمجھتے تھے کہ ظفر تو ذوق کے ہو رہے اگر شاہزادہ سلیم آگے چل کر بادشاہ ہوئے تو میرے لئے بہتر رہیگا۔ چنانچہ اسی سال عید البقر کے موقع پر انہوں نے ”مشہ و شاہزادہ“ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس میں بادشاہ اکبر کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھ کر شاہزادہ سلیم کی تعریف کی تھی۔

زبے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم

بہ نصیحت تربیت پادشاہ ہفت اقلیم

لیکن بادشاہ کی اس تجویز کو حکام انگریزی نے نہ مانا اور ۱۸۶۳ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہو گیا۔ ممکن ہے اسکے دل میں اس قصیدے کا کچھ طلال رہا ہو۔ اور اس کی تعریف میں ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو جو بار بار معذرت کرنیکی ضرورت پیش آئی۔ اس کا اس قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو۔

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اسی سال نصیر الدین شاہ اودھ کا انتقال ہوا۔ اور علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مرزا نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن وہ غالباً پڑھا نہیں گیا اس قصیدہ میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا روپا ہے۔

با من کہ تاب ناز نکو یاں نزد آشتی

بد کرد بد کہ جو رو جفا کرد روزگار

اور انہوں نے میخانہ آرزو میں جو مثنوی شامل تھی۔ اسکے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کر کے پہنچ آہنگ مرتبہ کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے جس میں تصنیفات درج ہیں۔ آہنگ اول میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں۔ جو غالب نے سفر ہر تپور کے دوران میں لکھی تھیں آہنگ دوم میں فارسی مصادر و معلومات ہیں۔ آہنگ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعرا انتخاب کئے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ آہنگ چہارم میں تعاریف کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے اپنے فارسی خطوط۔ معلوم ہوتا ہے۔ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی۔ اور سنہ ۱۸۵۱ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ اندیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے۔ اس کی تاریخ عبارت ۱۲۸۵ھ ہے اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن چونکہ مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے بقول کتاب پہنچ آہنگ نامکمل ہے۔ اور اسکے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

آہنگ اول کا تذکرہ ہم ابتدائی حالات میں کر چکے ہیں۔ آہنگ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگ سوم کے اشعار اس لئے بھی کار آمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعیین کی جاسکتی ہے۔ اور اسکے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہم اور محل استعمال پڑھنا سمجھنا سہل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں جن کا بیشتر حصہ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۳ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لئے ایک پیش بہار خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں کا مفہم بتانا۔ ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے اس کتاب میں دوسرے تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تو بیشک یہ اسی محنت کا صلہ ہے جو ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی گئی۔

۱۔ مرزا کی تصنیفات کے نام بہت شاعرانہ ہیں۔ مگر رعنا میخانہ آرزو پہنچ آہنگ چہر نمبر دوم اور دوسرے جلدوں میں درج ہیں۔

مرزا کے اردو خطوط کی سرائی اہمیت کو سب جانتے ہیں۔ لیکن سوئے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعات زندگی مختصراً دہرائے ہیں۔ ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں زاب مصطفیٰ خاں کے تعلقات کی وجہ سے مالی یہ کو بھی جو زاب کے راکوں کے آئین تھے۔ مرزا سے ملنے کے زیادہ موقع ملتے رہتے تھے۔ اس زمانے کے حالات اور قسے یادگار ہیں بالتفصیل نہ ندرج ہیں۔ لیکن انکے ابتدائی حالات میں ابھی بیت کرید اور تلاش کی گنجائش ہے۔ اور تیسرا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اس کے لئے مرزا کے فارسی خطوط بیت سفید ہیں جو ان کے عمر کے بڑے حصہ کی ایک نم و بیش مکمل تاریخ ہیں۔ اور جو اس وقت لکھے گئے۔ جب مرزا نوید حالات درپیش تھے۔ اس شخص اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لئے بھی دلچسپ ہیں۔ کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی بیت ممتاز بستیوں سے شناسائی ہو جاتی ہے جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی فہرست بیت پر شکوہ ہیں۔ اور اس میں اس زمانے کے اکثر ممتاز و کرام کے نام آ جاتے ہیں۔ چنانچہ شعراء میں سے گاج، مومن، شیفتہ، نیرو، خشاں اور علانیہ سے مرید فضل حق مولانا سعد الدین سعد الدین، و قاضی القضاۃ مومین، ولایت حسین اور داکا بریں سے شہزادہ بشیر الدین میسوق، شہزادہ بیہاں شکوہ، مبارز احمد نہ کہتہ ذالک حکم سام الدین میدخل، رحیمیں خاص، بہادر شاہ نواب سعد الدین خاں شفق، مجتہد المصنوعی سید محمد و تقیم حسن ابد خاں۔ ان سب کے نام ہرگز دوستانہ خطوط موجود ہیں۔ جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ انیسویں کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی بےستیاں تھیں۔ ان سے بھی تعارف ہو جائے خطوط میں پیش رفتی حالات کا تذکرہ ہے لیکن ان سے اس زمانے کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً انہوں نے اپنے سفر نکادگی جو سورتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کی تقریر لکھنؤ کے سامنے آ جاتی ہے۔ یا جو خط انہوں نے لاہور کے رواجی کے وقت کتبائے بھی لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی اس مسجبتوں کی تفصیل ہے۔ جو انہیں معتمد احمد کی ولایت میں بروایت کر لی پڑی۔ اس کے علاوہ کئی خطوط میں سووی سراج الدین کو راج کی دلچسپ خبریں بھی ہیں مثلاً اور

کے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ جوہی انہوں نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں نے فوراً ۵۰۰ ماہوار لکھ کر اخراجات کیلئے مقرر کر دیا۔ اور جس روز وہ دہلی سے روانہ ہوئے اہلیان دہلی کی بری حالت تھی۔ وسیعہ شاہ دہلی مرزا بوظفر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ اور ایک دو شاہرہ ملبوس خاص نذر کر کے آنکھوں میں آنسو لاکے نہایت رنج و درد سے الوداع کیا۔ ایک اور خط میں لارڈ الہ رے کے اس فیصلے کی نسبت اشارہ ہے جس کی رو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگ مرمر اتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو بقول لارڈ کرزن آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جاسکا۔

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے اس کا فارسی کے دوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خواہ مرزا خود کیا کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر ان فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا۔ جن کی تصنیفات بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں اور اس امر پر قریباً قریباً سبھی فارسی اہل زبان متفق ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترکی یا متعل باوشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرز تحریر کسی طرح بھی قابل عقیدہ نہیں۔ وہ بالعموم موٹے موٹے عربی الفاظ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب جھپٹ کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ اور ظہوری۔ ابو الفضل اور ہیل کی طرح ان کی نثر میں بھی غیر ماؤس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت ہیں۔ لیکن یہ سمجھ ہے کہ ان کی نثر عمر کی تصانیف و مستند اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے۔ اور اکثر فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں۔ جو تقارینہ اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف اور مؤثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں۔ جو اردو خطوط میں ہے۔ اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے خطوط کا طرز امتیاز ہے۔ ان خطوط میں سراسر مستند و سب بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اردو خطوط میں عریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے۔

اس پر فارسی خطوط میں تکلفات اور رسمی انشا پر ازلی کے چودہ پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسکے دلچسپ اور بہرہ لغزیز پہلو شکل سے ہی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن آخر فارسی اور اردو بہرہ و تصانیف ایک ہی ذہن رسا کے نتائج تھیں۔ اور جی طرح ایک ہی مضمون کو مرزا نے فارسی اور اردو اشعار میں ادنیٰ اختلاف کیساتھ نظم کیا ہے۔ فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں جنہیں ترقی دیکر انہوں نے بعد میں نہایت موثر طریقے سے ادا کیا۔ مثلاً انہوں نے عارف کی موت پر جو غزل لکھی ہے۔ اردو کے موثر ترین مرثیوں میں سے ہے۔ لیکن اس کا چرچہ اس سے چند سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے۔ جو انہوں نے مولوی سید ابوالحسن محمد بیگ کی وفات پر لکھا۔ میگفت کہ بدلی می آیم۔ وندہ فراموش ہمیروت راہ گردانہ و ناتہ سرمنزول دیکر راندہ گرفتہ کہ خاطر درستان عزیزداشت۔ چرا بحال خرد سالانہ پروا خستہ تی تا خری خیال ہے جس کو انہوں نے اردو غزل میں نظم کیا ہے۔

مجھ سے تمہیں نفرت ہے نیز سے زانی
بچوں کی دیکھنا نہ تماشائی کوئی دن اور

باب پنجم

غالب کو مقدمے کا فیصلہ اگست ۱۸۴۱ء میں معلوم ہوا۔ اس دس سال کے عرصے میں زمانے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ جاؤ اور کا قضیہ غالب کیلئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب جن سے تنازعہ تھا۔ وہ ہی نہ رہے تھے۔ اور ان کی لاکھوں کی جائیدادیں نذر فنا ہو گئی تھیں۔ مرزا بھی اپنی قسمت پر قانع ہو چلے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ان کے تعلقات کسی انگریز افسر سے بڑھ گئے، اور منزل گم گشتہ کی ایک جھلک نظر آتی۔ تو وہ ایک نئی عرصہ داشت گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیج دیتے۔ اور پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز میں ایسی کئی عرضیاں محفوظ ہیں لیکن ان کو ششوروں اور اگلی جسم و جان کی بازیوں میں بہت فرق تھا۔ اور اب اگر عرضیاں داخلہ فرماتیں تو مرزا بہت مایوس نہ ہوتے۔ مرزا اب اپنے ماہوار مشاہرے سے مطمئن ہو چلے تھے۔ اور غالباً چند احباب ہمدرد کی اولاد کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف ملک میں عام ہو چکی تھیں۔ اور ان کی قربیت سے ان زخموں کا اندھا مال ہوتا تھا۔ جو تلاش روزگار میں کھائے تھے۔

مالی حالت ان کی بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن سرکاری طور پر جو رقم ملتی۔ اور جو کچھ احباب کی خیانت سے حاصل ہو جاتا۔ مرزا اس سے مطمئن تھے۔ اور اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کیلئے بہت سیرا نہیں تھے۔

چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں طامن کالج میں فارسی کی پروفیسری کیے انہیں بلا یا گیا۔ تو وہ چونک کر اپنے
 مٹکے جاگیردار سمجھتے تھے۔ ملازمانہ طریقے سے حکام گورنمنٹ سے ملنا انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور یہ
 ملازمت نہ لی۔ بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور مقصدیوں کی تعریف میں زمین
 آسمان کے قلابے ملا دیتے اور خوشامد و مقلد کو کوئی پیرا نہ دیتے تھے۔ وہ جیف مگر
 کے استقبال نہ کرنے سے کیوں استعفیہ چرائی ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا کا حلیہ صائب نہیں ہو
 ایک طرح کا مبافہ مدار رکھتے۔ اسے وہ ایک شاعرانہ دم تکھتے تھے۔ جسکے اثرات سے سب شاعرانہ
 چلنے آئے ہیں۔ وہ طبعاً خود دار اور حساس تھے۔ اور دھندھری کے تمام دھندھروں کا دھیان رکھتے
 تھے۔

ان دنوں اس کے تعلقات سر سید احمد خاں اور ملک جانی سید محمد خاں سے ٹوٹ رہے تھے۔
 میں ان کو منتخب ویران ریختہ بیسا کہ بروہی کریم الدین کے ترکہ کو، شعوت پتہ چلتا ہے۔ ان جہانوں
 کے کوہیں دنیا اطراف سے چھپ کر شایان بروہی و بروہی کی ایک تین یا چار جہاں بدشیت ہو رہا ہے
 سرنگرنے بادشاہ اور دھکے کتب خانے کی جو فہرست مرتب کی تھی اس میں ویران غائب ہو گیا
 ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۲۸۵ھ سے ۱۲۸۶ھ تک ہے کہ ان کتابوں کی شاعت سے مراد ان شہرت

جہاں پہلے نہیں تھی وہاں پہلی جگہ پر گئی۔ اور ان کا بلند مرتبہ سب سے اونچا ہے۔
 سو وہ ان میں ان دنوں مری میں جا بجا مشاعرے ہو رہے تھے۔ ان میں تو ہی اور اور جہاں
 پہنچ جاتیں۔ مرزا سب سے ترنہ پڑھتے تھے۔ لیکن ان مسودوں کا انتخاب مرزا ب ضیاء الدین کو کرتے
 ان میں مرزا ب ضیاء الدین کا صرف ایک ہی مسودہ ہے۔ اس نے ان دنوں میں چند ایک
 غزلیں پڑھیں جن میں وہ ایک کے بعد ایک کے ساتھ مرزا کو انتخاب کرتے ہیں۔

مرزا ب ضیاء الدین کی فہرست
 مرزا ب ضیاء الدین کی فہرست
 مرزا ب ضیاء الدین کی فہرست
 مرزا ب ضیاء الدین کی فہرست

شخصہ دہر بر ملا ہر چہ گرفت پس ندارد کاتب بخت در خفا ہر چہ نوشت حکم خواست
 بحث وجدل بجائے مان میکہ جوئے کا نذران کس نفس از جمل نزد کس سخن از دنگ است
 گشتہ در انتظار پر ویدہ پیرہہ مفید در رہ شوق ہمراہ ویدہ زمر و ملک خواست
 سہل ثمر و دسر سری تا قدر بخیر نشمرے
 غالب اگر بادری داد خود از فلک خواست

اس مشاعرہ میں جو طبعی غزل انہوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت پُر لطف ہیں۔
 چہ پیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید بر نوئے گفت می آیم کمی در غم نمی آید
 ویرم شاعرم رندم ندیمم شہودہ ما وارم
 گرہ قلم رحم بر فریاد و اقامت نمی آید

انہوں نے عرفی کے مصرعہ پر جو قصیدہ ”گرہ بستن“ کی ردیف میں لکھا ہے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے دینے ہوئے مصرعہ طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس مشاعرہ میں یہ پڑھا گیا۔ اس میں میر نظام الدین ممنون اور مولوی انام بخش صہبائی علات کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ اور چونکہ فارسی کے قدر دان تصور تے ہی لوگ تھے۔ مرزاش و پنج میں تھے کہ پڑھیں یا نہ کہ مولانا صدر الدین آزاد وہ جو ابھی نہیں آئے۔ تھے۔ آپہنچے چنانچہ مرزا ایک خط میں نواب مصطفیٰ خان کو جنہاں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ بھیجا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ”بندہ را در زمیں گریستن بتارث قصیدہ اتفاق افتاد بود۔ اے مے سنجیدم کہ ایں درق را چوں برات نامقبول بازہرم در یختہ گویاں را دیدم سرند ہم کہ آمدن حضرت آیتہ دل بخود بالید و زمر مہ دستوری یافت۔ چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرے میں پڑھا گیا۔ اور جیسا کہ یادگار غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ بہت پسند ہوا۔

مرزا نے عرصے سے اردو شاعری ترک کر رکھی تھی۔ اور ۱۸۴۳ء کے ان مشاعروں میں جنہیں دُشعرا تو اردو غزلیں پڑھتے مرزا نے فارسی اشعار ہی پڑے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۳ء میں گاہے گاہے انہوں نے اردو غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ جب نواب فضل علی خاں نسیم

نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا۔ اور ذوق۔ مومن اور غالب کو دعوت دی۔ تو انہوں نے اردو دل
ای پڑھی تھی۔

نویں امن ہے یہ سدا در دست ہاں کے لئے
رہی نہ طرز سستم کوئی آسماں کے لئے
اسی زمانے میں انہیں فراب تحمل حسین خاں رئیس فرخ آباد سے دعوت آئی برلی تھی
مرزا نے لگے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ہے
دیباچے نالقی کو بھی تا استہ نظر نہ لئے !
بناتے پیش نگین مسین خاں کے لئے
اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقوف پر فارسی قصائد اور قطعات جس بکثرت لکھے ہیں
جب سر جس طراسن جنہوں نے مرزا کی یہ تحریر کا سوال کیا تو اس نے اس سے بھانا یا بھٹا کر کے کہہ
ہوئے۔ تو مرزا نے اس کو خود پر دس شعر کا ایک شعر یہ بعد معاً تھا میں کا پڑھا تو ہے۔
ہوا غیر فتنہ است واد کو ہر بار
جو میں گل بسریں میں سب ایک بار

عمرانیہ قطعات میں دیتے تھے۔ اور اکثر اسی قصہ کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے۔ بلکہ
میں جب اگر یزیدوں نے ملکوں کو شکست دیکر پنجاب فتح کیا۔ تو مرزا نے کہیں شکر ایلک
قطعوں کیساتھ ہونے کسی کی تعریف میں ہے۔ وہاں لکھا ہے اسی کو جیو یا۔ اس میں سکھوں کا
یہ اٹھتے سر سید کی کڑب تیرا سدا است یہ چناتے کو سب ہمارا بد بخت سلگ
چند اٹک کے خوف ہونا۔ یہاں تک کہ وہی نے ہر دو اعدوں پر۔ تو دلی میں بیٹھے وگ
بغیاں تھے۔ ہمارا جب کے انہیں مرہٹوں نے خراب تو ہوئے اپنے ساتھیوں کے خلاف ہوئے
کا سبب ہوئے۔ لیکن جب شکست میں تھا۔ تو ان کو مرہٹوں نے شکست دی۔ تو ان
بہت خوش تھے۔ چنانچہ یہی قریب مرہٹوں کے ہونے کو بھی یہ قصہ اسی وقت لکھ کر دل کا قند

انہوں نے اس موقع پر جو پرکھتے قصیدہ غار ڈنڈا کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پر لطف ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ اگر میں جو ان ہوتا تو حصولِ ثواب کی نیت سے سکھوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہوتا۔ لیکن پنجاب کا امن و امان انہیں جس چیز کیلئے عزیز ہے۔ وہ کشمیر کی شراب ہے! اس

گزارشِ شیوہ من نیست راست میگویم	دریں زمانہ مرا بودی از زمانِ شباب
پے شک تن کف رستے بہ نبرد	کمر بہ سرخوشی نیت حصولِ ثواب
کنوں کہ ملکِ مطیعت و راہِ نجس و خار	زمن بگلیغ و شندگانِ بادۂ ناب
شرابِ قدسی ہندوستانِ عالمِ سوخت	ز شیرہ خانہ کشمیر آردند شراب

ادبی نقطہ نظر سے اس زمانے کی اہم ترین تصنیف ان کی فارسی شہسواری اور گور بار ہے۔ حال کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سرسید احمد خاں نے آثارِ السناء وید لکھی۔ تو اس وقت یہ شہسواری ۱۷-۱۵ جزو کے قریب ہو چکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی نہیں ملتی۔

حقیقت میں مرزا کا ارادہ شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے۔ وہ ابتدائے اسلام کے جنگوں کو شہسواری کی صورت میں بیان کر دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

ز فرود سیم نکتہ آگیند	ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر
خود بردن شمع ساسانیان	بود صبح اقبال ایمانیان
رقمِ نسخ منشور یزد و انیسیم	دایمانیاں گویم ایمانیم
کے راگز ناز و بہ بیگانگان	خود در شمار روز و یوانگان
باقبال ایمان و نیروئے ویں	سخنِ رانم از سید اسیران

لیکن انہیں یہ ارادہ پورے کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور وہ حدودِ نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامہ سے زیادہ نہیں لکھ سکے۔ ان کا نعت کا حصہ صاف اور موثر زبان میں ہے۔

مذہبے مضامین بھی پیدا کئے ہیں مثلاً
از فرنیکہ در کربلا شد سبیل
اور اگر دوام زمان غلیل
یا موانع کے متعلق لکھا ہے۔

بدور تو شدن ترالی آہن
تراخو استگدار است یزدان پاک
فصاحت مکرر نگنجد سخن
ہر آئینہ از من ترالی چرباک
ساقی نامہ میں انہوں نے بچا رسے نغمی کا لفظی ازیات چنا غلبہ ساقی سے خطاب کیا
بیابانی آئینہ بہ آئینہ کن
سپاہانغی نہ دست برد
طراز بساط کرم ناز و کن
چہ ستارک ہونے نماند بہت بڑا
فرش بخور چوں بے بیگ نیست
ستہ بدو کور درش بہام نیست
درع پیشہ سبکین چہ راند ترا
بہ آئینش نامہ نوراند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیلا ہے اور عام شہری میں بھی مناجات
اور ان کے آخری حصہ میں جو شاعری کا جملہ معیار انہوں نے قرار دیا ہے۔ اسے در باہرم نیاہ غیر
اسکی وجہ ایک یہ ہے کہ مصنفین میں پانچویں سہلی مشہور تھیں جن کی وجہ سے شہر مذہبی اور
کی اس میں بنائیں نہ تھی۔ اور یہ تمام شعر انہوں نے رنگ رنگ دیکھی ہے۔ چنانچہ وہ نورانی شعر
کے آخری حصہ میں لکھتے ہیں۔

دیں دو بیچ سفر باہیت
بیزش گرد و نہ اور نقاب
بود دست یگین نور باہیت
نور و نور و نور و نور
سخت و چو گشت سبب آواز
کراں رنگ بدانت نور آواز
دریں بزم و باقی و باہیت
نور و نور و نور و نور
بہت نکلے کہ شادی کی ناگواری نہ تھی ایک اور شعر انہوں نے لکھا ہے۔

میں چوسر کے ساتھ کچھ بدکر کھیلنے کی بدولت اُن پر ایک حادثہ بھی ایسا گزرا تھا جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں۔ ۱۸۴۷ء میں چوسر کی وجہ سے مسز ڈاؤنٹن مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں ان پر جو فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اسکی تفصیلات یہی کے احسن اخبار مورخہ ۲۵ جون ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اور چونکہ اس سے زیادہ مکمل اس واقعہ کی تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں۔ بہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں۔

"دہلی ۱۵ جمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ منظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جاوے۔ یہ معوزین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے فراتجانباً بہرہ سارے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارتش کی اجازت نہیں دیتا، معلوم ہوتا ہے بادشاہ کی سفارش کا رگڑ نہ ہوئی۔ اور مرزا کو جرمانہ اور قید کی سزا ہوئی۔ چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے "مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا۔ اس کا فیصلہ سنایا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دوسو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دوسو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں۔ تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اور تھوڑے جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپیہ زیادہ ادا کئے جائیں۔ تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا اقلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کم از کم یہ بات کہ اس قدر مصیبت اور شفقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر شریعہ صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو۔ تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھالیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکال رئیس کو جسکی عزت و حرمت کا ویدہ لوگوں کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

غالب نامہ

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معزز اور فاضل آدمی تھے اس طرح جیل میں جانا انتہائی ترین اور بے آبروئی تھی۔ ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعراء میں لکھتے ہیں: ان دنوں مولوی کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ ٹوٹا جن کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے۔ اور قلعہ کے نام بھی انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ بیت بڑا دھبہ رہ گیا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے ایک نہجور جسیور ترکیب بند لکھا تھا جسے ہم نے تمام کا تمام حصہ انتخاب میں نقل کیا ہے۔ اس ترکیب بند سے جس معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کس وقت نواب صفی خان نے الٹی پڑی مدد کی اور مرزا نے خواجہ سلطان کی تعریف میں جو ہر دست لکھی قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

بشنود ہے آنکھ باد آں۔ پرو

نالہ گرد و گنج زندوں کی زند

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اگر قید کی پرہیزگیاں جتنی نہیں پڑی اور تو ریاضتیں پہننے کے بعد بھی ہو گئے۔ رگڑائی کے بعد وہ بیمار ہوا۔ اس کے مرشد کاسے خان صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ اور ان کی وجہ سے دربار میں باریاب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باریابی کے بعد وہ بیت اور بیت سے قسیدہ لکھ کر دربار میں پیش کر چکے تھے۔ اور ان سے نہیں لگے کہ ان کی باتیں تھیں۔ لیکن اس باریابی کی وجہ سے انہیں آئی تھی۔ چنانچہ ایک فارسی قصیدہ میں لکھتے ہیں:

شہنشاہ غرور و دہشت کا رہا۔ میں یہ کہہ گیا کہ ایک جامع ہو گا

بیادگر ز سونہ سیر و سب۔ یہی شوق و غم و سوسے روز گریا

چہ کرم و کرم و کرم و کرم۔ یہی شوق و غم و سوسے روز گریا

ایک اور فارسی قصیدہ میں دربار سے دور ہونے کی نسبت تعریف اشارہ ہے۔

خود تو قرب شہاد و شہادت۔ میں یہ کہہ گیا کہ ایک جامع ہو گا

میت نہ کہ مرزا اپنے یہاں تھے

معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور اس کے معاویین (مثلاً ذیاب حامد علیاں) مرزا کی کوششوں میں روڑے اٹھاتے تھے چنانچہ مرزا کا وہ فارسی قطعہ جس کا ذیل کا شعر بہت مشہور ہے اور جس میں سوائے ذوق کے کوئی اور مخاطب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی زمانے کی یادگار ہے۔

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگارنگ

بگداز مجموعہ اردو کہ برینگسمن است

اسی زمانے میں انہوں نے بہادر شاہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا۔ جس میں کئی شعرا کی حالت کا بیان معلوم ہوتے ہیں۔

گفتم حدیث دوست بقراں برابرست	نازم یہ کفر خود کہ بائیاں برابرست
گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشے	خود خواہش محال یہ حرمیں برابرست
با چادر گرگہائے کہ تیمار پیش کش	در ویست در دلم کہ ہدماں برابرست
زین موج خوں کہ می گزرد دمیدم زمر	دستار من یہ لالہ نفسماں برابرست
کینہائے آشکار کہ سر جوش نازاوست	در ذوق با نوازش پینہاں برابرست
نے وعدہ نہ پریش زانے نہ شکوہ	داغ زانامہ کہ یہ عنوان برابرست
نے کف گرفته ساعد فی لبہ بردہ لوس	در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابرست

پیوستہ پر فشاں و نہ جستہ ز آستیاں

پرواز من بہ جنبش مژگاں برابرست

اس قصیدہ میں غالباً ذوق کی طرف اشارہ ہے۔

بالد بخوش خواجه جو گوی سخنور سش	غافل کہ این ترانہ بہ بیتاں برابرست
نے ہر ترانہ سنج نگیسا نوا بود	نے ہر سخن سراسے بہ بجاں برابرست
نے ہر شتر سوار بہ صلاح بود ہمال	نے ہر شیان مبرحی عمریں برابرست
نے ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوی برد	نے ہر کہ بارغ ساخت بہ عنوان برابرست

لکھوانے کا خیال پیدا ہوا۔ تو انہوں نے غالب کو بلا کر یہ کام اسکے سپرد کر دیا۔ مرزا مہر نیمروز میں لکھتے ہیں :- ”اگر در شرع روا بودے گفتے کہ شاہ سکندر راست و حکیم ارسطو ہا نابند نامی سلطان ہرور آفاق چشم داشت۔ کہ چوں منے را کہ بہ جاود بیانی شہرہ آفاقم بگوار گزاری گاشت من خود ازال رو کہ دل و زیاں این بیدار مغز آئینہ دار دل و زبان شاہ است دائم کہ آنچہ علیکما دریں باب بہن فرمودہ فرماں شاہ است۔“ چنانچہ بادشاہ نے حکیم صاحب کی تجویز پر صادر کیا۔ اور ہرجون ۱۸۵۷ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شالان تہوریہ کی تارکین نویسی پر مامور ہوئے۔

باششم

لال قلعہ

۱۰۵۱ء کا سال مرزا نے بے بیوت مبارک نامی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی سال
ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک کے است و مقدر ہوئے۔ اور پھر سو دس سالوں میں
مقرر ہوا۔ ولی عہد نے داغ کی داغ دینی نواب شمس الدین کی بیوہ سے شادی کی تھی اور ظاہر
کہ مرزا کی دہلی شہرت بہت مستحکم ہو گئی ہوگی۔ جو دلی جہان نے تمام کچھ دقتات سے چھڑ پائی کہ
مرزا کو استاء چنا۔ ولی عہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین جندیا یہ فارسی تصانیف
ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب تو ہم روز ان کے غزلوں سے دوسرے شعر میں دیکھتے
قصیدہ دلی کے تفسیر سے ہی پھر رہے ہیں۔

میرزا بیک سستاں آید بھی	و اور سلطان شہان آید بھی
شہزادہ بخت دلی آید بھی	شہزادہ بخت دلی آید بھی
شہزادہ بخت دلی آید بھی	شہزادہ بخت دلی آید بھی
تیسرے تفسیر سے ہے کہ شہزادہ بخت دلی آید بھی	تیسرے تفسیر سے ہے کہ شہزادہ بخت دلی آید بھی

فریب پیش پہنہاں نگر کہ من ہمہ عمر بدوق وصل ز بد سا ختم بہر انش
کسم بہ خود نہ پذیرفت و دہر باز مبرد چوں نامہ کہ بود ناخوشہ غمناش
ازاں بہ گلشن گیتی نشاط میورزی کہ بوسے ز ہر ہی نشوئی زریکاش

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی۔ کیونکہ ویسے بعد چل بسے۔ اور اگر جہاد بی
نقطہ نظر سے درباری تعلقات نیک پھل لائے۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اردو خطوط کا آغاز
اسی زمانے سے ہوا۔ اور وہ مرزا کے ایران شہرت میں مضبوط ترین ستون ہیں۔ دوسرے
ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اردو غزلیں لکھنی پڑیں لیکن فوق سے معاصرانہ کشمکش
باقی تھی۔ اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں ہی سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ آب حیات میں اس
فصیحہ کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ اور غالب نے الزور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے
نام ایک خط میں بھی اسکے متعلق ذکر کیا ہے: "از دیر باز مردستانہ نسائی اردو ندارم۔ ہمانا از رضا جوئی
شہر یار سیماں پیشکار است گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن ویشہ ہرمان بانوی بلیقیں برستار بہت
در ریختہ بدیں ردیف نار و اول آدین مگر در مقطع غزل سرستانہ ہوسے زدہ با شتم آں کیے کہ گمان
کمالے کہ نداشت داشت پذیرا شد کہ روئے سخن سوسے درست۔ در مقطع غزل لیکہ سرود ہنجا ہنیزہ
گام زود دانست کہ گفتار مرا پا سخ سازد و من بسیتی این نہ جرعہ کہ فرد ریختہ خامہ من است مع

۱۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے۔ کہ مرزا کو اردو خط و کتابت ۱۸۵۷ء میں شروع کرنی پڑی جب وہ بہتر
نہ نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم بتا چکے ہیں (اور مرزا کے اپنے فارسی خطوط ہی اس امر کا بین ثبوت ہیں) کہ
مرزائے آسان اور سادہ خطوط نویسی کے جواصل اپنے رسالہ خط فارسی میں بتائے تھے۔ ان پر خود جہاں بہک فارسی
خطوط کا تعلق ہے۔ کبھی عمل نہیں کیا۔ لیکن اردو میں انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ بے تکلف اور سخن آرائی سے پاک ہیں۔ وہ
خود نشی نوکشور کہتے ہیں درباری دیان بسا سخن گفتہ ام دہر نامہ ناگشا شد۔ اکڑن کہ دل از آرائی سنگا نش بر نمی ناہد۔
کا دہر خود آسان کردہ ام دہر جوی باید نبشت۔ در اردو نویسی گوئی گفتار در نامہ فردوسی پیچم و بہ دوست میفرستم حاشا کہ
در اردو زبان نیز سخن آرائی و خود نمائی آئین باشد۔ آنچہ باز دیدیماں تو اں گفت۔ بہ دوراں نوشتہ ہینزد

ہرچہ درگفتار فرقت آں ننگ من است
سر سخن فسد دنیا و دم و قطع نظر لیل قطعی انتہی از شرم دم

اسکے بعد نہایت متاسفانہ انداز سے اپنی ناکامیوں پر آئندہ بات میں نہ آکر زمین کے
مراڑیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدہ نہ بآئین نیاکان فریض سلطان منجھوڑا کا دوسرا و نہ فرزند
فرز انگان پیش بعلی آسا علم و ہنر کے جھگڑے ویش باشم و آزادانہ رہ سپہ پر ذوق سخن کے ذیل
آدہ ہرور رہزنی کرد و مرا بدال فریفت کہ آئینہ زد و دان و صورت معنی ضرورن نیز کار نمایاں
است سرشکری و دانشوری خود نیست سو فیکری بجز ادب و سخن مستہ می در دست آرد ناگزیر پیمناں
کردم و سفینہ در بحر شکر کہ سراب است رواں کو دم قلم جلا شد و تیرہ تیرے شہت با قلم خود ادا
دیدہ و رے نیو یا بود و بن نیرداشت جانا و تیرے رونا کا زمین نہ از و شکر فیکے کہ میں سرشت
فرجام کار انہوں کہ دندان فروریخت و گوش گریخت غوی پیدا است و دے پڑا رنگ
دست بکڑا اندر دست و پائے در رکاب نہاں ہمہ سو گد و درمہ بود و جان نہندی و نانی تو گد
بن ماند و بس تا از آنچہ امروز گاشته ام فردا یہ و در دم

یہاں شاہ کے آخری سال بھی بہت اچھا نہیں لگتا تھا۔ نواب زینت علی شہزادہ جوان
کی دیکھدی کیلئے کوشاں تھیں۔ لیکن اس میں کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ ست ماہہ اسکی
صحت بھی خراب تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۷ء کو یہ بڑا نٹ و فی نے رپورٹ بھیجی کہ بارشاہ بیمار
ننگ سے بیمار ہے۔ اور راج کے لئے نہ صفر بائیکاہ اور نہ ختم ہے۔

مہر خیز و زینتی تاریخ شاہان تیموری کا پتہ اندر و راج شہدائے کچھ پتہ غلبرگ
محمد میں بادشاہ کے ایمانے فرماؤں ج میں نصیب راجہ علی علیہ السلام و راجہ علیہ السلام
زینت نہیں آئی۔ اسکی وجہ معلوم نہیں۔ مگر کہ بادشاہ میں حسد و کینہ تھی چھ سال بعد کہ
تاجم راجہ علیہ السلام بادشاہ پر سارہ اور موثر نہ تھیں۔ اور نہ تھا۔ انت مرزا کی نیرنگی
ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انہیں میں اسکی صفت لہر کر دینا کا پسند ہوا اور انہیں

اس کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو یہ صیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے۔ اس پر انکی پیاز کی مثال صادق آتی ہے۔ کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جسکی تاریخ ہم اسوجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مورخ نے لکھی۔ بہت ہونی چاہی۔ کچھ بھی نہیں۔

۱۲۸۰ء میں یعنی جس سال مہر نیروز مکمل ہوئی۔ مومن کا انتقال ہو گیا۔ مومن خود ایک بہت مرتبہ شاعر تھا۔ اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔ مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ جس اظہار انہوں نے فارسی رباعی میں بھی کیا ہے۔

نحوں نابہ برخ زویدہ پاشم ہمہ عمر
شروطست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر
کا فر باشم اگر بہ مرگ مومن
میسکن جس موت کا انہیں "مرگ مومن" سے بھی زیادہ رنج ہوا۔ وہ ذاب زین العابدین کی وفات تھی۔ عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے۔ اور چھوٹی عمر میں ہی خوب شعر کہتے تھے مرزا کو وہ بہت عزیز تھے۔ اور ان کی نسبت انہوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے۔

آں پسندیدہ خوی عارف نام	کہ رخش شمع دودمان مست
از نشاط نگار شش نامش	خامہ رقا ص در بان مست
آنکہ در بزم قرب خلوت انس	غمگسار مزاج دان مست
زور بازوئے کامرانی من	راحت روح ناتوان مست

ان کے مرنے کا مرزا کو بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ میں کیا ہے۔ مرحوم کے دو بیٹے تھے۔ حسین علیخان اور باقر علیخان۔ مرزا پہلے حسین علیخان اور پھر باقر علیخان ہر دو کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں بچوں کی طرح بڑے پیار سے پالا جس کا ثبوت انکے اردو خطوط سے بخوبی ملتا ہے۔

نواب کی خدمت میں بھیجے۔ چنانچہ نواب انکے شاگرد ہوئے۔ اور گا ہے گا ہے انکی مالی امداد کرتے رہے۔ اس مالی مدد کے علاوہ اردوئے معلّے کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر صدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانی لوگوں کی دیرپوزہ گرتی اور خاتمہ کشتی تک نوبت آتی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا اور اگر وہ صدر سے پہلے اپنا اردو دیوان رام پور بھیج دیتے۔ تو چونکہ ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا ہوتا۔ ناممکن نہ تھا کہ جس طرح ذوق اور آزاد کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوان غالب بھی اسی آگ کی نذر ہو جاتا۔

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزائے دو تین سال کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کی طرز شاعری کا بہت مدح نہ ہو۔ حالی نے بھی ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزاد کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بادشاہ کے استادوں کو ایک پھول اور ایک کلی سے گلہ متہ بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفر کی نسبت یہ بات بہت مشہور ہے۔ لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیات ظفر میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور جب ہم کلیات ظفر کا عام معیار دیکھتے ہیں۔ تو یہ اظہار اس میں مرزا کے نتائج فکر بھی شامل ہیں۔ مرزا کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا۔

غالب بادشاہ کے استاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر رہا تھا۔ جب بہادر شاہ ۱۸۵۷ء میں بادشاہ ہوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر بادشاہ کے جرحقوق ہیں ان سے وہ دستبردار ہو جائے۔ لیکن بہادر شاہ اپنی بیدست دہائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اڑا رہنے کا عادی تھا۔ وہ نہ مانا۔ لیکن اب اس کا انجام قریب نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان کو قطب جانا ہو گا۔ نواب زینت محل کی اس فیصلہ پر ریڈیڈنٹ سے بڑی جھڑپ ہوئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا۔ اور اس کے دو سال بعد جب نئے ولیعہد کا تقرر ہوا۔ تو طے پایا کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشین کو

بہادر شاہ سے پیش کم ملیں۔ دوسرے اس کا خطاب شاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا۔ یعنی شاہی سلسلہ
بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ فہم ہو جائیگا۔

مرزا حکام دس تھے اور ان باتوں سے یہ خبر ملے تھے کہ ۱۸۵۲ء میں ہی جب بادشاہ
بیمار تھے۔ تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت مشورہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں ایک خط میں منشی
امیر اسنگ کو لکھا ہے "از شب عید ناقان رنجور است۔ حال ادھر یہ رو نہاید نہ بین کہ در سایہ دیوان
غزوہ ام چہ رود" اب انہوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائے گا
اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے زمانہ واسے انگلستان ملک
ڈکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر درویشنگ کی معرفت ولایت بھجوا دیا۔ اس کے
ساتھ ایک عرضداشت تھی کہ روم و ایران کے بادشاہ و شعرا پر پڑی ہوئی عنایتیں کرتے ہی
اگر شہنشاہ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پیشکش سے سرفراز کرے تو عجیب نہ ہو
تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سنئے۔ وہ اس پریشانی سے آزاد ہو کر بدیں انداز نشان وادھ
میر خسران روم و ایران و دیگر کشور گریاں و باطن گستران و ستار شکن و درخشانی و کبش
رنگ و شاد رفت و دین پائیز و پناشتن و سیر زلفتن و دود و دین و کشت ندان بکار و
ایں سخن گستر سائنس و مرغزانی و زنبار شہنشاہ و ساریے بندگان شہنشاہ و خان و ریزہ از قواف
شہنشاہ میخوابد۔ ہمارا پانچواں مرغزانی و ساریے بندگان شہنشاہ و ساریے بندگان شہنشاہ و خان و ریزہ از قواف
انگریزی زبان پیش تو آمد بود تا غالب کو لندن سے اس خط کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۳ء میں
رسل برک کی طرف سے ملا کہ درخواست پر تھیں کہ بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق حکم صادر
مرزا کیسے یہ جواب بہت عرصہ افزا تھا۔ اور وہ پتہ نہیں میدے کہ کیسے کیسے باندھ
تھے کہ ۱۸۵۳ء میں منشی کو خبر ہو گیا۔

۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۷ء مرزا کی زندگی میں قضا کے قضاوی نے تھیں۔ ان کی موت ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔

بافتہ

”غفر“

اندر کے دوران میں غالب کے حالات زندگی تلاش کرنے کیلئے ہمیں ان کے خطوط اور قصائد میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے مفصل حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں۔ سوانحی و تحسینی کے علاوہ کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو شروع سے آخر تک ان حالات میں شریک رہا۔ اور جس کی راست گوئی کے دوست و دشمن سب معترف ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھ دیئے گئے ہونگے۔ صحیح نہیں۔ مرزا خود ایک اردو خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے متعلق متاثر تھے۔ لکھتے ہیں ”ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیج دوں گا۔ اور ایک بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کر دوں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی۔ اور صاحبانِ مطبع کو اسکا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا“ اس کتاب کی زبان مہینہ روز سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی الفاظ ترک کر دیئے جا بجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرتے پڑے ہیں۔ شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب ضبط نہیں ہوتا۔ اس میں بیشتر تو ان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پر گزرے۔ لیکن اسکے علاوہ عام

حالات کا تذکرہ بھی مفصل ہے بشروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرے کے بعد اسی مسئلہ کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج دہلی آئی اور یہاں قتل، غارت کا بازار گرم کیا۔ اس میں موثر ترین حصہ بچوں اور عورتوں کے قتل کے متعلق ہے۔ جس کا مرکز کو حیدر علی تھا۔ یہ سبقت خاکے نما تذکرہ از خون گل اندامان ارغوان زار نشد و یہی کج ہائے بنو کہ از بے برگی مانا بزم نہ نور بہار نشد۔ طے آں جہانداراں داد آموز دانش اندوز نکو خست نکونام و آہ نال خاتوناں پر یہیچہ نہ نازک اندام بارے چوں ماہ دستے چوں سیم خام و دریش آں کو دوکان جہاں نوید و کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ گل میخندیدند و خوشخوئی بر یکبک و تندر و آہو میگردیدند کہ ہمہ یکبار بہ گرداب غری و رفتند۔ مرزا کا نگریز بیگناہوں کے قتل کا ہمیشہ اندیشہ رہا۔ چنانچہ ندرتے کئی سال بعد ایک اور خط میں لکھا ہے: "انگریز قوم میں سے جو ان بدسیاہ کالوں کے ذریعہ قتل ہوئے ان میں نئی میرا امید گاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"

اس قتل عام کے بعد جو لوٹ مار و دہوئی۔ اس کی تفصیل دی بنہ ان خاصا نیکہ برو زابہر و زوقن خاک زمین کی کا فتند و خاک خروہ زریا فتند و کسانیکہ شبشب در بزم سے از آتش گل چراغ می افروختند و کلبہ تاد بدایع ناکامی سوختند زیور و پیرایہ رویاں شہر جز آفتاب کہ در گردن گردش زن و دختر شبگردست بر در کبہ شہر ان یہ کار ناہوا فرودست۔ اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے تلہ کا رخ کیا اور مرزا نے جو کچھ کھا ہے اس سے بہادر شاہ کے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ندر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سیاہ کا کام نہیں بلکہ حکم تھا۔ مرزا لکھتے ہیں: "چوں شاہ سپاہ را نتوانست زانہ سپاہ فرود آمد و شاہ فرودمانہ شد و را در میان گرفت سپاہ وین گرفتند و در وقتین ماہ شاہ و ماہ گرفت را مانہ نہ کہ ماہ و دست را مانہ"

دہلی سے انگریزوں کو انتقام ملنے اور وہ بارہوی فتح کرنے تک جو حالات رد پذیر ہیں ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے۔ اور فقط پانچ چھ سطحوں میں اس پر سب سے زیادہ دل کی سرگزشت

ہے۔ وہ ہمیں جھٹایا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خرب ہینہ برسا۔ لوگوں نے چادر باندھی۔ اور اس کے نیچے گھڑا رکھ کر پانی جمع کیا اور اپنی پیاس بجھائی مگر مرزا لکھتے ہیں: "گرینڈ ابراہیم از دریا بردارو۔ و ہر دسے زمین فرو بار دہاں بار ابرگرال پایہ ہما سایہ آب از چشمہ زندگی آورو۔ ہر آنچہ مسکنہ در پاروشانی بہت مایں کاف کام شد را بہ آشام در تباہی یافت۔"

کام سرور بادہ اسام درباری دوست
 معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ جیسا کہ سیاستوں کی وجہ سے مرزا کا حکمرانیت سے تو مخفی قرار
 لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں مرزا کے حوٹے گائے شاہ صاحب کے یہ خانے میں محمودی
 لگائیں تھیں۔ وہ نعمتہ فوج نے گھوڑ نکالیں۔ علاوہ اس کے یہ پتہ پتا ہے کہ سیاستوں کی
 ردک ٹوک کے باوجود چند گورے و مکتوب کو دیو میں نہ دے میں بھنے میں۔ اور انہوں
 نے دوسرے چھوٹے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر مرزا کے گھر میں آ گیا۔ مرزا کا بیان ہے کہ انہوں
 نے مال اسباب کو نہیں آٹھایا۔ البتہ مرزا کے فتنے اور چوں اور چند مساریں کو قلب اعیان
 سوداگر کی جوئی میں کر نیل برادوں کے سامنے بیٹے۔ جہاں چند سوالیہ جواب ہوئے۔ اور مرزا کو اس
 روز گھر جانکی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کی نسبت مرزا نے تو جستجو نہ کرتا نہیں کیا۔ لیکن
 نواب غلام حسین خاں نے قہر کے متعلق جو حالات لکھے ہیں۔ میں میں مرزا کے متعلق ذیل کا اضافہ
 ہے۔ "مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا خوشتر صاحب کے حریف میں چند گورے تھیں کہ ان کو گرفتار کر کے
 لے گئے اور کر نیل برادوں صاحب کے سامنے یہ جان کر اور پیش کیا۔ مرزا صاحب کی چند زندہ ہی باقی تھی
 اُنکے ایک دوست امداد سے اس وقت ہاں بیٹے ہوئے تھے۔ انوں نے ان کی اعادہ کر کے رانی
 دلائی ہے

[illegible]

مرزا تو سخت جان تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں۔ اور بچ نکلے۔ لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا عرصے سے دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اور غالبؔ کے مکان سے دور وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جتنا وظیفہ غالبؔ کو سرکار سے ملتا تھا۔ اتنا ہی انہیں ملتا تھا۔ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ جب دہلی فتح ہوئی۔ توقیت کی طرح نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پر ان کے ہاں ایک بوڑھی ذکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی یہ اطلاع ملی۔ لیکن بے بس تھے۔ اسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ "کس فرستادن دآں سہ تن وکالارا بدینجا آدر دن اگر جادو دانستے توانستے" (اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بھائی کا فکر ان کے دل پر بھاری بوجھ تھا) چنانچہ لکھتے ہیں "من ہمہ در بند آہم کہ برادریشب چوں خفت و بیرون چہ خورد۔ دنا آگهی بیاں پایہ کہ نیتوانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مرد" (مذاہب کو جب انہیں اپنا دروازہ بند کئے ہوئے پندرہ سولہ دن ہو رہے تھے انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے۔ اور سب کچھ لے گئے۔ لیکن انہیں اور بوڑھے نوکران کو زندہ چھوڑ گئے۔)

نواب معین الدین جو مرزا کے دوستوں سے قریبی تھے۔ غدر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ مرزا اسد اللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز سن کر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹ اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا بوڑھا دربان آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گئے۔ مرزا کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ۔ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ نہ کفن کیلئے کیڑا۔ نہ مردہ نہلانے کیلئے مردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کیلئے گورکن۔ اسکے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک ہفتے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ شہر میں دوتین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا ہی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لیجانے کی ہمت کسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بیسی پر رحم کیا۔ اور چھپو پھپھن کی طرف متوجہ



ہوئے چنانچہ بیٹا لے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا۔ اور مرزا کے دو نوکروں کو
ساتھ لیکر میت کو لہلایا۔ اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے۔ ان میں لپیٹ کر قریب کی
ایک مسجد میں مرزا کو دفن کیا۔ دستینوں سے یہ اسرار خفیہ نہیں ہوتا۔ کہ آیا جانی کی تدفین ہوئی
مرزا موجود تھے۔ لیکن اگر وہ تھے بھی اور نہ تھے جنازہ کا بھی کس طرح انتظام ہو گیا۔ تب بھی مرزا کی سزا
انجام ان کی زندگی سے کم حسرتاں نہیں معلوم ہوتا۔

دیر بخ آنگہ اندر درنگ تہ بیت
تہ خاک بایں خشتش نہ بود
خدا یا بریں مردہ بخشاشے

معلوم ہر ملت۔ فتح و ملی کے بعد جو آخر تھری بھی وہ بیت۔۔۔ کہنے میں ختم نہیں ہوئی ہرگز
میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو گیا تھا۔ لیکن مرزا کی سزا میں ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ابھی تک
حالت ہے۔ دن کو بیکرا رہتا اور رات کو الیساں سے نہ سوتا باقی ہے۔ اور الیساں بھی ہے
جیکہ مجبوروں اور گرفتاریوں کا مسئلہ بھی ہماری تھا۔ چنانچہ وہ دو آدمی اس کو شہر بند کیا
غالب کے محل میں آیا اور بیکر محمد خاں کو بین کی موجودگی سے غالب اور دوسرے کو گرفتار کیا
تھا۔ دوسرے ساتھ تو میروں سمیت اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں دو غالب زید مرست رہے ہیں
آبرو و ملک کی آبرو کا بھی خیال نہ تھا کیا۔ جب محمد خاں اور بندہ وہاں سے معززین کو تو تین سزا
بعد واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ وہ اپنے آدمی ایک خدمت کے بعد رہے۔ لیکن نصف
زیادہ لوگ وہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ان کو اپنے میں غالب کی جگہ پر لایا
کا دروازہ تھا۔ شہر کے درمیان معززین کے محل پر غالب کے پاس لایا وہی تھا۔ اور عام شہر
میں نے ان کو کوش کے خلاف مخبری کی تھی۔ میں نے یہ سب ان کو کوش کی بیگناہی کے آگے
اور میرا میری حالت تعلقات کی وجہ سے جو چھان کا تھا۔ وہ انہوں نے جگہ پر لایا
کے لئے صرف کیا۔ چنانچہ یہاں سزا میں باقی کو کوش کے بعد محمد خاں کی بیگناہی

نفسی۔ جبکہ متعلق حالی نے اپنے شاہکار مرثیہ محمود خاں میں لکھا ہے :-
 وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں اک محشر بیسا نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑا
 اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا
 موجزن تھا جبکہ دریائے عتاب ذوالجلال
 باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا دہال
 دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار
 یار سے یار آشنا تھے شرمسار شہر میں تھی چار سو گریا قیامت آشکار
 آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
 جل نہ جائیں اسکے شعلے سے کہیں سب خشک تر
 مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا غدر خواہ
 مجرموں کے جرم پر دیوار و درختے سب گواہ پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جرتے بیگناہ
 ایسے نازک وقت میں مردانگی اُسے جو کی
 اہل انصاف اُس کو بھولے بیٹ بھول گئے کبھی
 بالیقین جن ملذموں کو اُسے سمجھا بے خطا مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
 چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک لہا جو کہ تھے ناوار کی اُن کی اعانت بر ملا
 زردیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
 بے ٹھکانوں کو ٹھکانے بے گھروں کو گھر دیا

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگوششت لکھی ہے۔ نواب ضیاء الدین
 اور نواب امین الدین جس ہفتے شہر فتح ہوا تھا۔ اسی ہفتے اہل وعیال اور چند آدمیوں کیساتھ اپنی
 جاگیر لوہارو جانے کیلئے روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی مہرولی ہی تھے۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے آگھیرا۔ اور
 بدن پر جو کپڑے تھے اُنکے سوا سب کچھ لیگئے۔ دہلی میں جو اُنکے گھر پر گزری۔ وہ اس سے بڑھ کر نفی۔

غالب نامہ

ایجا درخانہ وکاشانہ و کاخ و کلون ہر جہ بود بتاراج رفت۔ نہ از سیمینہ و نہ دینہ نام و نشان ماند
 نہ از گستر دنی و پوشیدنی باندازہ تار مویں در میاں ماند۔ مظفر الدین حیدر خاں اردو انقلابی
 حیدر خاں (حیدر مرزا) پر جو گزری وہ اس سے بھی دردناک تھی۔ وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح
 اپنے شاندار اور پر شکوہ مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگ چلے گئے تھے جس طرح شہر میں اردو گھروں نے
 گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑ دی گئی۔ لیکن اردووں کے ہاں مکان تو سلامت رہے یہاں
 کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی چنانچہ گڑھی اور پتھر اور در و دیوار
 سب جل کر راکھ ہو گئے۔ نواب ضیاء الدین اور حسین زکریا جیسے پیش آئیں بہت حد تک بچیں
 لیکن ایک قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان کی سابی کی وجہ سے مرزا کا کلام ضائع ہو گیا۔ جوان
 کے ہاں جمع ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا غدر کے بعد ایک اردو خط میں لکھتے ہیں۔ جانی ضیاء الدین خاں تم
 اور نافر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر دیا کرتے
 تھے۔ سو ان دو گھروں پر جھاڑ دی گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب۔ ہاں ہم کچھ چپے ہیں کہ
 میں مرزا نے اپنے اردو کلام کا ایک نسخہ رام پر جھپٹا تھا۔ وہ تو سلامت رہا۔ اور اس کی نقل
 ۱۹۹۱ء میں موجودہ اردو دیوان تیار ہوا۔ لیکن غلامیہ سہ اور مرزا نے اس کی نقل بھیجے کے
 تین سال بعد تک کوئی اردو اشعار نگار اس سے قیاس نہ کرتا۔ اسی طرح کئی فارسی خط و
 ادب شاعر بھی ضائع ہوئے ہوئے۔ مرزا ایک اردو خط میں لکھتے ہیں۔ اپنی آہنگ نامی
 ہے۔ اور اس کے مکمل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

مندرجہ بالا واقعات تو تمام تر دستجات اخذ ہیں۔ لیکن مرزا نے اردو واقعات
 میں اپنے باقی دستوں پر اس پر آشوب زمانے میں جو کچھ غرضی ہنگامے تھے ان سے کچھ
 جو کہ مرزا کے بعض دوست ایوان ادب کے شاندار دستوں تھے۔ ہم ان کے حالات مرزا کے خط
 سے انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں۔
 نواب مسطوفی خاص تحیفہ کہندہ کے بعد سات سال قید کا ٹکڑا ہوا تھا۔ وہ ایک سوزناک گوارا

اور اردو فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اور اردو شعرا کا جو تذکرہ فارسی زبان میں انہوں نے نگلشن خیار کے نام سے لکھا تھا۔ اسکے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے ذرا انہوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے۔ آب حیات کی شہرت عامہ اسے حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں۔ اور جب اس تذکرہ میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی۔ جس کا گارن و تاسی بہت مداح تھا۔ دیکھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حالی کیوں کہتا تھا۔ کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے۔ اور میری شہرہ کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیض صحبت کا نتیجہ۔ مرزا نواب کی نثر اور شاعری اور مذاق شعر کے مداح تھے۔ اسکے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کی تھیں۔ وہ بھی بھولی نہ ہونگیں۔ چنانچہ ان کی مصیبت دل پر ایک گہرا دھم تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں مصطفیٰ خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے۔ ورنہ جس بہت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں لچکناچہ جب نواب کی اپیل کا میاب ہوئی۔ اور وہ رہا ہو گئے تو مرزا اس بے دست و پائی کے باوجود "بجز استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" میرٹھ گئے۔ انہیں ملے۔ اور چار دن قیام کے بعد واپس آ گئے۔

مولانا مفتی صدر الدین آزرہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ صدر سے پہلے وہلی میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اسکے باوجود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا آگست ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "حضرت جناب مولوی صدر دین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ دو بکریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جال بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جاہداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنا نشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے آزرہ ترحم نصف جاہداد و گزشت کی۔ اب نصف جاہداد پر قابض ہیں" افسوس ترین انجام مولوی فضل حق خیر آبادی کا ہوا۔ جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت

ہتے تھے۔ لیکن مرزا کا لاکھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزا اور لا تھا۔ مالی حالت اُن کی تسلی بخش نہ تھی۔
 چونکہ مستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ دستبند کا جسے انہوں نے یکم اگست سن اٹھاون
 ختم کیا، آخری حصہ نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بیگا
 نہ ملی تو قصہ ہی پاک ہے۔ کہن پنشن اگر بدست آبد۔ نیز رنگ از آئینہ نمی زواید و اگر فراچنگ
 مدبر آگینہ جز سنگ نیابد۔

اِشتم

دستبرد میں اخیر جولائی ۱۸۵۷ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن چونکہ ڈاک کا مسئلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور مرزا کے اندر کے صدمے ردِ خطوط قریباً تری ماہ پہلے ہیں۔ غالب کے حالات فراہم کرنے میں بہت وقت نہیں بڑھتا۔ سو اتنی نقطہ آخرت یہ خطوط پیش کارآمد ہیں۔ لیکن مرزا کے خطوط کے متعلق یہ خیال ضروری ہے کہ وہ سب خطوط ہیں جو اب تکچھتے وقت مرزا کو ان کی اشاعت کا خیال نہیں تھا۔ اگرچہ بہت سے خطوط مرزا نے ان کی نسبت یہ خیال صحیح نہ تھا۔ لیکن بعد کے خطوط کے متعلق نہیں۔ چنانچہ جب منشی شہر علی انہیں ادور قعات چھوڑنے کیلئے کہا تو انہوں نے کہا کہ مرزا بہت سے خطوط کے ایک خط میں انہیں مخالفت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ کے قعات میں جو آپ بچھا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زادِ اہلانہ کوئی رقم ایسا ہو گا جو میں نے خود لکھا کہ وہ ان کا لکھا ہو گا۔ وہ صرف تحریر پر ہی ان کی شہرت میری تنویدی کے شکوکے منافی ہے۔ ان خطوط میں انہوں نے منشی ہر گز ان سے بھی کسی بد قعات کے بچا پے جانے میں کامیابی نہیں۔ نہ کوئی کی کسی خطہ کو رد کیا

اس میں خوشی ہے۔ تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو رقعات انہوں نے لکھے ہونگے وہ ان کی اشاعت سے غافل نہیں ہونگے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو واضح فرق ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بعد کے رقعات انہوں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے۔

غالب کے رقعات خواہ کن حالات کے ماتحت لکھے گئے ہوں۔ اُنکی اہمیت بہت ہے تاریخی نقطہ نظر سے غدر کے بعد دہلی میں جو سناٹا ہوا تھا۔ اُسکی صحیح اور موثر داستان انہی خطوط میں ملتی ہے بکتوبہ یسی میں بھی ان خطوط نے ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا۔ کہ اگر اس طرح کے خطوط لوگوں کی نظر کے سامنے نہ آتے تو اردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی کی ہے وہاں اردو خطوط بھی رقعات بیدل اور انشائے مادھورام کی طرز پر لکھے جاتے۔ علاوہ ازیں اردو نثر کی تاریخ میں ان رقعات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بیشک اس سے پہلے کلکتہ کالج میں کسی ایک کتب مقفیٰ اور مسیح عبارت سے عاری شایع ہو چکی تھیں۔ لیکن اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعہ دہلی سے وابستہ تھا۔ یہاں بھی دہلی کالج کے سلسلے میں صاف اردو میں چند کتب شایع ہوئی تھیں۔ لیکن وہ محض ترجمے تھے۔ اور ادبی نقطہ نظر سے بے وقعت یہاں جو رنگ مقبول تھا۔ اس کا نمونہ مولوی غلام امام شہید کے مضامین میں یا آثار الصنادید کے باب چہارم میں ملتا ہے۔ بیشک اس طرز تحریر کو اختیار کرتے وقت عبارت آرائی اور قوافی اور شبیہوں کی تلاش میں انشا پرداز کو بہت محنت کرنی پڑتی۔ لیکن نتیجہ فقط یہی کہ اصل مطلب تو بر تو پر دے پڑ جاتے۔ غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرز بیان سے وہ گلکاریاں کیں۔ کہ اردو کے معنی خواص و عوام کو پسند آئی۔ اور اردو نثر کیلئے ایک ایسی طرز تحریر قائم ہو گئی جس کی پیروی باقیوں کے لئے لازم تھی۔

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے رقعات کا نہایت نفیس انتخاب کر کے ان پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اسکے علاوہ دو مستقل کتابیں غالب کے خطوط کے متعلق شایع ہو چکی ہیں۔ اسلئے اس جگہ

اُن پر کوئی تبصرہ کرنا تفصیل حاصل سے زیادہ مفید کاالبتہ اُنکے اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لئے جس قدر انتخاب ضروری ہے۔ ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

غالب کو جب جان کی سلامتی کا یقین ہوا تو انہیں پیشین گوئی کی نظر ہوئی۔ پینا لپہ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالی شان کی تعریف میں قصائد لکھ کر دہلی کی محفلت میں سنائے۔ لیکن ۱۷ مارچ ۱۸۵۷ء کو کٹھن دہلی نے یہ لکھ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے سادہ لوحی و مدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ بیٹھے بعد التوجہ میں مشتعل ہو گئے۔ تو دہلی کے چند جدید قیادت محنت سے مجلد کردار کے در ولایت اور چار ہندوستان میں یکساں دہلی کی تحریک میں مدد فرماتے۔ کتاب حکام کی نظریں مقبول ہوئی۔ چنانچہ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم برطانیہ نے بہت تعریف بھی۔ ڈائریکٹر فنانشل کٹھن نے خود لکھ کر کٹھن دہلی کی معرفت یہ کتاب اُن سے منگائی۔ لیکن اس قدر دانی نہ ہوا جو در حکام کا دل مرزا سے صاف نہیں ہوا۔ اور جب بنوری مشتعل میں یہ خبر میں براہ دہلی اور سب درباری و دہلی بلائے گئے تو مرزا کو دہلی جانے کی اجازت نہ دی۔ جب کو مرزا کو کپ میرٹھ سے دہلی آیا اور مرزا نے چیف سیکرٹری کے خیمہ میں سواتات ایسے پناہ گاہ بھجوا دی۔ دہلی سے جواب ملا کہ ایام غریب میں تم باخبروں سے انصاف رکھنے کے لئے جب کو مرٹھ سے بھرنا چاہتے ہو۔ چنانچہ مرزا نے لاہور ڈائریکٹر کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا اسے

ترجمہ نو و اگر آج بہ ہر سہ کار آمد

ہر روز و مشتعل و مشتعل و مشتعل

دو جگہ سے اس حکمت و اس پیادہ کہ اب یہ چیزیں صحت سے پاس نہ بھیجی کر دو۔
مرزا کی پیشین گوئی کے متعلق شریوں مشتعل یہ مرزا نے یہ تحقیقات ہوئی تھی۔ اور انہوں نے

سلطنت سلطنت کے مرزا کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ میں ہوں۔ وہ مشتعل ہونے لگے۔ انہیں ہر سہ کار آمد
نابالغ تھا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ مرزا کے دہلی میں یہ سہ کار آمد مشتعل ہونے لگے۔ انہیں ہر سہ کار آمد
کے اخبارات کتاب میں بھی لکھا کہ مرزا کے دہلی میں یہ سہ کار آمد مشتعل ہونے لگے۔ انہیں ہر سہ کار آمد

بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب چرا نہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ نیشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے مہاراجگان اور ویشیا کی تعریف میں قصائد لکھے اور مدد چاہی۔ لیکن جب ادھر سے کچھ نہ مل سکا تو انہوں نے رام پور کا رخ کیا۔ نواب ۱۸۵۵ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ غدر کے بعد مرزا کی حالت بہت خراب ہوئی، تو انہوں نے نواب کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل

داغ کہ تو دریائی ومن سبز و ساحل

اس پر نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ مالانہ اُن کی مدد کیلئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مقرر ہو گیا تھا۔ اب جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکام انگریزی کی طرف سے مندرجہ بالا جواب ملا۔ تو وہ رام پور گئے۔ وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معاف تو تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات علاوہ ازیں نواب نے وعدہ کیا کہ اگر مرزا رام پور رہیں۔ تو دو سو روپے پائیں اور اگر دہلی رہیں تو سو۔ لیکن مرزا عارف کے دو بچوں کو ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں وہ گھبرا گئے۔ اس لئے مرزا ڈیڑھ دو مہینہ رام پور رہنے کے بعد آخر پانچ کو دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کو خیال تھا کہ نواب کی وساطت سے حکام سے صفائی ہو جائیگی۔ لیکن اگرچہ اسمیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ نواب کا مرزا سے جو نیم مریانہ تعلق تھا۔ وہ اور مستحکم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ مرزا کا دربار خلعت موقوف ہو گیا تھا۔ اور نیشن کے بارے میں بھی حاکم دہلی نے ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ حکام بالا کمپٹ سے اُنکی نیشن کے اجرا کا حکم ہو گیا۔ اور مرزا جب دہلی واپس پہنچے۔ تو انہیں نیشن کی جو پائی پائی باقی تھی۔ سب ملی۔ چنانچہ ۶ مئی ۱۸۶۰ء کو جڑا انہوں نے

لے۔ پتہ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کس شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ سرسید نے نیشن کی بحالی کے لئے بہت کوشش کی۔ (الہلال جلد ۴۔ نمبر ۲ صفحہ ۸۰)

منشی ہر کو پال تفتہ کو لکھا ہے۔ اس میں تین برس کا ذریعہ جمعہ دو ہزار دو سو پچاس روپیہ پائے اور اس کے
 اور ان کے قرضہ میں خرچ ہو جانے کی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پیشین گوئی تھی۔ اس لئے وہ اب بانا اور
 منشی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات تھے۔ ان کے
 دربار اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے۔ بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا۔ ہمیں کہیں
 خوش قسمتی سے مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت خود بخود ہی رفع کر دی۔ چنانچہ مرزا خان بہادر
 منشی غلام غوث بیخبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: دو شعبہ دوم فارسی کو سو ادب شہر تغیر خاتم کوئی
 ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی انوار حسین خاں بیاد کے پاس گیا۔ شانے کے طور پر
 فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال رہے۔ سوچو! انہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر
 حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے واپس آکر تمہارے علاقہ کے سب کا نڈا کر دیا
 فارسی دیکھے ہیں۔ اور باجلاس کرنل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور
 بحال رہے۔ چنانچہ رابرٹ فنگری منشی گورنر جناب نے جن کی تعریف میں مرزا نے
 فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو جاکر ان میں خلعت عطا کیا۔
 یکم نومبر ۱۸۶۵ء کو حکومت نے اعلان معافی کر دیا تھا۔ اور ہندوستان کی عمان حکومت
 کہیں کے علاقہ سے بھل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا مشہرہ قصیدہ دست
 در دست گارانتو از دستہ ریافت
 خود روزگار تہ نچہ دریں دیگور یافت

جس کی نسبت عالی کا خیال ہے کہ اعلان معافی کی تقریب پر لکھا گیا۔ اس سے پتہ چلے کہ اس
 معافی یکم نومبر ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ اور یہ قصیدہ اس سے پہلے تمبر ۱۸۶۵ء میں دستہ کے ساتھ
 بھی چکا تھا۔ جب مرزا اس اعلان سے تعجب ہوئے تھے۔ اس قصیدہ کے منشی شاعر قصیدہ اور نڈا
 ہیں۔ لیکن غالب یہ فتح دہلی کی مبارک دہے۔ تاکہ اعلان معافی کا شکر ہے۔
 اعلان معافی یکم نومبر ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ اور اس سے ہندوستان کی عمان میں ایک ہے

کا آغاز ہوا لیکن اگرچہ سوائے ان لوگوں کے جن کے خلاف خاص ثبوت تھے عوام کی جاں بخشی حکم ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھرا ہوا تھا۔ اُسے بندھتے بہت دیر لگی۔ ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء میں ہی ہو گیا تھا۔ بعد میں کچھ مسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کیلئے ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔ تھریڈی ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہوا۔ چنانچہ مرزا ۹۔ نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ٹاون ڈیوٹی (Town Duty) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ ام خزانچی چھٹاں علی، ہمیش واس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور مانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُچلے کے سوا کوئی جنس اسی نہیں ہے۔ کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا ارادہا ہے۔ آگے حکم تھا کہ مکان رہیں۔ کرایہ دار نہ بنیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا ہے۔ کہ کرایہ دار بھی ہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم باہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کر لے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آ رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔" لیکن اسی سال دسمبر میں جب گورنر جنرل نے میرٹھ میں دیر بار کیا۔ تو مسلمانوں کی املاک کے واکزشت کا حکم عام ہو گیا۔ جن کو کرایہ پر ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہو گیا۔ علاوہ ازیں مرزا ۱۲ دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "اتنا سموع ہوا ہے۔ کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے۔ کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اُس کا معاوضہ وہ یک سرکار سے ہو گا۔" دہلی کو چونکہ پنجاب کے حکام نے فتح کیا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے اُفتخوں میں تھا۔ اور نئے انتظامات نئے ماتحت دہلی صوبہ پنجاب کا حصہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اکثر اڈالیان دہلی اس انتظام سے خوش نہیں تھے۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں: "زہرا کبھی یہ گمان نہ کیجے گا۔ کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاو شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں تے وہ ویسا ہی کرے۔" یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے: "سفو حافظ مٹو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رائی پاچکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا

ہے۔ صرف حکم کی دیر پر سوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون، عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ محمد کون، عرض کیا کہ میں۔ اہل نام میرا محمد بخش ہے تو کون مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم حافظ محمد بھی تم۔ سارا جہاں میں تم بزرگ ہیں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخل دفتر ہوئی۔ سیاں کو اپنے گھر پیشے آئے۔ میر محمدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے۔ انہیں اندر کے بعد دہلی کا جو نقشہ برداشتہ اسکی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں۔ پیرسوں میں سوار ہو کر کنواں کا حال دریافت کرنے لیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک جلا سب لکھ یک معروضی و قیاسی۔ یہاں کے ذی جہوڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں۔ تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یا دار و دروازہ کے باغیچے کی جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ دروازہ بند ہو گیا۔ تفصیل کے گنگوڑے لکھتے رہت ہیں۔ باقی سب لکھ گیا۔ شمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب اپنی سڑک کے واسطے عکسہ دروازہ سے دہلی دروازہ بند ہو گیا۔ پنجابی کنڑہ۔ دھولہ دروازہ۔ راجی پنج۔ سعادت خان کا گھر و محلہ میں کی بنی ہوئی ہو گیا۔ گرد ام دالے کے مکانات میں حب نام لکھا باغ حویلی ان میں سے کسی کویتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر ہوا ہو گیا۔ اور اب جو گزیر رہا ہے۔ درباری کو رسوا کر دیا ہو گیا۔ تو وہ صوائے کر بلا ہو جائیگا۔ وندہ اندوکی دالے ایک پھاں کی نہاں کو پھگتے ہیں۔ وہ اسلئے اعتقاد بندہ خدا۔ اردو بازار نہ رہا۔ اردو مہاں کی کہیں۔ وہ اسلئے اب نہیں ہے۔ کچھ چھاؤنی ہے۔ نہ قند نہ شہر نہ بازار نہ کویتہ ایک اور خط میں لکھا ہے۔ جہاں کی یہ پوچھتے ہوئے لکھوں۔ دلی کی ہستی مختصر میں لکھوں۔ یہ سب۔ قند چہ دلی پیرا۔ ہر روز جمع ہاں ہو گا۔ ہر جہاں کے ہیں گی۔ ہر مہاں میں چوں رانوں کویتہ یہ پوچھتے ہیں۔ اب نہیں۔ چہرہ کو دلی مہاں تو وہ اخیر سنہ میں لکھا کہ۔ جامع مسجد کے گرد دیتے کے مشہور سنہ دیتے ہاں رہتے۔ ہاں تک و اجزا شست نہیں ہوئی۔ چنانچہ دلی کے پانچ سال ہوا۔ ۱۱۹۰ھ میں مشہور گردا

میں لکھتے ہیں: جو یائے حال دہلی والو سلام لو۔ مسجد جامع واگر اشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی ط
سیرٹھیدوں پر کبابیوں نے ڈکانیں بنالیں۔ اندام غنی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی بہتم ٹھہرے
مرزا الہی بخش۔ مولوی صدر الدین۔ تفضل حسین خان۔ تین یہ سات اور۔ نومبرہ اجمادی الاول
سال حال جمعہ کے دن ابوالنظر سراج الدین بہادر شاہ قیصر فرنگ و قیصر حسم
رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بانہ

چراغِ سحری

غدر کا ہنگامہ اب فرو ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ وہی جہان تک تبدیل حالات کے ساتھ
 ممکن تھا۔ اپنی بُرائی حالت پر آ رہی تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت درخشاں مہر پہنچے
 تھا۔ رام پور سے باقاعدہ سو روپیہ ماہوار آتے تھے۔ پیشین جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال
 ہو چکے تھے۔ لیکن قاطع برہان کی اشاعت سے انہوں نے جو مخالفت عامہ مول لی۔ اُس نے
 یہ زمانہ اُن کے لئے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اور اعلیٰ مستند میں کبھی ٹکرائی۔ اور اکتوبر ۱۸۹۹ء
 کے بعد شایع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا اثر ثانی سمجھنا چاہئے۔ دستنبو کی تحریریں
 مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کی اصل اور معانی پر پورا
 غور کرنیکی ضرورت پڑی۔ جس کیلئے انہوں نے مشہور فارسی لغت بُرہان قاطع کا غائر مطالعہ کیا۔
 علاوہ ازیں اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب دسائیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک
 کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انہوں نے دیکھا ہو گا کہ
 بُرہان قاطع میں جو سنی معنی ہیں وہ دسائیر کی عبارت پر نہیں چمکتے۔ چنانچہ جب دستنبو رقم ہوئی

لے۔ جو بُرہان نمونہ کے زیرِ حاکم تھی، ان کے حاشیہ پر بُرہان کے ہر جگہ مصنف اور اعلیٰ مستند کے نام لکھے گئے ہیں۔ اب مرزا میرزا علی علی

اور انہیں برہان کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی۔ تو انہیں کسی بے قاعدگیاں نظر پڑیں۔ انہیں اکٹھا کر کے انہوں نے دس جزو کا ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ تو اب عام نہیں ملتا۔ لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن ”درفش کا دیانی“ کے نام سے شائع کرایا تھا۔ جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ مرزا کی آزاد قوت فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرح مولانا اسماعیل نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو ابھارا تھا۔ مرزا بھی اسے عامہ کے پابند نہیں تھے۔ اور ہر ایک مسئلہ پر آزادانہ تنقید جابز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ درفش کا دیانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ ”مرانیز خردے وردانے داوہ اند۔ فرانز آوروہ (یعنی نیاج) اندیشہ بیگانگاں راچوں پذیرم دانہ نیروئے خرد خدا وادکار چر انگیرم“ وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو یہ نظر تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولانا اسماعیل کی طرح اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہیں جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفسیر کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں ”یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ حق ہے کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے“

لیکن غما ہے کہ جس طرح یہ نقطہ نظر کہ جواگلے کہتے تھے سب درست ہے صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اسکے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فن لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے برہان قاطع پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دیئے جائیں۔ تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ درست ہے۔ اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنف برہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعرا نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لئے تھے۔ انہیں بھی مصنف نے علیحدہ لغت کے طور پر بیچ

کیا تھا۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں: افزودن شمارہ لغات بہر صورت پیش نہاد۔۔۔۔۔ چنانکہ کمال شہل
را اخلاق المعانی لقب است۔ اگر ایں بزرگوار را خلاق الاماضا خوانند چه عجب است؟
ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا۔ اور ان
انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا۔ وہ وجہ اسکی یہ دیتے تھے: معنی فرہنگیں اب موجود ہیں بشہر
وغیر مشہور۔ کچھ کم سورا سارے ہونگے۔ ان سب رسالوں کے ہاتھ بند ہی میں کوئی اہل زبان نہیں
ہے۔ اشعار اساتذہ ایران کو ماضی ظہیر اگر جو لغات ان کی نظر میں دیکھئے۔ بنا بہت متاثر ان لغات
کے معنی لکھ دیئے۔ استنباط معنی کا مدار تیس پر نہ مرزا سمجھتے تھے۔ مگر ایں فرہنگیں یہ وقت میں جو
اہل زبان کہیں۔ صحیح ہے حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جن پر آج بھی اہل الرائے متفق
نہیں۔ اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ آخرا اساتذہ شہر
تو بیشتر اہل زبان ہیں۔ اور اہل زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائینگے۔ انہیں استاد کے کلام پر فک
بٹھا نا بھی ضروری ہو گا۔ اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دینے ہوئے معانی میں
بہت فرق نہیں ہو گا۔

اگرچہ جیسا کہ اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا ہو گا۔ اس مسئلہ میں بحث کی بہت گنجائش ہے۔
قسمتی سے بحث نے نہایت کثیف پیلو اختیار کر لیا تھا۔ اور اسکی وجہ مرزا کی حوزہ تحریر تھی۔ ان کی
یہ کتاب صاف اور موثر زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن حوزہ تحریر بہت شوخ ہے۔ ہندوستانی فرہنگ
نویسوں کی نسبت انہوں نے مرزا لغت کے نام سے الفاظ میں جو فقرات لکھے ہیں۔ وہ تو اس قابل
نہیں کہ انہیں کہیں دہرایا جائے۔ قاصح برطان میں بھی انہوں نے صاحب برطان کی نسبت بہت
نا اعلیٰ الفاظ استعمال کئے تھے۔ مرزا نے ایک فارسی قطعے میں ان الفاظ کی درستی کو تسلیم کیا ہے
لیکن حالی نے مرزا کی مخالفت کی عجیب توجیہ کی ہے۔ کہ مرزا صاحب برطان کی نسبت ایسا لکھنے
تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی کے زبان کے تیسرا یا دتہ ہوتا ہے۔ ایک نہایت کس پر کمال
میں ہیں۔ ان کے لئے کثیف اصولی دلائل ہی سے لکھنے کا کوئی موقع نہیں۔ سو وہ جاتی ہیں۔ مگر کسی پر دلائل

اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں۔ اور لوگوں پر ظاہر کریں۔ کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔“ حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں آخر اگر سرسید رسول کریم کے متعلق الفسٹن کے ناشائستہ الفاظ اپنی کتاب میں نہ درج کرتے یا اپنے عجیب و غریب مذہبی عقائد کا، جن کا آج بھی کوئی قائل نہیں، پر چارہ نہ کرتے۔ تو انکی کیوں اتنی مخالفت ہوتی۔ اسی طرح اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ میرا نے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کیلئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تب بھی غالبؔ الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے۔ وہ کم نہیں ہو جاتا حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے اس سے پہلے جب ان کے کلام پر قلیل کے اصولوں کی وجہ سے اعتراض ہوئے تھے۔ تو وہ اس کا سارا شجرہ نسب ڈھونڈ لائے تھے۔ اور اب جو انہوں نے برطان قاطع کے مصنف سے اختلاف کیا۔ تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام بھی لیا۔ یہ برطان قاطع غالبؔ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں پریس ہوئی نواب میر غلام بابا خاں کی مالی امداد سے شائع ہوا۔ اس امر سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کے مداح اس وقت سارے ہندوستان میں موجود تھے۔ بنگال میں میسور کے شاہی خاندان کے رکن شاہزادہ بشیر الدین۔ اور خان بہادر عبدالغفور شاخ۔ سورت میں نواب میر غلام بابا خاں لودرو میں نواب لودرو کے صاحبزادے مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالبؔ کے شاگرد تھے۔ بڑودہ کے رئیس نواب میرا براہیم علی خاں غزلیں اصلاح کیلئے بھیجتے تھے۔ اور لودرو کے مہاراجا غالبؔ کے مداح تھے۔ الہ آباد میں خان بہادر منشی غلام غوث بیچہ اگرچہ قاطع برطان کی بحث میں مرزا سے متفق نہیں تھے۔ لیکن ان کے کمال شاعری کے معترف تھے۔ اسی طرح پنجاب میں ان کی سب سے بہت مقبول ہوئی۔ اور وہاں ان کے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ حیدر آباد میں

ان کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ اور انہوں نے مرزا لاہ جنگ کی تعریف میں جو نفیس قصیدہ ^{۱۸۶۱ء} میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کا انہیں جواب بھی نہ ملا۔ لیکن اسکے علاوہ تمام ہندوستان میں ان کے تذکرے اور مدح موجود تھے۔ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن برصغیر میں انہیں فکر معیشت سے آزاد دیکھنے کی سعادت و بار بار اسپور کے حصے میں آئی۔ مرزا یوسف علی خاں ناظم سو روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ خاص ضرورت کے وقت (مثلاً قلعہ برمان کی اشاعت کے لئے) جو کچھ ملتا وہ اسپر ستراد۔ ان کی وفات اپریل ^{۱۸۶۲ء} میں ہوئی اور مرزا اب گلاب علی خاں ہاشمی مرزا مرزا نے تہنیت جلوس کا قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا۔ اور جب مرزا نے مسند نشین لاہ میں مرزا امی رام پور بلائے گئے۔ چنانچہ بارہ اکتوبر ^{۱۸۶۲ء} کو وہ مرزا کو دیکھا اور مرزا جیل خانہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اور جشن میں شریک ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے جشن بڑا شاندار تھا۔ مرزا نے جی بڑھ میں ذکر کیا ہے۔ روشنی آتش بازی کی وہ افراط کد سات دن کا سامنا کرے۔ حوائف کا وہ ہجوم تھا کہ وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا پڑے۔ مرزا تو بیباک تین بیٹے رام پور رہے۔ دوسرے مراد آباد راہ میں تھا۔ وہاں پیچکر پیدا ہو گئے۔ اتفاق سے مرزا سید احمد خاں وہاں صدر المعداد تھے۔ انہوں نے چوری طرح تیار دہری اور غنموادی کی بی بی سات دن سے بعد صحت ہوئی۔ تو وہاں پہنچے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انہیں عارضی طور پر آرام آ گیا۔ طبیعت اسکے بعد اکثر مرزا ہی رہی۔ وہ ۱۲ مئی ^{۱۸۶۳ء} کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آگے ناقرآن تھا۔ اب نیہان ہوں۔ رنگے ہوا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا وہ آور دہستہ اس سے تین چار سال پہلے ہی وہ خساد خون کی وجہ سے قریباً ایک سال بیمار رہتے تھے۔ اب ان کی عمر بھی ستر برس کے قریب ہو رہی تھی۔ اور ضعف پیری دن جن غائب کر رہا تھا۔ قبور حضرت مولف سید مرزا احمد فرید آباد اسی زمانے میں ان سے ملنے دلی آئے تھے۔ اور ان سے ملاقات کا حال اپنی کتاب میں یاد کر چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا۔ یا ہمارا سیاہ بونے دار دھیس ہلکا ہوا نیفہ شریف قول کا بدن میں مرزا کی سر کھلا ہوا۔ رنگ سنائی سفید۔ منہ پر رامی دو انگلی کا۔

انہیں بڑی۔ کان بڑے۔ قد لمبا۔ دلائی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرتِ شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا کہ اُنھنے میں وقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نورِ حیات تھا۔ کان کے سماعت میں کچھ نقل آچلا تھا۔ سید فرزند احمد دہلی کئی روز مقیم رہے۔ اس روز میں مرزا اور اسکے درمیان جو ادبی گفتگو ہوئی۔ اُسے بھی انہوں نے درجِ کتاب کیا ہے۔ اور مرزا کے کھانے کی تفصیل لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ اچھی غذا کھاتے تھے۔

مولف جلوہٴ حضور کی مرزا سے ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ شعر و شاعری اس وقت تک ہو چکی تھی۔ انہوں نے آخری فارسی غزل ۱۸۹۶ھ میں نواب امین الدین کے ایسا پر اور آخری اردو غزل نواب کے صاحبزادے مرزا علار الدین کے اصرار پر ۱۸۹۹ھ میں لکھی۔ دو نو غزلوں سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کے قلم میں ابھی بہت جان باقی تھی۔ لیکن بد قسمتی سے غدر کے بعد ان کا بہت سا وقت برطان قاطع کے متعلق مباحثہ میں تلف ہوا۔ مال اردو خطوط کا بیشتر حصہ اس زمانہ کی یادگار ہے۔ اور وہ مرزا کے تاجِ شہرت کے آبدار موتی ہیں۔ مرزا بھی اب ان کی قدر جانتے تھے چنانچہ منشی غلام غوث بیخبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”منشی ممتاز علی کیا کر رہے ہیں رقعے جمع کئے۔ اور چھپوائے نہیں۔ پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی مانگ ہے۔“ عودِ ہندی بقول منشی ہمیش ریشا مرزا کی وفات سے چار مہینے پہلے ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۸ھ کو شایع ہوئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اردو منشی مکمل دیکھنا غالب کو نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ ۶ مارچ ۱۸۹۹ھ کو رقعہ کا یہ مجموعہ مرزا کے دست

حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع میں چھپ کر شایع ہوا۔ اور پندرہ فروری کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کی تیاری میں مرزا نے بھی مدد دی۔ اور اپنے دوستوں سے خطوط اور ان کی نقلیں منگائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے مرزا اس پر نگہ تنقید نہیں ڈال سکے کیونکہ اس میں کئی ایسے خطوط جن کا نظر انداز ہونا ہی بہتر تھا۔ شائع ہو گئے ہیں۔ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ کی تحریک سے شروع ہوا۔ اور میر فتح الدین ہتھم مطبع اور منشی بہاری لال مشتاق نے خطوط جمع کئے۔ دیباچہ میر ہمدی اور خاتمہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ دوسرا مجموعہ

جو عورت ہندی کے نام سے شایع ہوا۔ اور دوسرے مغل سے مختصر ہے۔ اس کے جمع کر کے خیال منشی مرزا کا
ریس میرٹھ کو ہوا۔ اور انہوں نے خواجہ غلام غوث بخاری اور چوہدری عبدالغفور سندھو کی مدد سے غالب کے
اردو خطوط جمع کئے۔ اور قریباً سات آٹھ سال کی محنت کے بعد اسے شائع کیا۔ شایع کر دیا۔ اس
کے اب تک بارہ ہزار نسخے چھپے ہیں۔ غالب کے خطوط کے اب تک کسی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔
چونکہ لاہور میں شیخ مبارک علی نے طبع کرایا ہے۔ وہ بہترین ہے۔ لیکن اب گلشن اصحاب کے پاس
غالب کے غیر مطبوعہ خطوط بتائے جاتے ہیں۔ اور کوئی ایڈیشن بھی مکمل نہیں پہلا سکتا۔

جب سید فرزند احمد سے مرزا کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت مرزا کی عمر قریباً ستہ سال
تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسے بعد صحت تیزی سے بگڑتی شروع ہوئی۔ کیونکہ مرزا کی وفات تقریباً
کی عمر میں ہوئی۔ اور عالی نگہتے ہیں۔ مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا سرفروغ ہوتا تھا۔ اگرچہ
پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ خدا کچھ نہ رہی تھی۔ ان کی اس حالت کو ذکر کئی خطوں میں ہے۔ لیکن
اس کی موثر ترین تصویر خواجہ عزیز ندین مرزا نے مکتوبی نے لکھی ہے۔ جو مکتوبات کشمیری
وقت راستے میں غالب سے ملے تھے۔ وہ لکھتے ہیں "مرزا صاحب کا مکان بچہ تھا۔ ایک کمرہ
بھانک تھا۔ جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چار پائی تھی۔ چھپتی تھی۔ اس
ایک تحیف الجشہ آدمی ہندی۔ رنگ۔ انھی یا سی سال کا ضعیف العمر لڑکا ہوا۔ ایک بلبل
سینے پر رکھے۔ آنکھیں ٹوٹے ہوئے پر مدھرتے تھے۔ یہ مرزا صاحب دہلی میں۔ جو بھائی صاحب
دیوان قاتنی ملاحظہ فرماتے ہیں۔

اس کے سلام کیا لیکن میرے استدر تھے۔ کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کوئی
واپس آئے کہ قصد کیا۔ کہ غالب نے چار پائی کی بیٹی سے ہمارے سے کروٹ ملی۔ اور ہلکی
رکھا۔ بہنے سلام کیا۔ بشکل چار پائی سے ان کے فرق پر بیٹھے ہوئے اپنے پاس بٹھا۔ قلعہ
کاغذ سے رقعہ یاد اور کہا۔ "مکتوبوں سے کبھی قدر توجہت جھوٹے۔ لیکن لاؤں سے اعلیٰ نشان
نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پڑھوں اس کو جواب لکھ کر دوں گا۔" اور کہیں۔ "جس سے راجہ بھائی صاحب

گئے تھے۔ ہر چند انہوں نے تعارف کرانیکے کوشش کی مگر بے سہولتی۔ جب ہم نے نام دیتے لکھا۔ تو کہا "مجھ سے ملنے کیلئے آئے ہو۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ" ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبان مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے۔ پھر اصرار کیا۔ کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سنایا۔

میرے صراحت دارغ اور شک بہتایے کہ من دارم
زینجا کو رشدا و حسرت خواہے کہ من دارم

عجیب لطف اور مرے سے اس مطلع کو دہرایا۔ اور حدت زیادہ تو دلینے لگی۔ پھر آدمی سے کہا "کھانا لاؤ" ہم سمجھے یہ خیال مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کیلئے وہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے۔ اور کچھ سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ پابریکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "آپ کی عنایت اس تکلیف سے یہ تھی۔ کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصرات کی حالت دیکھی۔ کہ آنکھیں کھینچنا نہیں ہیں سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے" اسنے میں کھانا آیا۔ دو پھلے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلے کا یا ایک پرست بیکر دو چار ذالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں۔

مرزا کی اخیر عمر میں کمزوری اور ضعف قوای کی وجہ سے یہ حالت ہوئی تھی۔ تو جانے میرے نہیں کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے۔ لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی شر و ادب سے دلچسپی باقی تھی۔ اور خط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ حالی لکھتے ہیں۔ "مرنے سے چند روز پہلے یہ ہوشی طاری ہوئی تھی

پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کیلئے افادہ ہو جاتا تھا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے جس روز انتقال ہوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کر گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افادہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے تو اُسے حال پوچھا تھا۔ اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہسپتال سے پوچھنا۔ اور شعر یہ ہوا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دوسرا مصرع یہ تھا کہ "خود ہجر مدارا بمن میر تو سلامت" مرثیہ سے پہلے اکثر یہ شعر درج زبان رہتا تھا۔

دام دایمیں بر سر راہ ہے

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۲۸۵ھ کی دوسری (یا فروری ۱۸۶۸ء کی پندرھویں) کو بہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں رتھ لے کر عالم جاوہر والی نے تجبیز تکفین نواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے ہوئی۔ اور حضرت سلطان نظام الدینؒ کی درگاہ میں جہاں شہر شاعر میر خسرو کا مزار بھی ہے۔ اپنے سر نواب احمد بخش معون کے پائین مزار دفن ہوئے۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ

شیر

اگرچہ شاعران تغزل افتادہ نیک جامہ بندہ در بزم سخن مرست
وے پایادہ بعضے در یفاں خزانہ شیر ساقی نیلہ پر مرست
مشرک نہ در شاعر ایم توں
دراے شاعری چرینہ در مرست

تبصرہ

Stamper

غالب کے تذکرہ نویس | ہم یہ تو ذکر کر چکے ہیں کہ شعرا کے تذکروں میں غالب کو اس وقت سے جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ جب ابھی وہ آگرہ پھوڑ کر دہلی نہیں آئے تھے۔ لیکن ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو ان میں اتنے شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا۔ کہ کسی ایک کے متعلق تفصیلی حالات کی گنجائش نہ رہتی۔ دوسرے ترتیب بجدوار ہوتی تھی۔ اس لئے بیان میں تاریخی تسلسل نہ رہتا۔ جب آزاؤ نے ان نقائص کو محسوس کر کے اردو شاعری کی نئی طرز سے تاریخ لکھی۔ تو اس نے غالب کو بھی اپنی کتاب میں باعزت جگہ دی۔ اور یاد گار غالب سے پہلے غالب کا مفصل ترین تذکرہ آپس حیات میں ہی تھا۔ لیکن آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ اور اردو کے بہترین انشا پرداز، جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آتا۔ وہ دلائل کی کمی اپنی انشا پردازی سے پوری کر دیتے۔ چنانچہ غالب کے حالات سے غالب کے مداح مطمئن نہ ہوئے۔ اور سن ۱۹۰۳ء میں حالی نے اپنی مشہور کتاب یاد گار غالب لکھی۔

حالی بچھوری لطیف

اس وقت سے غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا سلسلہ ایک
برابر جاری ہے۔ بیشتر کتابیں اردو دیوان کی شرحیں ہیں جنہیں
عملاً مرزا کے حالات درج ہیں۔ اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ حقیقتاً غالب کے
متعلق مستقل کتابیں تین ہیں۔ یادگار غالب۔ محاسن کلام غالب۔ اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب
جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے۔ ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں پڑھا۔ اور اگرچہ ڈاکٹر
کی کتاب میں اخذ حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنا ہی وقت
ابھی تک کسی نے گوارہ نہیں کیا۔ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی غالب کی اردو شاعری اور ان کی شاعری
پر کوئی تبصرہ یادگار سے پیشتر آج تک شائع نہیں ہوا۔ اب اس کے بعد وہ تمام کے بہت کچھ لکھی ہو چکی
ہے۔ یادگار کے بعد دوسری کتاب ڈاکٹر بچھوری کا مقدمہ تھا۔ جس میں اس نے ڈاکٹر عبدالحمید کوئی
اس میں کئی فقرے ایسے لکھ رکھے ہیں جو حقیقت سے زیادہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں
اور انہوں نے کئی اشعار کو بھی ایسے معنی پہنچائے ہیں جو شاعر کے خیال میں نہیں ہو سکتے تھے۔
ان کا مقدمہ اردو ادب کی ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ ایک تو طرزِ تحریر اور زوہد عبارات
کے نقطہ نظر سے۔ اور دوسرے کلام غالب کے نئی مہر و نیاں۔ اور انہوں نے کیا ہے۔
وسیع مطالعہ اور گہرے غور و خوض پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی تصانیف کو میں نے کبھی غالب
جواب سمجھنا چاہئے۔ ان کی کتاب میں جہاں سند و کتاب کی بات تو ملتی ہے۔ اور کلام غالب
کا مطالعہ جن نثری اصولوں سے انہوں نے کیا ہے۔ وہ شاید ان کی کتابت پر مبنی ہے۔
زیادہ سوزوں میں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب پر بڑا کام
کیا ہے۔ ایک تو غالب کے متعلق نثر و تنقید دونوں کا یہ سب سے پہلا کتاب تھا۔ اسے انہوں نے
دوسرے غالب اور کلام غالب کے متعلق بھی لکھا ہے۔ یہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ یہ ہے انہوں نے
توجہ دلائی۔ لیکن شاید نظریاتی مہر اور معنی پر تنقید کے یہ کتاب بھی اس امر سے متعلق ہوگا
(تنقیدی نقطہ نظر سے بھی) غالب کے متعلق یہ کتاب سب سے پہلی ہوئی ہے۔

قریباً نابلد تھا۔ یعنی حالی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگار غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور ترجمہ ایسا نہیں شائع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔ اور پھر یادگار کے مطالعہ سے اس کی طرف رائے قائم ہونیکا کوئی احتمال نہیں۔ جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قائم کی جاسکتی ہے۔

کلام غالب کی خصوصیت | حالی نے مرزا سکندر و کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی تھیں۔ ایک توحیدت مضامین اور طرفہ نگاہ خیالات

کے علاوہ ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں۔ بلکہ اظہار مطالب کیلئے بھی بہت موزوں تھیں۔ دوسرے استعارہ و کنایہ کا استعمال۔ تیسرے شوخی اور ظرافت۔ چوتھے ایسے اشعار کی

بہتات جن کے ایک سے زیادہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے چوتھی خصوصیت جسے ڈاکٹر مجذوری نے بہت سراہا ہے۔ بعض لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اور ہندوستان میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں۔ جن کے لکھنے اور سمجھنے کیلئے ذہن پر زور دینا پڑے۔ چنانچہ سنسکرت میں کئی ایسی نظمیں مشہور ہیں جنہیں دائیں سے بائیں پڑھا جائے تو رام کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اوپر سے نیچے تو لکشمی کی۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ایسے اشعار کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں کو کمال شو کوئی سمجھا جائے تو شاعری جسے دلی جذبات کا اظہار ہونا چاہئے معمول کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

باقی تین خصوصیتیں ایسی ہیں۔ جو بادی النظر میں بھی دیوان غالب کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اور حالی نے مناسب مثالوں سے انہیں بہت واضح کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مجذوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہوں کی مثالیں دی ہیں جو غائب مشابہہ فطرت پر مبنی ہیں۔ لیکن جن ترکیبوں کو انہوں نے مرزا کی الفاظ سازی اور خوش نگاری کا نمونہ بتایا ہے۔ (صفحہ ۴۳) ان کا جزو غالب بھی استعارے ہی ہیں۔ جن سے دو لفظوں میں غالب نے ایک مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔ مثلاً موجِ نگاہ، وادیِ خیال، فردوشِ گوش، دامِ تمنا وغیرہ وغیرہ

حقیقتاً مرزا تشبیہ اور استعارہ کے بادشاہ تھے۔ اور دیکھ کے شاعر ہی کسی شاعر میں لگی اور لکھ
تشبیہوں اور استعاروں کی وہ افراط ہو۔ جو ان کے کلام میں ہے۔
ان کا بہت سا ابتدائی اور کلام صائب کے رنگ میں تھا۔ اور اکثر غزلوں میں ہر نال
تشبیہ ہوتا تھا۔ جو تشبیہوں کی افراط اس زمانے کے اشعار میں تھی۔ وہ بہت کے اشعار میں نہیں
یہ صحیح ہے کہ وہ تشبیہیں نئی تھیں۔ لیکن ان سے کئی ایک اگر غریبی تھا۔ جو ان کی تشبیہوں میں
غراوت سے غالی نہیں تھیں۔ مثلاً یہاں انہوں نے اپنے تئیں عائد کیا ہے۔ ایک چہرہ کا عکس
بتایا ہے۔ یا گل و ستار یار۔ کوسو نیزے پر آئے ہر نہ آئے قریب سب محبت سے فنا کر دی
لیکن بعد کی تشبیہیں سطح شاعرانہ حسن یا موزونیت سے ماورائی ہیں۔ وہ نئی ہیں۔ لیکن اس لئے
جن مضامین کی توضیح کے لئے انہیں استعمال کیا ہے۔ وہ بھی نئے تھے۔ مثلاً

میرا یار بن عشق و ناگزیر لغت بستی عبادت رانی کی آقا سوں اور انیسویں مائیں
شرعاً آویز و حق میوہ مجنوں کم نہ آئے کہول با جموں است اما زبان با زبان
حق وطن میں شان کیا غائب کہ مروت میرے بے حلف ہوں اور محبت غصہ کہ کھن میں نہیں
غم چون ہم در آئنگد و روتہ مر و میدہم و نہ زنیہ و می کند تا و سب و میدہم
تشبیہ اور استعارہ کا استعمال فقط مصنف کی وسعت محبت کیلئے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک کامیاب
شاعر کے آفتاب سے اس کے منہ میں زیادہ و آواز برکت ہے۔ یہ وہ نقطہ ایک شہر شہر ہے۔

بیا آئو بیفتا نیر و نے و سادہ اندازیم

فلک و سق ہر کا نیم و حوت و میر اندازیم

اور ایہ درد فراق میرا لاشے میں نہ خفا میری ایک زبان میں و تر میرا ہے۔

Ah, Love! could you and I with Fate conspire
To grasp this sorry Scheme of Things entire—
Would not we shatter it to pieces—and then
Remould it nearer to the Heart's Desire!

غالب اس انتہائی شاعرانہ بلندی پر تو کبھی نہیں پہنچے۔ لیکن تخیل کی مہاکی جوان اشعار کو ممتاز کرتی ہے۔ ان میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ مثلاً حمد میں کہا ہے:
 اے فلک! جاب قلزم تو
 یا ایک فارسی مصرع ہے:
 خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد
 یا
 از مہر جہاں تاباں مید نظر نیست
 اس تشبہ پر از آتش سوزاں سرم ریزد
 قدیم یونانی درامہ میں ٹریجیڈی کا ہیرو ایک غیر معمولی اوصاف کا آدمی ہوتا تھا۔ جن مشکلوں سے واسطہ پڑتا۔ وہ انسانی بس کی نہ ہوتیں۔ مگر وہ پھر بھی بہت نہ بڑھتا۔ غالب نے اپنی زندگی کے متعلق بھی یہی خیال تشبیہوں کی مدد سے ظاہر کیا۔ اور ان میں سے ایک دو تو اس قدر موندل ہیں کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آ سکتیں۔ مثلاً:-

باد کے کہ دران خضر را عصا خفتست

سینہ می سپرم راہ گر چہ پا خفتست

یعنی زندگی کی ایسی دشوار گزار وادی میں جہاں خضر کی راہنمائی بھی کام نہیں اور جہاں میرے اڈوں چلنے سے عاجز ہیں وہاں میں سینہ کے بل چل رہا ہوں۔
 غالب نے ایک اور جگہ اپنی اس جبارت (اور انسانی بے بسی) کی تصویر نہایت واضح اور پور تشبیہوں کی مدد سے پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں:
 می ستیزم با قضا از دیر باز
 خویش را بر تیغ عریاں میزنم
 لعب با شمشیر و خنجر میکنم
 بوسہ بر سا طور و پیکان میزنم
 غالب نے اپنی ایہ خصوصیت شاعری کی نسبت ایک اردو غزل میں

اشعار کی شرح

اشارہ کیا ہے:-

مقصود ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
 ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
 چلتا نہیں ہے باوہ و ساغر کے بغیر
 بنتی نہیں ہے دشمنہ و خنجر کے بغیر

المطلب یہ ہے کہ ایک شاعر جو الفاظ اور استعارے اپنے اشعار میں استعمال کرے ان کا شعرا نہ مفہوم اُنکے لفظی معنوں سے مختلف اور کہیں وسیع ہوتا ہے۔ اور ان الفاظ اور استعاروں کی قیمت کا غذائی نوزوں کی طرح ان کی ظاہری حیثیت پر موقوف نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی قیمت وہی ہے جو فکر و شعور و خیال میں ان کے لئے قرار دی گئی ہو۔ یہ مرزا کے کلام کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ یہ ایک عام حقیقت ہے کہ شعر کا صحیح حقد انہیں ہاتھوں کا حصہ ہے جو خود ہی وقت متعین سے پیرہ و رہیں۔ اور جو شعر کے معنوی معنوں میں حقد لگائیں رہتے ہیں۔ بلکہ اپنی ان بڑے کی مدد سے اس وجدانی کیفیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ شاعرانہ محسوس کیا۔ اور جسے ان کے الفاظ آخر ایک نامقام ذریعہ ہیں۔ ویران غالب کی ہیئت سی شرمیں بھی شئی میں ہیں اور وہ ان عالم فاضل نوزوں کی کبھی ہوتی ہیں جو انسانیات کے بڑے نام ہیں۔ اور انہوں نے الفاظ خاطر کئی جگہ شہریت کو قربان کر دیا ہے۔ اور یہ نام و رقمی ہے۔ اور ایک شاعر کی قربانی کے بیرون طریقہ وہی ہے۔ جو شاعر اپنے استعارے کی وضاحت اپنے ہونے استعمال کرے۔ تو وہ ان کی کی اکثر شرمیں اس نقطہ نظر سے فی سبیل نقیض ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سچ آہنگ کے میرے ہمتے میں غالب نے اپنے غامضی اشعار کا کیا ہے۔ اداں کا عمل استعمال ہی بتایا ہے۔ ان سے جس پتہ پتہ کے کہ بادی انظر و نظر انکے اشعار سے لئے جاسکتے ہیں۔ انکے علاوہ بھی کئی معانی انکے خیال میں ہوتے تھے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے۔

خوش دست کوثر و پادست بادہ درو در دست

مناں نہیں مقدم و دریں کسک رہیہ حفظ

مالی نے ترا سے فقط زمانہ تباہت۔ میں معبر ہوتا ہوں کہ زمانہ مفہوم نام و رقمی انہوں نے اسکا عمل استعمال کیا ہے۔ انکے کئی اشعار میں اسکا عمل استعمال کیا ہے۔ انکے کئی اشعار میں اسکا عمل استعمال کیا ہے۔ انکے کئی اشعار میں اسکا عمل استعمال کیا ہے۔

اسی طرح ایک فارسی شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :-

آمیختن ببار صافی گلاب را

اسکی نسبت وہ لکھتے ہیں "بشرح ماجرائے خوںے دوست عتاب آمیختہ بناز" یعنی گلاب اور شراب سے ناز اور عتاب مراد لئے ہیں۔ حالی نے بھی کلام غالب کی دوسری خصوصیت کے ضمن میں کئی ایسے اشعار لکھے ہیں جن میں مرزا نے استعارے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ اور اگر ان کے لفظی معنی لئے جائیں تو مطلب خط ہو جاتا ہے۔ یا شعر کا مرتبہ بہت پست۔ مثلاً :-

دام بیوج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہرے تنگ

یعنی اس شعر میں قطرے کو گہرے ہونے تک جن حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کی بحث نہیں۔ بلکہ جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے۔ کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لیکن غالب اور حالی کی اس ترجمانی کے باوجود عام شارحوں نے اپنی شرحوں میں قسط مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی ہے اور شاعر کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تجھ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں اگرچہ لفظی مشکلات دور ہو گئی ہیں۔ شعر کے معنی صاف نہیں ہوئے۔ مثلاً غالب کا مشہور مطلع ہے :-

دوست غمخواری میں میری سچی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھاؤں گے کیا

اس شعر کی شرح فقط یہی کر دی جائے۔ کہ "..... جب تک یہ زخم پھرے گا۔ میرے ناخن بھی بڑھائیں گے۔ اور میں پھر اس زخم کو نوچ ڈالوں گا۔" اور یہ کہہ دیا جائے کہ "ایسے شعر اردو کیلئے مایہ ناز ہیں۔" غالب کو غالب انہیں اشعار نے بنا دیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگرچہ شارح نے شعر کا ضمون سادہ نثر میں لکھ دیا ہے۔ شعر کے معنی واضح نہیں ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی صورتوں میں الفاظ سے گزر کر شاعر کے اصل مطلب کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ تو زیادہ آسانی

ہو۔ مثلاً تشبیہ اور استعارے سے قطع نظر مداف لفظوں میں اس شعر کا مطلب فقط یہی ہے کہ وہ
جباب کی غمخواری سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جتنی دیر میں یہ غم غلط ہوگا۔ طبع اہم خیز کی
دور آفرینی "ایک نیا غم پیدا کر دیگی۔
غالب کا ایک اور شعر ہے :-

ڈرے کیا میرا قاتل کیا دیکھا اس کی گردن پر
وہ خون جو چشم تر سے غم جھریوں و مہم جھریوں سے

جہاں تک مغرب زدہ حضرات کا تعلق ہے۔ وہ تو شعر میں غلطی تو ان کو دیکھ کر ہی نہ پھیریں گے
اور ہمیں اُسے بحث نہیں۔ لیکن یہ ہے کہ غالب کے مداف ہی بڑا حفاظت میں لیں ہوں
نہیں جاتے اور جانتے ہیں کہ شاعری کی ایک استطاعت یہ ہے کہ اس سے عمار کی سن شرف
تباہ نہیں ہو جاتی۔ وہ بھی جب شرمیں لکھتے ہیں تو دشت و تخرات عام بہتیار اور باد و سارون
پٹنے کی چیزیں مراد پتے ہیں۔ مثلاً دیرین غالب کی سب سے معلوم نثر میں مندرجہ بالا شعر کے
معنی یہ دیتے ہیں۔ "میرا قاتل اس سے ڈرتا ہے کہ میں غم کی گردن پر دیکھا۔ غم کی گردن
یہ فنونِ فنون اور عبث ہے۔ کیونکہ میرا خون ایک جگہ رہتا ہی نہیں۔ تو اس کی گردن پر
ظہر لگا۔ غالباً یہ مضمون مصنف نے نیا کہا ہے۔ اب ممکن ہے شاعر نے شوکی نے
عبادت میں نشر کر دی ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کا معنی واضح نہیں رہتا۔ نہ دیکھنا
کہ شاعر کا مطلب ہے کہ عشق کی دہشتہ پھر پھر عیب ہے۔ ان کے سر خدا کے فیصلہ
سے اسے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ طبیعت میں تو کچھ نہایت ہی آئینہ میں ہے
غم و شوق گردنوں، غم و شوق گردنوں

ایک تیر سہرا بھی تو یہ بہت سے سستہ ہوتے
ایک ناسخ شہر بھی علی بنی شہر غم کی ہے
نقد و نمان تشبیہ اس ہر سوس مینی ہے

تو سب دستِ قفا کشتہ ادا کئے تو کیست

اسی طرح غالب کا ایک اردو شعر ہے :-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکان اپنا

اس شعر میں ایک لطیف کنائے سے بتایا ہے کہ ہمارا مکان تو عرش پر ہے۔ اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر اپنا مکان عرش سے بھی اوپر ہوتا۔ تو ہم اپنے موجودہ منظر سے بھی ایک اور بلند منظر بنا سکتے۔ یہ شعر غالب کے بہتر نشتر ہیں سے نہیں۔ اور نہ ہی اس میں کوئی عیسٰی فلسفہ ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ذیل کی تنقید کا بھی مستحق نہیں۔

”اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن جانیکے وسائل حاصل ہو جائیں۔ اور وہاں پہنچ کر سب سے اونچی چوٹی (۹) پر جا بیٹھے۔ تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے۔ کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اسکو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پرچھنے کا موقع حاصل ہوگا کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں بھی عرش کے آستانہ تک بھی رسائی ہوئی؟“

اس شعر میں کوئی دور از کار استعارہ تو نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر فاضل نقاد شاعر کے الفاظ سے گزر کر جس جذبے سے متاثر ہو کر خواہ وہ شاعرانہ تعلق ہی کیوں نہ ہو شاعر نے یہ مضمون نظم کیا ہے۔ خیال میں لاتے۔ تو وہ شعر کو اس اندھکی تنقید کا مستحق نہ سمجھتے۔ اور شاعرے ثبوت نہ مانگتے کہ اُسے عرش پر کب رسائی ہوئی!

یہ صحیح ہے کہ استعارہٴ معنی مراد لینے میں اختلاف کا بہت موقع ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دیوان حافظ کی خوش اعتقادوں نے کیا گت بنائی ہے۔ تو دیوان غالب کی نسبت اس رائے میں کہ ظاہر معنوں کے علاوہ بھی کوئی معنی ڈھونڈے جائیں، بحث کی بڑی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آخر جہزات دیوان حافظ کی شرح لکھتے وقت آنکھیں بند کر کے ”ساتی کی بجائے مرشد اور اور شراب کی بجائے علم معرفت“ لکھ دیتے ہیں۔ ان کی شعر فہمی بھی تو انہیں جہزات کی سی ہے۔

یہ جانے کیلئے لکھی گئیں۔ یا قلعہ شاہی کے مشاعروں میں بڑھنے کیلئے۔ کلام غالب کی اس تدوین سے ہم نے مرزا کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جب اس نقطہ نظر سے ان کے کلام کا غائر مطالعہ ہوگا تو یقین ہے کہ مرزا کی شاعری کا ارتقا زیادہ وضاحت سے لوگوں کی نظر کے سامنے آجائیگا۔ ہمیں بھی جو باتیں اس تدوین کے دوران میں قابل ذکر معلوم ہوئی ہیں۔ ان کا مختص نذر ناظرین ہے۔

ابتدائی دور ابتدائی دور کی نسبت عام طور پر معلوم ہے۔ کہ فارسی الفاظ اور ترکیب ہوتی تھیں۔ اور چونکہ مضامین بھی عجیب غریب اور عام مشاہدہ یا دنیا کے شاعری سے بہت دور تھے اس لئے ان اشعار کا سمجھنا آسان کام نہیں اس کے علاوہ یہ اشعار شاعرانہ حسن سے بھی عاری ہیں۔ ان میں آئندہ کے دور اور تصنع بہت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کی تمام محنت عجیب غریب خیالات اور دور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی تھیں۔ شہادت کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ مرزا کی اہم ترین خصوصیت انسانی فطرت سے واقفیت ہے۔ جو ان کے بعد کے کلام کے ہر صفحے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائی دور میں اس کا وجود قریباً قریباً غائب ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف اشعار بعید از فہم تھے۔ بلکہ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔ "مضامین بیشتر خیالی تھے۔ یہ اشعار کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہیں تھے۔ بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پروا دماغ میں تھا۔ کئی جگہ ان کی بنیاد محض رعایت لفظی پر ہے اور وہ معنوی حسن سے بالکل عاری ہیں مثلاً:-

پاؤں میں جب وہ جتا بانڈھتے ہیں	میرے ہاتھوں کو جدا بانڈھتے ہیں
یا اسد قربان لطفِ جور بیدل	خیر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے
یا اسد شایہ کہ مرگیا ترا خسار دیکھ کر	پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں کتابی اور مروجہ تشبیہوں پر زور دماغ صرف کر کے انہیں سے ایک نیا خیال پیدا کر نیکی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں یہ اشعار حقیقت سے بہت دور رہ گئے ہیں مثلاً

مرزا نے اس تشبیہ کو کسی غیبی حقیقت کی وضاحت
 طرز ادائیگی کی بجائے تو غالباً نہیں استعمال کیا۔ لیکن تشبیہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر
 کے اور نئے پہلوؤں کو لایندہ پہلوؤں کو معقول شر قرار دیا ہے مثلاً

میں کا دل دلف سے بھاگتا ہے
 دست تازہ پہ تھا باز دھتے ہیں
 یہ شعر میں اس تشبیہ کو بطور تشبیہ کے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس کے اتنے دروازے
 در غیر طبعی پہلو پر توجہ کی ہے۔ مگر اس سے نفس معنوں میں اور یہودیوں میں پڑتی ہیں۔ اور کوئی شاعر
 دل بھی پیدا نہیں کرتی ہے

ظاہر میں میری شکل سے افسوس کے نشان
 جوں شانہ پشت دست بہ زلف زید کو
 ناصر علی سرہندی اور غنی کے زمانہ میں تو ان اشعار کو نہایت خیال اور معنوں آفرینی کا
 بڑی بڑھ بھاجا۔ لیکن مرزا سا ظہر قادیانی شاعر کے متعلق ان شعر تھے۔ درود آہستہ آہستہ
 نئے بکرہ خیال قلابان کمال شاعری نہیں۔

یہاں (ان خصوصیات کے علاوہ غور و فکر اور ان کی تہہ و بالا ملاحظہ کیا۔ اس کا بھی اس
 زمانے میں نشان نہیں تھا۔ صرف کے بعد اس کا ایک دور تھا۔ اور وہ بھی بعض کسی چنانچہ یہ ایک دیکھ
 تھی کہ ان کا مشہور اور افسانہ کہ منتحش اور یہ دو سال کی دس سے پانچ لاکھ کا پکا تھا۔ لیکن
 اس وقت مطلع یہ تھا ہے

توڑے بے غم رنگ تو ہوا سے اڑے اڑے
 سب وقت حال دو آئینہ میری سب سے گریں

جب ہمیں غازی شاعر کے مطالعہ سے یہ دور سے اڑتے سے جمیعت پر تصور کا رنگ نکلا
 چڑھا۔ تو انہوں نے مندرجہ بالا مطلع کی جگہ اس شعر کو وضع کیا۔ اور جو
 دور یہ دور دیکھتے ہیں۔ یہ شعر نہیں
 جو کہ اس وقت کے اس دور میں تھا

اس زمانے میں انہوں نے کئی ایک قصیدے منقبت میں لکھے۔ اور بہت سی اردو غزلوں میں بغیر بھی حضرت علی سے اظہار عقیدت کیا ہے۔ لیکن بعد کی غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں مرزا کی اس زمانے کی شاعری کتابی اور دماغی شاعری تھی۔ اور مرزا کی جن خصوصیات پر لوگ سردھنتے ہیں۔ ان کا وجود غنقا تھا۔

یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ مرزا نے یہ طرز شاعری کب ترک کیا۔ لیکن چونکہ نسخہ حمید یہ میں صاف اور اعلیٰ درجہ کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے۔ قیاس ہے کہ ۲۰-۲۲ سال کی عمر تک یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد وہ ابتدائی طرز باطل ترک کر چکے ہوں گے۔ مرزا نے جس طریقے سے اپنا اسلوب شاعری بدلا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ ذیل کے مطلعوں والی غزلیں اور اپنا اردو کا بہترین قصیدہ وہ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے۔

حسن غم کے کی کشاکش سے چھٹا میے بند	بارے آرام سے ہل بل جفا میرے بعد
آہ کو چاہئے اک غم اثر ہونے تک	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
بسا طعجز میں تھا ایک ل کی قطرہ خون بھی	سورمہا ہے باندہ از چکیدن سرنگوں بھی
درد سے میے پہ تجھ کو بغیر اسی ہائے	کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری لئے
نہ ہوئی گھر سے مرنے سے تسلی نہ سہی	امتحان اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی
جب تک وہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہ سخن واکرے کوئی
آئینہ کیوں نہ دول کہ تماشا کہیں جسے	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ بھوپالی نسخہ میں کئی صاف اور بلند پایہ اشعار ایسے ہیں جنہیں میل کارنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور جو دو رثائی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے تو یہ اشعار دوسرے دور کے اشعار کے ساتھ ترتیب دیئے جانے چاہئیں لیکن چونکہ سوائے قیاس آرائی کے ان کی تدوین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم نے خسار جی

شہادت کی بنا پر انہیں نسخہ بھوپال کی باقی غزلوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ویسے یہ ظاہر ہے کہ یہ ۷۵ برس کی عمر تک مرزائے جواشعار لکھے وہ اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب ان کی زبان آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ اور خیالات اور مضامین بھی شگفتہ اور سہل الغنم ہوتے جاتے تھے۔ ان دور ارتقا کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں تبدیل کا رنگ غالب تھا اور کسی نہایت صاف مثلاً رات کے وقت نے پہلے ساتھ رقیب کو لئے آئے وہ یاں خدا کیسے پر نہ خدا کرے کیوں میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی من کے ستر ظریف نے مجھ کو اٹھادیا کیوں

دوسرے دور میں ہم نے وہ شعراء مدح لئے ہیں۔ جو نسخہ بھوپال کے بعد لکھے گئے۔ لیکن ۱۸۴۲ میں دیوان کا جرایذ پیش طبع ہوا۔ اس میں موجود ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب یہ دیوان کلکتہ جانے سے پہلے ہی مرتب کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے حکیم حسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں: ”مسطرے چند کہ بدیہی بختی ویران ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ...“ اور مقالہ ”میسرستم“ قرین قیاس ہے کہ یہ ہی دیباچہ ہو گا۔ جو مرزائے اردو دیوان کے آغاز میں لاکھا میں لکھا۔ اور جس میں دیوان ریختہ کے انتخاب کو تیکہ بھی ذکر ہے۔ اسے علاوہ اس دور کی کئی غزلیں جو نسخہ بھوپال کے حاشیہ پر موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر لطیف کے ۱۸۳۲ سے پہلے لکھی گئیں۔ اور گلشن بخیل میں بھی جو ۱۸۳۲ میں لکھی گئی۔ اس دور کی کئی غزلوں کا انتخاب اور پرانی غزلوں کے کئی تھے موجود ہیں جن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ غالب نے پرانی غزلوں کی اصلاح اور تکمیل ۱۸۳۲ سے اور غالباً کلکتہ جانے سے پہلے ہی کر لی تھی۔ مرزا کلکتہ ۱۸۲۷ میں گئے۔ اور وہیں قریباً ڈیڑھ دو سال رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے اور اشعار بھی لکھے ہیں۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ مرزا اس زمانے میں اشعار بہت کم کہتے تھے۔ جب تک دربار سے تعلقات کی وجہ سے انہیں اردو پر زیادہ توجہ نہ کرنی پڑی وہ فارسی اشعار ہی لکھتے رہے۔ وہ خود ایک فارسی خط میں نائب والی حیدر آباد لکھتے ہیں: ”در آغاز ریختہ تھے وہ اردو زبان غزل سرائے بردے تا پارسی ذوق سخن یافت۔ ازال وادی عنوان اندیشہ بر تانت و دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد و آشراف لکھستہ طاق نسیاں کردہ کمایش

سی سال است کہ اندیشہ پارسی نگال است۔ اس خط اور مرزا کی دوسری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ منتخب دیوان مرتب کرنے کے بعد انہوں نے بہت دیر تک اردو شعر گوئی کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور سوائے چند قطعوں اور غزلوں کے انکے جو اشعار ۱۸۴۲ میں شایع ہوئے وہی تھے جنہیں ۱۸۳۲ یا شاید سفر کلکتہ سے پہلے لکھ چکے تھے۔

نفسیاتی شرف بینی | دوسرے دور میں آئینہ طبیعت کا رنگ صاف ہو گیا ہے۔ فارسی ترکیبیں بہت کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدل اور صائب کی بجائے عرفی اور نظیری کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں اور اظہار خیالات میں خلوص بہت نمایاں ہے۔ لیکن اس دور کی اہم ترین خصوصیت نفسیات انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔ جو دیوان غالب کے صفحے صفحے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم پیشتر غالب کا بیان نقل کر چکے ہیں کہ جب پیش آیا۔ تو عرفی اور نظیری کی تقلید نے اسے اس سرباب سے نکالا جس میں بیدل کی تقلید اسے لگی تھی۔ عرفی اور نظیری کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی تھی جس میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان ہوتی تھیں۔ لیکن معاملہ بندی کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ محبت کی وسیع اور متفاوت دنیا میں سے فارسی شعرا نے چند حالتیں انتخاب کر لی تھیں اور انہیں کو مختلف دلائل و طریقوں سے بیان کر دیا جاتا تھا غالب کے پیش نظر بھی انہی شعرا کے نمونے تھے۔ لیکن اس کی نظر اکبری شعرا سے بہت وسیع تھی۔ اور محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھی۔ مثلاً پرانے شعرا کے نزدیک فقط عاشق ہی نامراد اور مایوس ہوتا تھا۔ اور دوسرے سب کامیاب۔ لیکن میرزا کی نظر اپنی ناکامی اور مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر رک نہ جاتی۔ اور فرط جذبات کے باوجود وہی وہ زندگی کی میج تصویر ہی دیکھتے۔ چنانچہ اسباب میں انکے کئی شعر ہیں۔ جو مشرقی عشق کے رسمی نقطہ نظر سے بہت مختلف ہیں مثلاً

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے لبر کس کا آشنا
تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
ایسے اشعار کئی ہیں۔ لیکن ایک فارسی شعر تو بہت ہی پُر لطف ہے۔۔۔

ماہم بہ لاغ و لاہ تسلی شویم کاش
 ناواں زبزم درست چہ خوشنود
 اس خصوصیت کے علاوہ کہ مرثا کی نظر محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، ایک تو جذبہ بصیرت
 رزاک کی طرف مبینہ ہے۔ یعنی ان کی نظر محبت بلکہ انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے، جن کی طرف
 عام طور پر خیال نہیں جاتا۔ اور ان کے کئی اشعار میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، جو بظاہر غلط یا
 عجیب اور توقعات کے خلاف نظر آتے ہیں، لیکن جب ان پر غور کیا جائے، تو ان کی درستی سمجھ
 میں آتی ہے۔ اور وہ انسانی فطرت اور واقعات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں، غالب نے ۲۲ برس
 کی عمر سے پیشتر ہی دو شعر ایسے لکھے تھے، جو اس خصوصیت کی بہترین مثال ہیں۔ اور جنہیں پڑھ کر ان کی
 ہوتی ہے۔ کہ شاعر کی نگاہ غار اشکاف پر وہ حقیقت کیسے غریباں ہوئی جس پر ہماری سطحی سوجھ بوجھ
 وجہ سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزدہ ہم چندے تکلف سے
 نہ کرتا کاش نالہ جھکو کیا معلوم تھا ہم
 مرزا اگر اپنا بیان محبت تک ہی محدود رکھتے۔ اور اس کی گونا گوں کیفیتوں کو اس وسعت اور باغ و چراغ
 سے بیان کر دیتے۔ تو بھی مشرقی شواہد وہ بے نظیر تھے۔ لیکن مرزا فقط قلم و محبت کے راز و انکساریں
 تھے، بلکہ محبت کے علاوہ انسان کی باقی کیفیتوں سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرا شعر جو ہم نے
 نقل کیا ہے، حقیقتاً فقط محبت سے متعلق نہیں، بلکہ انسان کی عام جذبہ باقی زندگی پر صادق آتا ہے
 چنانچہ اس زمانے میں لوگ پرو فیسہ جس کے اس نظریے سے عام طور پر متفق ہیں، کہ انسانی جذبات
 ان جذبات کے اظہار سے بڑھتے، بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جب شروع شروع میں جس نے یہ نظریہ
 پیش کیا۔ تو سائنسدانوں کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ اور آج بھی عام توقعات کے خلاف معلوم ہوتا
 ہے۔ ہم ملتے ہیں کہ علم نفسیات کے ایک سہ کوہ لائل اور مشاہدوں سے ثابت کرنے میں اور ایک
 شاعر کے اپنے احساسات نظم کر دینے میں بہت فرق ہے۔ لیکن آفریہ ایک امر واقع ہے، کہ مرزا
 نے یہ شعر جس کی کتاب سے بیت پیلے لکھا تھا۔ اور شاعر کی چشم بصیرت اس راز نہایت روز گاہ

”محرم“ ہو گئی تھی جس کیلئے سائنسدان کو ابھی برسوں انتظار کرنا تھا۔ یہی وہ اشتہار تھا جسکی نسبت کہا ہے۔

مشہور منکر کہ در اشعار میں قوم
درائے شاعری چیزے دیگر بہت

غالب کے اس قبیل کے اشعار جنہیں انسانی قلب کی وہ کیفیتیں نظم ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ بہت ہیں۔ ہم ان میں سے چند درج ذیل کرتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن کی دلچسپی جوں جوں ہمارا نفسیات کا علم وسیع ہوتا جائیگا۔ اور بڑھتی جائیگی۔ مثلاً

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سبیل و دروئے دریا آتش است
مست پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تو بے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آنے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے ہیں

لفظی صناعتی
مرزا نے اسی دور میں اردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ مرزا کی شاعری کے مطالعہ کیلئے یہ حکم و اضافہ بہت دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو سادہ بنانے کیلئے کی گئی ہیں اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا۔ انہیں بدل دیئے۔ مثلاً

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں گ میں نہاں ہوا بیگا
پہلے یہ شعریں تھیں۔

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں در رنگ نہاں ہوا بیگا

۱۔ یہاں یہ تبادلہ ضروری ہے کہ مرزا کے رشک کے اشعار جو بعض لوگوں کو بہت پسند ہیں نفسیاتی حقیقت پر مبنی نہیں۔ غالب میں انسانی کیفیت بہت نمایاں تھی۔ اور یہ قدرتی امر تھا۔ کہ وہ رشک کے بہت سے مضامین لکھتے لیکن ان اشعار میں اکثر انہوں نے ایک خیال کو یکسر سبالتہ اور شونی سے اس قدر کام لیا ہے کہ اگرچہ بہت پر لطف ہو گیا ہے مگر نفسیاتی حقیقت دیکر نظر سے پنہاں ہو گئی ہے۔

یا بونے گل نالہ دل دو چرخ محفل
جوتری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعریں تھیں
عشرت ایجاد چہ بونے گل دو چرخ
بعض جگہ چند الفاظ کے بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہو گیا ہے۔

مثلاً ہے میں ذوال آمادہ اجزا آفریش کے نام
پہلے یہ شعر اس طرح تھا۔

ہے مری وحشت عدئے اعتبارت حال
مہر گردوں ہے چرخ رگزار بادیاں

یاد نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی غانہ آرائی
سفیہ دیدہ یعقوب کی بھرتی جو زندان

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا۔ ہے
نہیں بند زینجا بے تکلف ماہ کنگار

شروع میں کئی دفعہ تشبیہیں یا الفاظ کسی مضمون یا لفظ کی رعایت سے لکھے تھے۔ لیکن اس سے مضمون
زیادہ دقیق ہو جاتا۔ غالب نے انتخاب کے وقت اس لفظی رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ اور زبان کو
سہل کرنے کیلئے اسکو بدل دیا ہے۔ مثلاً ان کا ذیل کا شعر مشہور ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شماریلو
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

پہلے حسرت دل کی صفات سے "گنہ" نہیں بلکہ بے گنہی لکھا تھا۔ اور یہ شعریں تھیں۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شماریلو
مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ

یادے ضعف سے ہے نئے قناعت یہ ترک جست
ہیں دیباں تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہسم

پہلے تکیہ گاہ کے خیال سے "گراں خرابی" لکھا تھا۔ لیکن لفظی رعایت قائم رکھنے سے مضمون پیچیدہ ہو جاتا
چنانچہ انہوں نے پہلا مصرع بدل کر مضمون صاف کر دیا۔ نقش اول حسب ذیل تھا۔

ضعف نے باندھا ہے میان گراں غریباں
ہیں دیباں تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہسم

زبان کی اس ترمیم اور الفاظ کے تغیر و تبدل کے علاوہ غالب کے کلام میں کئی جگہ ایک خیال

مختلف صورتوں میں نظم ہوا۔ یعنی نفس مضمون اصولاً تو ایک ہے۔ لیکن خفیف فرق سے مختلف اشعار میں مختلف طریقوں سے ادا ہوا ہے۔ بعض جگہ تو یہ مضامین ایسے ہیں۔ جو خود شاعر کو مرغوب ہیں۔ (مثلاً بہشت کا استنزا۔ انسانی قلب کی فطری غمگینی۔ انسان کی بے بسی۔ رشک۔ مذہب کے معاملہ میں آزاد خیالی وغیرہ) اور چونکہ شاعر کے دل میں ان کا ہجوم رہتا تھا۔ شاعر انہیں بار بار نظم کرنے پر مجبور ہوتا تھا لیکن اسکے علاوہ بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر کو ایک مضمون سوجھا۔ اور اُس نے اُسے نظم کر دیا لیکن شاعر پہلے اظہار سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور وہ خیال اُسے گدگداتا رہا تھے کہ وہ نقشِ ثانی میں بہتر طریقے سے ادا ہوا۔ مثلاً غالب کا شعر ہے۔

سہ پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر
مضمون بہت بلند پایہ نہیں۔ اور اس میں کسی شاعرانہ رفعت کی گنجائش کم ہے۔ لیکن جہانگیر طرزِ ادا کی لطافت اور زبان کی تاثیر اور (ظاہری) بسیا خنکی کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی، نقشِ اول سے بہتر ہے۔
مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ حشی ہے بیٹھنا آکے وہ اس کا تری دیوار کے پاس
یا وہ نگاہیں کیں مٹی جاتی ہیں یارب لکے پار جو مری کوتاہی قسمت سے مڑ گاں ہوئیں
خیالِ نفیس تھا۔ لیکن لفظی رعایت نے شاعر کے مطلب پر خفیف سا پردہ ڈال دیا تھا۔ نقشِ ثانی شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے۔ اور اس میں لطیف بیان نے خیال کو اس طرح چمکادیا ہے کہ اس سے بہتر طریقِ اظہار خیال میں نہیں آ سکتا ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

مندرجہ بالا مثالوں سے اور الفاظ کی اصلاح اور ترمیم سے ایک اور بات بھی روشن ہو جاتی

۱۔ اس شعر کا لطف خالص وجدانی ہے۔ ہمارے ایک دوست پڑھ کر فرمانے لگے کہ دیکھو واقعی نگہ میں نگاہ سے ایک الف کم ہے۔ ان کا فرمانا بجا۔ لیکن شاعروں کی انہی خاصانہ مویشگافیوں سے شاعر کے اصل مطلب پر پردے ڈالے جاتے ہیں۔ اے شعر مابعد رسہ کہ برد۔

ہے کہ خیالات سے قطع نظر غالب کو طرز بیان کا بہت خیال رہتا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے اعلیٰ ہیں۔ اور زبان ذوق کی۔ اور اگر زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے۔ جو ایک جگہ مقبول ہیں تو دوسری جگہ ناپسند یا آج مستعمل ہیں تو کل متروک اور خیال بیشک صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب، اُن کی ہم آہنگی اور اُن کی نشست۔ تو مرزا کا مرتبہ اس بارے میں تمام شعرا سے بلند ہے۔ الفاظ ان کے لئے اظہارِ مطلب ہی وسیلہ نہیں تھے۔ بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کر نیکو ذریعہ۔ اُن کے الفاظ کا استعمال اور ان کی ترتیب اس طرح کی تھی کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر الفاظ کا ترجمہ اور ان کی ہم آہنگی ہی بظاہر مثلاً۔ در بدل کھوں کب تک دل نکود کھلاؤں۔
یا۔ ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیونا سہی
سودا کی غزلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان قصیدہ کی زبان ہے۔ اور فارسی ترکیبوں کا فنل کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیاض میں صفا زیادہ ہے۔ اور یاس و زلف کا اظہار میں وہ زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن آخر محبت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں طرح طرح کے مسائل باقی رہتے ہیں۔ اور انہیں نظم کرنے کیلئے ایک کامیاب شاعر الفاظ اور بحریں بھی مختلف انتخاب کرے گا۔ غالب کی ایک غزل مشہور ہے۔

دست ہوتی ہے یاد کو ہمسماں سے ہوتے

جوشِ قدح سے بزمِ چیدان سے ہوتے

اس میں محبت کی اس حالت کا بیان ہے جب میں تمہارا جواں دل ہی اٹھتا ہے۔ اور عشق و محبت دلوں کی طبیعت کو پھر بے قرار کرتے ہیں۔ یہ تمام غزل فارسی ترکیبوں سے بھری پڑی ہے۔ چونکہ جوشِ دلوں کا بیان ہے۔ وہ ترکیبیں انہماک مضمون کو اور موثر کرتی ہیں۔ اور خیال ہمارا خیال ہے۔ اردو شاعری میں اس نسبت کی اس سے جتنی تصویر اور کہیں نہیں برخلاف اس کے جب مرزا دیوانہ کی درخشاں بیان کرتے۔ تو فارسی ترکیبیں

مثلاً ۱۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت دوا کرے کوئی
— کیا کیا خضر نے نکلنے سے اب کسے نہیں ہمارے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

کیوں کسی کا نگلہ کرے کوئی

یہ ذیل کی غزل بھی جو مندرجہ بالا غزل کی طرح شاعر کے دل محزون کی ایک اور دلآویز تصویر ہے۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے بھوکو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

تیسرا دور | ہم لکھ چکے ہیں۔ تیسرے دور میں مرزا نے اردو اشعار بہت کم لکھے اور چونکہ یہ فارسی شاعری کا زمانہ تھا۔ زبان پر فارسی ترکیبیں بہت چڑھی ہوئی تھیں۔

اس لئے جب کسی موقع پر وہ عثمان شاعری اردو زبان کی طرف موڑتے۔ (مثلاً چکنی دلی کی تعریف میں) تو اردو میں بھی فارسی ترکیبیں دوسرے دور سے زیادہ استعمال ہوئیں۔ ویسے اس زمانے کی ادبی کاوش کا ماحصل ان کا فارسی کلام ہے۔ حالی کے بعد کسی نے اس حصہ کی طرف بہت توجہ نہیں کی۔ اور عجیب بات ہے کہ جب لوگ مرزا کی ذہنیت یا ان کے فلسفہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تو صرف اردو اشعار کو تہ نظر رکھتے ہیں۔ حالانکہ تیس سے پچاس برس کی عمر تک جو انسانی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے۔ مرزا نے

توجہ بیشتر فارسی نظم و نثر کی طرف ہی ملحوظ رکھی۔ اسکے علاوہ چونکہ اردو دیوان میں بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن میں عام طور پر تسلسل خیالات نہیں ہوتا۔ ان سے مرزا کے طبیعتی رجحانات کا اندازہ اس یقین سے نہیں ہو سکتا جس طرح اُنکے فارسی قطعات یا قصائد یا ٹکٹوں سے۔ اور غالب کی دیش بھگتی وغیرہ کے متعلق جو غلط

مثنویاں گیارہ ہیں جن میں سے ابرگہار اور تحفہ دیر بہترین ہیں۔ قصائد کم و بیش ۳۰۰ ہیں پہلے ۱۲ خدا رسول اور ائمہ محترم کی تعریف میں ہیں۔ اسکے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ اور ۱۵ شاہ کے متعلق ہیں۔ انکے بعد ملکہ و کنویریہ کی باری آتی ہے۔ اور تین قصائد ملکہ انگلستان کی تعریف میں ہیں۔ سوائے چار کے باقی قصائد میں انگریزی حکام اور دیسی راجوں نوابوں کی تعریف کی ہے۔ تین قصیدے دوستوں کے متعلق ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین اور مولانا صد الدین کی تعریف میں آخری قصیدہ جو بہت دلچسپ ہے۔ اپنے متعلق ہے۔ اور اس میں انسانی قلب کی اس کیفیت کا بیان ہے۔ جسے انہوں نے ایک اردو شعر میں بھی نظم کیا ہے۔

دل میں یاد یار و ذوق وصل تک باقی نہیں۔

آگ اس گھر میں لگی اسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا کو ان قصائد پر بہت ناز تھا۔ اور اُن کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مرزا نے انہیں کچھ وقت تلاش مضمون اور شعر نویسی میں بہت محنت کی ہوگی۔ اُن کی تشبیہیں بالخصوص پُر لطف ہیں۔ اور ہم ان میں سے چند ایک کا انتخاب دوسرے حصے میں دیں گے۔ لیکن یہ خیال بیکار ہے کہ یہ قصائد اسی طرح مقبول ہوئے جس طرح انکی غزلیں۔ مدحیہ قصائد کا تعلق عام لوگوں سے زیادہ ممدوح کی ذات سے ہوتا ہے۔ اور ان کا معاوضہ قبول عام نہیں۔ بلکہ وہ صلہ ہوتا ہے جو ممدوح کی طرف سے شاعر کو عطا ہوتا ہے۔ ویسے یہ صحیح ہے کہ ہمارے نئے نقاد جو مرزا کی قصیدہ نویسی کو بطور خود ایک ناقابل معافی جرم سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ممکنہ جینی کرتے وقت مرزا کے ماحول اور شرقی شاعری کی تاریخ کو مد نظر نہیں رکھتے۔

چوتھا دور مرزا کا درباری دور ہے۔ اس زمانے میں مرزا نے کئی

چوتھا دور

فارسی قصائد لکھے۔ اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اسی زمانے کی ہے لیکن دربار سے تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے مرزا کو بھی درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا۔ اور اس زمانے کے اکثر اشعار اردو میں ہیں۔ بیشتر غزلیں ہیں جنہیں مرزا نے بادشاہ کو خوش

کرنے کیلئے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کیلئے لکھا۔ لیکن اُنکے علاوہ کسی قصائد اور قطعات بھی
 ہیں۔ جو بادشاہ یا کسی شہزادہ کی تعریف میں ہیں۔ جب مرزا نے دیوان کیلئے پہلی دفعہ مرتب کیا
 تھا۔ تو اسوقت تک کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی زبنت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ نسخہ مزید
 میں کوئی مدحیہ قصیدہ نہیں۔ اسکے بعد قصائد فارسی زبان میں لکھے گئے۔ مبین درباری در
 میں مرزا کو اردو زبان میں بھی کئی مدحیہ قصائد لکھنے پڑے۔ جو اُن سے دیوان میں موجود ہیں۔
 ان قصائد میں سے ایک دو کسی قدر پر لطف ہیں۔ لیکن اُن زمانے کی مصلحت یاد کار الی اور
 غزلیں ہیں۔ اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ یہ دور مرزا کی فنیگی کا زمانہ ہے۔ انہوں نے پہل
 کی پیروی نہیں کی۔ ہر کی عمر میں ترک کر دی تھی۔ لیکن چونکہ سلیقہ اور چھیدہ مضامین سے
 طبیعت کو اُس باقی تھا۔ انہیں ایک شعر میں اور کہتے تھے فارسی ترکیبوں کا استعمال کوڑا
 پڑتا تھا۔ اور دور ثانی کے کئی اشعار میں لطف زبان اور بہت خیال میں ایک طرح کا تعلق
 لیکن مرزا نے لطف زبان کیلئے خیالات کو قربان نہیں کیا۔ ورنہ یہی دور تین اجبت لطف زبان
 قدرت خیال پر غالب آ گیا ہے۔ اور اخیر میں تو خیالات شگفتہ الفاظ اور دلپذیر طرز افہام
 کیلئے محض زنگار آئینہ کا کام دیتے ہیں۔
 مرزا کی شاعری میں اس نیا بان تغیر کی وجہ دربار سے تعلق تھا۔ بادشاہ اور شہزادوں سے
 کی طرف سے مدح تھی۔ جسے خود نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا نے جس شاعر میں دیکھے تھے
 وہ غزلیں مقبول ہوتی ہیں۔ جن کی زبان سے وہ "سب ان سے بہتر نہیں اور غامضی ترکیبیں
 ہر جہت سے آنے میں تک اور ان کی جگہ پر وہ "سب ان سے بہتر نہیں اور غامضی ترکیبیں
 یہی رنگ چڑھ گیا۔ اور اس دور کی کئی غزلیں ہیں جن پر خود نے "رنگ مایہ ہے" لکھا ہے
 غزل کہنے کے متعلق میں بشارت دے رہا ہوں کہ "رنگ مایہ ہے" اور دوسری غزل کہ
 نہیں ہے "دوق زنگہ سکت" اور مضامین سے اور "رنگ مایہ ہے" اور دوسری غزل کہ
 واعظہ تو پر نہ لسی کو یہ سسر

ظرافت

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ارٹنی سی از خبر ہے زبانی طیور کی
لیکن جس خصوصیت نے اس زمانے کے اشعار کو ایک امتیازی رنگ دیا
ہے۔ وہ مرزا کی شوخی اور ظرافت ہے۔ (آپدائی دور میں مرزا کے اکثر اشعار معصوم

تھے۔ شاعرانہ حسن سے ہماری متین اور سنجیدہ۔ لیکن ہم بتا چکے ہیں۔ کہ جوں جوں مرزا نے طبیعت
ازدوسی کو اپنی مضبوط عقل کے قابو میں کر لیا۔ ان کے اشعار میں ایک طرح کی شگفتگی آگئی۔
ایک مغربی اہل فکر کا قول ہے۔ کہ جو آدمی احساسات کا بندہ ہے۔ اس کے لئے زندگی ایک ریجید ڈی
ہے۔ اور سوچنے والے کیلئے کامیڈی (مرزا قوی احساسات اور جذبات کے مالک تھے۔ لیکن
ان کی فہم و دانش اس سے بھی قوی تر تھی۔ اور جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی ہوئی
ان واقعات کیلئے وہ پہلے آنسو بہاتے تھے۔ اب انہیں ہر مسکراہٹ سے یہ بھیج ہے۔ کہ مرزا
شوخی کی اصل بنا انکی جدت طرازی اور ہر بات میں نیا پہلو نکالنے کی عادت تھی۔ لیکن یہ بھی
ماہر ہے۔ کہ جس طریقے سے انہوں نے غم اور رنج کی باتوں میں شگفتگی طبع کو برقرار رکھا۔ وہ
سی آدمی سے ہو سکتا تھا۔ جس نے بقول انکے ”سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار کر دیا ہو۔ اور جو
م اور رنج کی شدت سے اس قدر اندھانہ ہو جاتا ہو۔ کہ سوائے رنج و الم کے اور اسے کچھ نظر نہ
ئے۔

رازدان خوں دہرم کہدہ اند

خندہ بردانا و ناداں میںدم

دنیا کے حوادث میں شاید المناک ترین واقعہ کسی کی موت ہے جس پر دوست کیا دشمن
لا آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن اردوئے معلیٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ مرزا نے تعزیت کے
رقع پر بھی ظریفانہ انداز قائم رکھا۔ اور اظہار رنج اور تلقین کی بجائے خطوں میں جالغز
طیفے ہی لکھے۔ موت کی نسبت مرزا کا یہ انفرادی نقطہ نظر کسی حد تک تو ان کی جدت پسندی
وجہ سے ہو گا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ خاص زاویہ نگاہ اسی چشم بصیرت کا عطیہ تھا۔ جس نے
ان کیلئے ”سختی و سستی اور رنج و آرام سب کو ہموار کر دیا تھا۔ شروع میں جب انہوں نے جذبات

کی باگ عقل کے ہاتھوں میں نہیں دی تھی۔ تو ان کے اشعار میں موت کا بیان اسی طرح تھا جس طرح
 دو سرول کے کلام میں مثلاً "اے لے لے کی روئی میں ان کی شہر منزل پر سے۔ جاہل
 نے کسی کی وفات پر ۲۳ ۲۴ سال کی عمر میں بھی تھی۔ اگرچہ مرثیہ بہت پرورد ہے۔ اسلوب
 بالکل برسی اور عامیانا ہے۔ جب ہم اس کا عارف واسے مرثیہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو
 سے چپیس تیس برس بعد لکھا گیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں شاعر کے نقطہ نظر میں بہت تبدیلی
 تھی۔ بعد کے مرثیہ میں مرزا نے جو ہم علم کی وجہ سے اپنا سکون اور توازن ہار دیا۔ اور باوجود
 موضوع بہت دردناک ہے۔ انہوں نے اپنی شوخ نگاری برقرار رکھی ہے۔ عارف سے خطاب ہے۔ یہ
 تم کرنے ایسے تھے کھرے داد و ستد سے
 کرنا ملک الموت تھا کھانکائی دن اور

پچیس تیس برس کے تفاوت سے غالب نے جو دو مرثیے لکھے۔ ان کی حرز تحریر میں جو نزہت
 وہ ان کی عام شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں مسانت غالب بھی دیکھیں
 خیالات شگفتہ ہوتے تھے۔ اور اگرچہ ان کی طرافت کا بہترین نمونہ ان کے اردو خطوط میں چھپا
 نے خود کے بعد لکھے۔ لیکن جیسا کہ شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ جو کثرت شوخ اور طریقاں
 و باری قدر میں ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

مرزا کی عام شاعری کا میدان وسیع تھا۔ اسی طرح شوخی و طرافت کو بھی انہوں نے چھوڑا
 کچھ مخصوص نہیں رکھا۔ ان کی طرافت بہت پائیزہ اور فحش سے پاک تھی۔ اور ہم نزدیک
 سے آگے کبھی نہ بڑھتی۔ لیکن اس میں روایت کسی کی نہ تھی۔ "اے لے لے اپنے اور ہمیں ہر
 سے غافل ان ماہ ظلمتوں کے واسے چاہتے والا بھی ایسا چاہتے
 چاہتے ہیں خوب مدیوں کو تہ آپ کی سورت تو دلچسپا چاہتے
 غالب و فیض خوار ہو و شاہ کو دہا داؤن تھے کہ کہتے تھے کڑی نہیں کی میں
 ایک دو جگہ تو شوخی حدتہ گزر گئی ہے۔ اور محفل بیت کی طرف تھوڑا آہٹا نظر آتا ہے۔ مثلاً

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی آپ کا شیرہ و انداز و ادب و سہمی
یہ نظریانہ اشعار بیشتر فقط شوخی طبع کا اظہار ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اور جس چھتے ہوئے طریقے
سے انہوں نے بہشت کا تسخر اڑایا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ موضوع دل کو ضرور بھاتا تھا۔
مثلاً میں جو کہتا ہوں کہ ہم حشر میں لینے تم کو کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
یا کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گریا دیا
یا ان پر زادوں لینے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے یہی حوریں اگر داں ہوئیں

غالب کی شاعری کو ہم نے چار دوروں میں تقسیم کیا۔ اور غالب نے
پانچواں دور؟

دور کے اشعار کے اخیر میں بطور تتمہ کے ترتیب دیا ہے۔ بظاہر تو مرزا غدر کے ۱۱-۱۲ سال بعد
زندہ رہے۔ اور ان کے اس زمانے کے اشعار کو ڈاکٹر لطیف نے ایک علیحدہ دور شاعری بھی قرار
دیا ہے۔ لیکن چونکہ اس تمام مدت میں انہوں نے اردو کی دو تین غزلیں، ایک قطعہ، فارسی کی دو
غزلیں، اور چند فارسی قصیدے ہی لکھے ہیں۔ جو ادبی نقطہ نظر سے بھی اسی طرز کے ہیں جس طرز کے
ان کے چوتھے دور کے اشعار۔ ہم نے ان اشعار کو جدا گانہ دور کی تحت میں شائع نہیں کیا۔

غالب کا متداول اردو دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا۔ لیکن یہ

دیوان اسی قلمی نسخے کی نقل ہے جو مرزا نے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا تھا اس
دیوان اور ان اشعار کے علاوہ، جواب حمید یہ ایڈیشن میں شایع ہوئے ہیں۔ غالب کا متفرق کلام
تین چار جگہ شایع ہوا ہے۔ ایک اردو غزل، ایک قطعہ اور ایک غزل کے چند اشعار ان کے رقعات
میں ملتے ہیں۔ اور یقیناً غالب کے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ غالب کا "غیر مطبوعہ" کلام جو مختلف
رسائل وغیرہ میں شایع ہوا۔ اسے غالب کا نتیجہ فکر ماننے سے پہلے ہمارے خیال میں مزید تحقیق کی
ضرورت ہے بالخصوص وہ ۲۵-۲۶ غزلیں جنہیں مولانا عبدالباقی آسمی نے ایک بے سرو پا بیان
کی بنا پر شرح کلام غالب میں شایع کیا ہے۔ یقیناً غالب کی نہیں۔ ان کے علاوہ دو تین غزلیں

اور چند قطعات نواب سید الدین احمد خاں اور نواب خانہ خان کے درمیان افراد سے حاصل ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی غالب کے ہوں۔ لیکن ان میں بھی بلند پایہ اشعار بہت کم ہیں بلکہ خیال میں فقط ایک ہے۔

31 نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں

غالب کی مقبولیت کی وجوہات

خیال میں لفظ ایک سے
نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں ہیں

کچھ نہ کچھ روز ازل تو نے کہا ہے تو سہی
بہنے مرزا کی شاعری کی اندوھیات ہیں

ترتیب سے دو قسمی دور میں زیادہ لایا ہے
مقبولیت کی وجوہات

بیان کردی ہیں۔ لیکن غالب کی غیر معمولی مقبولیت کیلئے دو کافی نہیں۔ اہم غالب کی مقبولیت
کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تخیل ہے۔ جسے نہ کہ عہد انہوں نے نہایت نفیس طریقے
سے بیان کیا ہے۔ "روح سے موت تک مشکل سے سوچتے ہیں۔ تین کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں
کونسا فقرہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیویاں خوابید ہو جو وہاں نہیں۔ مرزا کی شاعری بیشتر
عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اس کے لئے یہاں وہاں وہاں ہیں۔ شگفتہ بیانیہ
کیلئے شوقی اور غرافت۔ اور انسانی فطرت کی داستانیں۔ یہ تو یہاں وہاں کے کی باتیں مثنوی جن کا لفظ
جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جاگتی بڑھتا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان غالب میں خاص مثنوی تصویر کشی اور لفظ
لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس سائے میں غموں کی اورانی جو یہ غم کی اور غم کی وجہ سے
کلام غالب بنی سنائی باتوں کا بیان نہیں۔ بلکہ قلب غالب کے شاعرات کا آئینہ ہے۔ اس بلبل
دست قدرت نے ایک ایک کلمے ساتھ شریعت ہیں۔ اور ان غالب بنی تصویر کشی کے ساتھ ہر وقت ہے
زخمہ بر تار دگ جان میں سوز

مروا اللہ کے لئے شکیفہ کی نسبت مہابہ اور وہاں کے یہودیوں کا جس کی ایک ساری تفسیر ہے
تو یہ دے اسی کتابوں کے ساتھ یہ مبنی ہے میں نے تو ان کو اس خبر سے مرعہ ہوا کہ یہاں اراکین
کے حالات سے متاثر ہو گئے۔ تو میرا کہ یہ شکیفہ ہے وہاں تیس بیس لاکھ روپے کی مالیت ہے ایک خانقاہ
ان کی نسبت طنزاً لکھا تھا آپ کا یہ مال میں کہ دو سو چوبیس ہجرت تھی اس کی مالیت

دختر رز سے جو تاک لگائی۔ تو وہ ظرف پیدا کیا۔ کہ مینائے گروں میں شراب شفق قاصی آفتاب باد شمشکیش لایا۔ اور قمار بازی پر جو دھیان کیا۔ تو وہ چھٹے جواہری ہوئے کہ میر بساط اور بکھرے داؤں کھانے لگے۔ لیکن یہ تصویب کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر میخانے اور قمار خانگی پوری طرح خاک چھان چکے تھے۔ تو وہ شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے سب سے بڑے عالم مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولانا صدر الدین انکے عزیز ترین دوست تھے۔ اور جس کثرت سے تصوف کے مسائل انکے اشعار میں ادا ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے شاید ہی کسی اور شاعر میں ملیں گے۔ وہ رنگ بیوں میں پلک جواں ہوئے تھے۔ لیکن زمانے نے ایک کر کے اپنے ترکش سے سارے تیرا ئپر چلائے اور اگر وہ بزم نشاط اور محفل عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو درمند دل کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ میخوار ہو یا محتجب شوخی اور ظرافت کا مستلاشی ہو یا المزدہ فلسفی ہو یا عاشقہ بستان کا دلدادہ، ان سب کیلئے کلام غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ جسے وہ پڑھتے ہیں اور مرنے دیتے ہیں۔

مرزا کی مقبویت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ نئی طرز کے آدمی تھے۔ اور انکے خیالات کا جو اہلب تھا۔ زمانہ اسکی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے۔ اپنی سمجھ پر نیا دہ بھر دے سکتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ وضع قطع، پیشش، فن لغت، فن شعر، انشاء خطوط اور دوسری شخصی اور ادبی باتوں میں بھی وہ اپنے معاصرین اور پیشروؤں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور آزادانہ ان پر نکتہ چینی کرتے۔

کلکتہ میں جب انکے اشعار پر اعتراض ہوا تھا کہ انہوں نے تغزل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انہوں نے نہایت زور سے کہا تھا۔

زلف بردار کس چرا باشم من ہمایم مگس چرا باشم

سلسلہ۔ حال ہی میں ایک نقاد نے اردو ادب پر انگریزی ادبیات کا اثر دکھاتے ہوئے بتایا ہے۔ کہ جدید اردو شاعری، اردو نثر اور ادبیات میں اساتذہ سلف کی تقلید سے آزادی انگریزی ادبیات اور مغربی اساتذہ سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔ بڑی حد تک ہم اس رائے سے شفق ہیں۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ کہ حالی، جو بہت دور تک اردو شاعری، فن تغزل اور سوانح نگاری میں موجود انقلاب کا بانی تھا۔ انگریزی سے قریباً قریباً نا بلند تھا۔ غالب خود انگریزی سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اور یہ بھی بہت عجیب کہ کلکتہ کا مدرسہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا جاری کردہ تھا۔ اور جہاں معلمین اور طلباء کو انگریزی انشوں اور اساتذہ سے ملنے کے بہت موقع ملنے رہتے تھے۔ تقلید از رنگ خیالی کا مرکز بنا ہوا تھا اور غالب جسے یہ موقع بھی میسر نہیں آئے تھے۔ آزاد خیالی کا وعظ کو کر رہا تھا!

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت تمام عمر انکی امتیازی خصوصیت رہی اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرز عمل زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تنقیدیں لکھی وہ اگرچہ بہت بلند پایہ اور عیس نہیں۔ لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریر کا یہاں ایک مشترک ہے۔ کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مباہلہ سے پاک ہیں۔ اسکے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیالات کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلام غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے تنقیدی اصول بھی اسکے حامی ہیں۔ چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصول پر ہو رہی ہے۔ مرزا میں اور اپنے خیالات میں اسے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پائی ہے۔

اعتراضات

پرائی طرز کے غزلگو شعرا میں سے موجود نسل کو غالب سب سے زیادہ پسند ہے۔ لیکن جن لوگوں نے فن تنقید کا نام سولوں سے گزرا ہے۔ جزوی اور فردی باتوں میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معیارات سمجھا ہے۔ انوں نے غالب کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر عائد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض ہے کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں۔ اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن ان کے اشعار میں ربط و ریاض اور تلمیح کی وجہ سے جو نسبت غنچوں کی وحدت سے جنیں ہمارے غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گچھے ہیں لیکن آخر یہ غالب کی بدقسمتی تھی کہ جب ان کا شعر گوئی شروع کی۔ تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنف شاعری مقبول نہ تھی۔ اور اسکے علاوہ

۱۔ مرزا کی قدر شان و ملی اور محسوس زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے۔ وہ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ پنجاب میں اردو زبان بولی نہیں جاتی۔ رنگ و بو اور محاوروں کی لطیف و جلیق سے اس طرح محظوظ نہیں ہوتے جسقدر خطابات سے اور یہ اتفاق کہ اردو میں جو مستقبل تھی وہ صورت زیادہ پنجاب سے وابستہ ہے۔ دیوان غالب کی مقبولیت میں خدا کا بڑا نصیب ہے۔

بے انصافی ہوگی اگر ہم اس امر کا اعتراف نہ کریں کہ غالب کے دیوان میں مسلسل اشعار کی جو کثرت ہے۔ وہ کسی اور ہندوستانی شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی۔ اور اس کی اکثر غزلوں میں کچھ ردیف قافیہ کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کے اپنے جذبات کے پر تو سے ایک اس طرح کی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے اور کوئی تال بے سُر نہیں معلوم ہوتی۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ چونکہ غزل میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیہ رکھ لیتے ہیں۔ اور انکے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے۔ اُسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ اسلئے نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے۔ اور نہ ہی غزل شاعر کے ذاتی نقطہ نظر کا اظہار۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے خود ایک خط میں اس خیال کی بڑے زور سے تردید کی ہے وہ منشی بہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ ”کیا ہنسی آتی ہے۔ کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے۔ اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاجول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچیں میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں۔ لغت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اسکے قوافی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس ذہن میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔“ قطع نظر اس امر سے کہ مرزا اس طریق شعر گوئی سے خود بہت متنفر تھے۔ اُنکے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انکی غزل گوئی قافیہ بیانی نہیں ہے۔ بلکہ اُنکی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ تو کل دوسرا۔ چنانچہ دیوان غالب میں بھی یہ تفاوت موجود ہے۔ لیکن دیوان غالب میں مشکل سے ہی کوئی شعرا ایسا ملیگا جسے غالب کی اُس عظیم اور متنوع شخصیت سے جس سے ہم یادگار غالب کی وجہ سے خوب واقف ہیں۔ منسوب نہ کیا جاسکے۔ مرزا غالب کا زاویہ نگاہ نام لوگوں

سے کئی باتوں میں مختلف تھا۔ اور ان کے اشعار میں ان کے اپنے خیالات ہی کی تکرار ہوتی ہے۔
 دوسروں کے خیالات کا اظہار نہیں۔ ہم بہشت کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے اس کا
 ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا۔ اور یہ ان کے شخصی نقطہ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی میں نزار
 کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور سب جگہ طنز ہے۔ مذہب کے متعلق ان کے میل و مشاعرہ
 ہیں۔ اور ہر شعرا کی وسعت نظر اور ان کے معنی تشنگ کا اظہار ہے۔ اسی میں رشک کے متعلق
 ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا اظہار۔ اور ان کے مضمون کے عریضے اگرچہ شعر شعریں مختلف
 ہیں۔ لیکن وہ مرزا کے اسلوب خیال کو ہی نمایاں کرتے ہیں۔ اس پر پردے نہیں ڈالتے۔
 اور کہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے ایک سنہوں کو نیچے سے مجبور ہو کر باندھ دیا ہے۔ جیسا کہ
 ہوتا ہے۔ کہ غزل ایک جامہ موزوں ہے جو مرزا کی شخصیت پر درست آیا۔ اور جس نے اس
 کو غریب شخصیت کر اور نمایاں کر دیا۔

نیمچل شاعری

غیر ملکی بے حد دوستانہ تھے۔ یہی باعثِ اثر تھا کہ ان کے اشعار میں
 ان کی شاعری نیمچل تھی۔ یہی نہیں۔ سبب یہ تھا کہ یہ اصطلاح
 اپنے شاہکار شاعر شادی میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی۔ اور اس سے دو شاعری مراد لی گئی تھی۔
 خیالی نہ ہو بلکہ نیمچل یا فطرت کے مطابق مرزا کا کلام نہ سب اور نہ صرف ان سے جانی جاتا ہے۔
 اعتراف کی نسبت قابلِ تسلیم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ ممکنہ ہے کہ مرزا کے دہلی کی طرح کئی کئی
 سے کام لیا ہے۔ ان کے بیشتر مضامین میں فطرت کے حقوق ہیں۔ اور فطرت انسانی کے ہر
 کے کلام میں بے نقاب ہوتے ہیں۔ درختوں میں موت لکھی ہے۔ زمین میں موت لکھی ہے۔ شادی
 مناظر قدرت کی شاعری مراد دیتے ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی مرزا کے کلام میں یہ فطرت
 کہ انہوں نے مغربی تہذیب کی موت مناظر قدرت پر نہیں لکھی۔ انہیں حقیقتاً انہوں
 خاص مرزا کے متعلق نہیں بلکہ شاعری کی شہادت ہے۔ اور مرزا کی شاعری کی
 جو اپنے ہندوؤں کی تعلیم سے تو کم از کم ملے جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی تورات تعلیم کا نتیجہ

آزاد خیالی اور معراج کمال سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں مناظر فطرت کے متعلق ہیں۔ اور انگریزی ادب میں مناظر فطرت کی شاعری کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن آخر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگلستان (بالخصوص لیگ ڈسٹرکٹس) میں مرزا و شاندار مناظر قدرت کی جو فراوانی ہے۔ وہ ہندوستان یا کم از کم دہلی کے گرد و زاج میں عیسر نہیں۔ اور اگر کوئی دہلوی شاعر اس خیال سے مرعوب ہو کر انگریزی شاعری میں مناظر فطرت کے متعلق بہت نظمیں بن خود بھی اونچے اونچے پہاڑوں اور خوش منظر جھیلوں کے خوبصورت مناظر اور چھوہا ستیہ پرندوں کی موسیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس شاعری سے زیادہ ان نیچرل یا مسطور کوئی چیز نہ ہوگی۔ کیونکہ شاعر نے تو خود یہ مناظر دیکھے ہی نہیں۔ گرم ملکوں میں جو لوگ سیل میداؤں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہ دلفریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جو قدرت نے فیاضی سے شمسیر یا سونٹر لینڈ یا لیگ ڈسٹرکٹس میں بہم پہنچائے ہیں۔ انہیں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں وہ نسبتاً محدود ہیں۔ مثلاً چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی، دریا کا کنارہ، بہشت بہار، برسات۔ اور اردو زبان میں اگرچہ غزلوں میں نہیں۔ لیکن دوسری اصناف شاعری میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں۔ مرزا نے اس صنف شاعری میں کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اور مناظر فطرت کے متعلق انکے جو اشعار ہیں۔ ان میں ایک طرح کا نصنع اور تکلف ہے لیکن ان کے قصائد غزلیات میں ان مناظر کے متعلق کئی اشعار ہیں۔ جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ان مناظر سے بے پروا نہیں تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ نیچرل شاعری کی نشوونما شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔ اور اگر مرزا بھی محض ان کے ابتدائی دور کے بعض شاعروں کی طرح کوؤں اور کیکروں اور چیلوں کی تعریف میں نظمیں لکھتے۔ تو انکے کلام کا بھی وہی حشر ہو تا جو ان نظمیں کا ہوا ہے۔

کلاسیکل اردو کے نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں۔ وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں یا بقول سرواڑا لے ”بہی کھاتہ والوں“ کی نقاد ہی یعنی سرقہ اور توار کی بحث۔ مرزا یا اس

اور مولانا آگسٹ (مولانا عبد الباقی آگسٹ) نے محنت و تفتیش سے سادہ و سادہ کے کلام سے
 کسی شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں کسی زمانے
 میں ملنے کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا تھا لیکن اس سے اس کی شہرت
 کو کوئی صنف نہیں پہنچا کیونکہ ایک تو بقول گوئے کائنات میں کوئی چیز باطل نئی نہیں اور اگر
 ایک شاعر کے چند اشعار میں تو اور یا سرتہ بتانے سے اسکے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہوتیں
 ان اعتراضات سے قطع نظر ایک آئینہ ہوا بھل معروض

غالب کا فلسفہ

بحث میں ہے۔ غالب کے فلسفے سے متعلق ہے۔ غالب کے مادی
 مصر ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔ اور اگر فلسفہ سے پیچیدہ و درہمچیز خیالات کا اجتماع مراد لیا
 جائے تو اس مسئلے سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے لیکن آگسٹ کا فلسفہ سے اس کا انسانی فکر
 یا اسکے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطہ نظر مراد ہے۔ تو جب تک یہ دعویٰ ثبوت کا محتاج
 رہا ہے۔ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ جب تک اقبال کی طرح وہ اپنے
 نقطہ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے۔ اس میں چند خیالات کی تکرار کی جیسے مختلف لفظوں
 خیالات کا جزم ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب کے خیالات سے متعلق کوئی جی نظر یہ قائم کیا جائے کہ اس کی
 ترمیم کیلئے جیسوں اشعار مل جائیں۔ اسکے علاوہ مراد ہوگی ایک ایسا جام جہاں منہ لگا کر
 ایک ہی نقش بار بار نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس میں نظرت سے تمام نقش نمایاں ہیں۔ ان کا دل ایک
 آئینہ ہے جس میں تمام نظرت کے نفس نظر آتے ہیں۔ اور ایک تصویریت و دوسری تصویریت کا
 ہے کہ چند نقش پر پردہ ڈالے سے اور ایک آدھ کو نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جاسکتی ہے
 خوش فہم حضرات غالب کا فلسفہ زندگی و دنیا و مسجھ ہیں۔ میں تو اس کوشش سے قانع ہوں
 یہ ضروری ہے کہ ہر شاعر کی خاص پیغام یا فلسفہ زندگی جو اس کے ہاں ہے اسے پہنچے کہ بعض حضرات
 ایسے ہیں جن سے نزدیک ایک ایک بات مرئی ہوئی ہے کہ وہ یہ کیا بات ہے اور احساسات کا
 رہا ہیں اور انھوں کی صورت میں اس کے کوسے کوسے پہنچیں اور وہ اس پر لگائیں اور وہ

زندگی میں اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں۔ ان خوش نصیب لوگوں کی طبیعتیں سدھے سدھائے گھوڑوں کی طرح ہیں جو ایک باگ کے اشارے سے حسبِ طرف چاہیں موڑ لی جاسکتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند ترین شاعری ان لوگوں کیلئے نہیں۔ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں۔ بلکہ تخیل کی نشوونما اور تربیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے رازِ جزائی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں اگر ان کا پُورِ حقائق اور فلسفہ کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک تخیل کی تربیت اور نشوونما اسی شعوری بلندی تک نہ ہوگئی ہو۔ ایک بلند مرتبہ شاعر جو انسانی فطرت کا بھی صحیح نباض ہوتا ہے۔ اس لطیف نکتے سے بچتا نہیں کہ انسان کے عقائد اور اس کے تخیل میں اکثر ایک خفیف سا تضاد ہوتا ہے۔ اور اگر فلسفہ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دیے جائیں۔ لیکن دنیا کے تخیل (یا غیر شعور) پہلی حالت میں ہی رہے۔ تو یہ تضاد فقط ادا نہ ہوا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان بلندیوں پر نہیں پہنچتی۔ جنکے حاصل کرنے کیلئے شاعری مفید ہو سکتی ہے۔ وہ ایک شرابخوار کو دیکھتا ہے۔ جسے میخواری کے نقائص سمجھا دیئے گئے ہیں۔ اور وہ اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا قابل ہو گیا ہے۔ کہ شراب خوری بُری ہے۔ لیکن اُلٹے بٹھکے سوتے جاگتے اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شرابخوار کے خیالات ہی موجزن رہتے ہیں۔ اسکی دنیا کے تخیل ایک شرابخوار کی ہے۔ گو وہ پرہیزگاری کا فلسفہ بھی خوب سمجھتا ہے۔ اب انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واضح ہوتی ہے۔ کہ اس حالت میں شرابخوری کے خلاف حسبِ قدر دلیلیں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ اُن سے اسکی باطنی کشمکش میں اضافہ تو ہوگا۔ لیکن جب تک اسکی دنیا کے تخیل ہی بدل نہ دی جائے۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہیں نکل سیکے گا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے۔ کہ ایک آدمی فلسفہ عمل کا بہت معتقد ہو۔ صبح شام "اسرارِ خودی" اور "درسِ حیات" کی تلاوت کرتا رہتا ہو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے۔ تو تخیل ساتھ نہ دے۔ بلکہ مخالف ہو۔ اور اسکے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے احساسات اور خیالات پیدا ہوں۔ جن سے وہ عمل غیر ضروری بلکہ مضر معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفہ عمل سے سوائے ایک ذہنی کشمکش کے

اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اور بقول حکیم ملت کے معنی

برہنہ کہ یہ خود پیدا ہو گیا ہے۔ اور انتہائی شاعر غفلت
 ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعر غفلت
 کا معیار ہی انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ سبب کافی نہیں
 ہے۔ کہ شاعر کسی معین فلسفہ زندگی یا پیغام کا حامل ہی ہو یہی نہیں بلکہ دنیا کے شعر میں انتہائی
 غفلت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد و مذہبی فلسفوں کو نہیں
 چھوڑا۔ لیکن اپنے کلام میں تحلیل کی تربیت اور نشو و نما کا ایسا سامان چھوڑتے ہیں جس سے انسان
 فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ شکیبہ۔ غالب و غلامی جیسے سے تعلق رکھتے ہیں۔
 دونوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور دینے سے
 جیسے دوسرے پہلو نمایاں نظر آتے ہوں۔ لیکن یہ صرف ان کے جہن میں مینے رکھنے کے انہوں نے انسانی
 زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی فلسفہ یا پیغام دنیا سے لے یا لگا نہیں چھوڑا۔ لیکن
 انسانی تحلیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقاء سے ان کو جو مزید چھوٹ مفید سے بہطرت ایک
 اور بلند تر شخصیت کا فیض صحبت ایک بڑا شاعر اور ایک غیر متاثرہ انسان کی قابلیت کا حامل ہونا ہے۔
 اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی نمایاں ہوا ہے۔ یہی شخصیت کا یہ کہ انہوں
 کے دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ اور ایک نہایت لطیف حریف ہے۔ جو انہوں کی فطری زندگی میں اتنی
 میں رنگی باقی ہے۔ جو شاعر کے فطری میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا دل و دماغ کی دنیا کے فطری سے ہونا
 ہوتا ہے۔ اور جس طرح یونانی تریبندی میں میر کے کاروباروں اور خوبیاں دیکھنے سے
 دنیا نے تحلیل میں میر کی حیرت انگیز زندگی کے بارے میں ایک لطیف حریف سے ہر دلی خوبیاں
 سے یہ ایک لطیف حریف کی شخصیت کے بارے میں ایک لطیف حریف ہے۔ لیکن شاعر اور شاعر

سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک شاعر کے مطالعہ سے اس کی شخصیت اور اس کے تخیل کا رنگ ہم پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اگر یہ مطالعہ مستقل اور گہرا ہو۔ تو یہ اثر بھی دیر پا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے کلام غالب کے مطالعہ سے غالب کی عظیم شخصیت کا پر تو ہم پر پڑتا ہے۔ اور اگرچہ یہ اثر اسی طرح واضح و نمایاں نہیں جس طرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدنا۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تخیل کی یہ تربیت عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور شاعری کی یہ نیم پیغمبرانہ خصوصیت ہے جس کی نسبت غالب نے خود اشارہ کیا ہے۔

اگرچہ شاعران لغز گفتار ذیک عالم اندر بزم سخن مست
وے بابادہ بعضے طریغیاں خمار چشم ساقی نیزہ دست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگرست

فلسفہ غم غالب کے فلسفہ کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ آج تک جو کوششیں غالب نے فلسفی ثابت کرنے کے متعلق ہوئی ہیں وہ اثرنا کام رہی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ غالب کی افتاد طبع اور اس کی شخصیت کے متعلق بھی کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبال کے کلام کی وجہ سے اس وقت رجائی اور قنوطی فلسفوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے۔ غالب کے متعلق بھی چند مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں کہ خواہ غالب کسی خاص سکول کا فلسفی نہ ہو۔ آخر اس کی طبیعت میں کونسا رنگ غالب تھا۔ مولانا نیاز فتحپوری نے ایک مضمون میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ فلسفہ تفاعل و مسرت تھا۔ لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و وزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ کلام غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی ہے۔ اور زور طبع یا طبیعت کی شوخی دکھانے کا ذریعہ۔ مثلاً ذیل کے اشعار ہیں:-

ہفت آسمان بگردش و ماور میان او غالب و گر میرس کہ ہر ماچہ میرود
ہے ہمزہ زار ہر دو دیوار غم سکدہ جسکی بہاریہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

جسے نصیب ہر روز سیاہ میرا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پر جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی قدر مایوسی اور فزولگی
کا ہے۔ یا جسے انہوں نے خود ایک شعر میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم بھلے بہت بھلے مرتے اور مان سیکے ہیں کہ بھلے
حقیقت یہ ہے کہ مرزا ان بے اندازہ خواہشوں اور امانوں جو بدل لائے تھے کہ ان کا
پوچھ بچھ ممکن ہو نہایت مشکل تھا۔ لکھتے ہیں۔

نامرادم وار و این از دل خواہش بدہر
آب بر من بہت اند آسے کہ آسکے من

اسکے علاوہ کئی طبیعتیں ہوتی ہیں کہ جب ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ تو جس طرح
شراب پینے والے خمار اور اعصاب شکنی کو زور کرنے پیلے اور شراب پی سیتے ہیں۔ سی طرح ان لوگوں
کی مایوسی اور بے اطمینانی کا علاج کامیابی اور کامرانی سے تو ہوتا نہیں۔ بلکہ طبیعتیں خواہشوں
کو اور بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ یعنی بقول غالب
ہر چہ نہ مرزا یہ کاست و نہ برس اند و نہ ایم
نشاط خاطر مفلس زکیا علی است

یا

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں استعداد بڑھ جائیں۔ تو بے اطمینانی میں قدرتی ہر ہے۔ اور حقیقتاً
خواہشیں اور آرزوئیں زیادہ ہونگی۔ مایوسی کے موقع میں اسی شرت سے بڑھے۔
ہرگز حسرتے کہ نہ ایام می شمیم
زود تہ پیاں ہمیب جود است

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور حسرت کی رنگ غالب ہے۔ لہذا
علاوہ اگرچہ مرزا کی زندگی کسی گمان سے ناکامیاب نہیں رہی۔ مگر حسرت میں مصائب کا سدھار
بہت تھا۔ وہ وہ برس کے تھے کہ باپ کی وفات ہوئی۔ اور باقی برس کے جوئے تو چھپا رہے۔ بیشک

اسکے بعد وہ عیش و عشرت میں پلے۔ لیکن اس چند روزہ عیش و عشرت کا خمیازہ بہت بھگتنا پڑا۔ قرض خواہوں کے پیچھے سے انہیں عمر بھر نجات نہیں ملی۔ زندگی کے بہترین سال دیوانی مقدمے کی تنگ و دو میں گزرے۔ جس کا نتیجہ نا کامی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ ۳۴ برس کی عمر میں بھائی کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلنے کی فرصت ملتی۔ تو کوئی اور چرکہ لگ جاتا۔ ۵۰ سال کی عمر میں قمار بازی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کی استادی ملی تو دو ہی سال میں ع آں قدح بے شکست و آں ساقی نساہ

مرزا کو جب ان حالات سے سابقہ پڑا تو عجیب نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا عنصر غالب ہو۔ لیکن غم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک غم حالی کا ہے جس سے بیتاب ہو کر شاعر اپنے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوسرا غم میر تقی میر کا غم ہے جو انسان کی اپنی یعنی یسینی اور باطنی کشمکش کا اظہار ہے۔ اور جس میں حساس اور زور درخ انسان کو غم سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ اگر اُسے دُور کر نیکی کو شش کی جائے۔ تو وہ اور بچین ہوتا ہے۔ غالب کا غم نہ تو حالی کا غم ہے۔ جس پر دنیا کی سب خوشیاں نثار ہوئی چاہئیں۔ اور نہ ہی میر تقی میر کا غم جو اگر مستقبل رہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے۔ غالب کا غم اس صحتمند آدمی کا حزن و افسوس ہے۔ جسے دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہے۔ اور جب وہ انہیں مسلسل سعی کے باوجود حاصل نہیں کر سکتا۔ تو وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار سے حزن و افسردگی جھلکتی ہے۔ لیکن غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت نہیں۔ بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ غالب کی انتہائی مایوسی میں بھی ترک دنیا اور رہبانیت یا مردم بیزاری کا شبابہ تک نہیں۔ بلکہ یہ حزن و افسردگی اسی آدمی کی ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ اور جسے اس سے جدا ہونا یا اسے نہ پاسکنا ناگوار ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہئے۔ کہ اگرچہ اشعار میں جو ان کے باطنی جذبات کا آئینہ ہیں۔ اُن کی مایوسی اور

بے اطمینانی صاف ٹپک پڑی ہے۔ زندگی میں انہوں نے غم کے آگے مستحیار نہیں ڈالے
اور میر تقی میر کی طرح پڑ مردگی اور غم کو اپنی خوش طبعی اور زندہ دلانہ پیرنا نہیں آنے دیا۔
پیرم مگر یہ طبع جو انماں گراں نیم
خوں خرد دم نہفتہ و مہجوران نہ

آدمی جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے، اور نہیں پاتا تو سلی مایوس نہ رہتا۔ خواہ
یہ ناکامی خواہشات کی فراہمی سے ہو یا نامساعد واقعات سے۔ یہیں زندگی میں مسلسل انہماک
اور بے چینی نہ نہیں سکتی۔ عام طور پر مایوس اور ناامید ہو کر نئی ناکامیوں کو اقتصاد قدر کے پڑ
ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی قسمت کا قصور ہے۔ زندگی بھر وہ بصیرت سے بھی یہ ایک نکتہ کا سکون
اور توازن حاصل کیا۔ لیکن کسی طریقے سے قسمت کو رد و انکار نہیں کیا۔ بلکہ اس کا ہوشیار
کی مدد سے جو اگر ان کی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تردد و دوسری ناکامیوں اور مایوسیوں کی اس
سے پتہ چل نہ تھیں۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ زمانے نے اس میں کیا کیا ہے۔ اس میں کیا کیا ہے۔ ایک
ایک زہر ملا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں۔ تو بصیرت میں یہ بات و مہجوران آج تاجہ غالب

کے کئی اشعار اس حالت کا اظہار ہیں۔
بصیرت ہی گزرتی ہے ہرگز پشیمانی
یا۔ ہرگز جن سے توقع خوشی کی دلو پنے کی
ملا وہ ازلی مرزائے زندگی کا سرور و مصیبتی اور جتنے تھے۔۔۔ خوشی محدود اور مصیبتیں

آج۔ ہرگز خود تھے۔
تو وہ دل پہن شہ۔ اور
خاطر کو جو اور ہرگز۔
حسرت و رنج کی جو دکان۔
میر تقی میر کی جو دکان۔

ہے۔ تو غم بھی اٹھاہ اور غیر محدود نہیں۔ اور انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی باگ بیت ڈھیلی نہیں چھوڑی جاسکتی۔

تاب لائے ہیں بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جب انکے عزیز شاگرد ہر گوہر کو پال تفتہ ترک دنیا کیلئے آمادہ ہوئے تو مرزا نے جو خط لکھا وہ انکے نقطہ نظر کا بہترین اظہار ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”کیوں ترک لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے جس کو اتار کر پھینک دو گے۔ ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائیگی بغیر کھائے پیئے گزارہ نہ ہوگا۔ سختی و سستی درج و آرام کو ہموار کر دو جس طرح ہو۔ اُسی صورت بہر صورت گزرنے دو“

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں بتایا ہے۔ ایک شاعر کے کلام میں اس کا فلسفہ اسی طرح ساری و پریشاں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک پھول کے نواح میں اس کی خوشبو۔ اہل تعلیم بہت مشکل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی زندگی کے متعلق انکے نقطہ نظر کا واضح اظہار ان کے وہ فانی اشعار ہیں۔ جنہیں ہم نے ”زندگی“ کے عنوان سے تیسرے حصے میں انتخاب کیا ہے۔

تو زانی از غلہ خار و ننگری کہ سپہر
سر حسین علیٰ بر سنال بگرداند
بر و بشار دی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ بر نمط اُتھال بگرداند

یزید را بہ بساط خلیفہ بنشانند

کلیم را بہ لباس شہنشاہ بگرداند

فلسفہ کے علاوہ ایک اور دلچسپ مسکہ غالب کا مذہب ہے۔ اور

مذہب
مرزا کی تصانیف دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہیں مذہب سے دلچسپی عوام سے ضرور زیادہ رہی ہے۔ انہوں نے ہر نیمروز میں ابتدائے آفرینش وغیرہ کے متعلق ہندو عقائد کا جو خلاصہ درج کیا ہے۔ اس سے اور انکے بعض اشعار (مثلاً تحفہ دیر) سے ہندو مذہب

عقائد سے جو واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی بہت کم مسلمانوں کی ہرگز ہستی میں
 ان کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ اور پارسوں کی مذہبی کتب شد و نہایت سن و زانی واقفیت تھی۔
 ان ہے کہ مذاہب عالم میں یہ چھپی ہرگز کی تعلیم کا اثر نہیں دیکھا ہے۔ یہ نہیں اس کی
 زیادہ تھی۔ اور ان کے کئی نہایت پاکیزہ شعرا اس سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی قافیہ پیمانی سے
 زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً

دیور حرم آئینہ شکر اور شکر
 ہاں میں میا دینے سے غریب اور رانگر
 ولم در کعبہ از چنگی گرفت آوارہ خواہم
 آوارہ غریب نتواں ویدہ
 اسکے علاوہ جزوی عقائد سے قطع نظر ہم یہ سب سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 مشرقی شعرا الموم مذہب سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 کی کافی ملاحظہ کیا کہ یہ مذہب سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 بھی جیسا کہ مذہب سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 آزاد خیالی کے باوجود ان میں وہاں سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 نشوونما پر کسی عمل کی یا بندیاں یا آزاد سہ سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 پیغمبر تھے۔ کہ یہ نشوونما متدین میں سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 ہر مذہب عام طور پر کہ یہ جہاں سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 جانتے تھے۔ یہ حقیقتیں وہ ان میں کوئی نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 نزدیک نفس اور اعلیٰ روحی اعمال سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں
 باد و دینہ را کہ یہ مذہب سے متعلق ہیں۔ اور ان کی تفسیر کی روشنی میں

ایک قصیدہ میں رسول اکرمؐ کی تعریف میں لکھا ہے۔ ع
خرد بسایہ شریعت ز فتنہ زہن ساری
اُن کا طبعی رجحان تو ہنس اور رہنما سے آزاد ہو کر آزادانہ تلاشی حق کا تھا۔ لیکن جانتے تھے کہ
”وہ رسم منزلہا“ سے واقفیت مفید بلکہ ضروری ہے۔ ع
عناں گسیختہ ببراہہ تاخلف تا چند
بشرع پیچیم و گردم بیویہ پنجباری
شرع اور حق کے تعلق کو انہوں نے ایک اور فارسی شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں نظم کیا ہے۔
بشرع آویز و حق میجو ز معنوں کم نہ واللہ
کہ دل با تحمل است اما زباں با سارباں دارد

اسی طرح صوفیہ کرام میں ایک مصرع مشہور ہے۔ ع
با خدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہنشیار باش

یعنی خالق اور مخلوق کا تعلق تو انسان کے اپنے متعلق ہے۔ لیکن چونکہ نبی کریمؐ ایک جماعت کے سردار
ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے اُس جماعت کے اصول و آئین ملحوظ رہنے چاہئیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ
مرزا نے اس اصول سے سرسوتجاوز نہیں کیا۔ خدا کا ذکر انہوں نے اپنی نظموں میں جس آزادی اور ہیبائی
سے کیا ہے۔ اس کی مثال ہندوستانی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن پیغمبر صلعمؐ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے
ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور اگرچہ خدا کے متعلق ان کے کئی اشعار ایسے ہیں جنہیں رافضی
میں کفر کے کلمات سمجھا جائیگا۔ رسول اکرمؐ کا جہاں کہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ہمیں پورا ادب
و احترام ملحوظ رکھنا ہے۔

مرزا کی اس ”پابند آزادی“ یعنی آزاد خیالی اور حفظ مراتب کی ایک پچسپ مثال انکے مختلف
مذہب کے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ یادگار غالب اور مرزا کے اپنے کلام سے انکے ہندو اور عیسائی
دوستوں سے جو مخصوصہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تو اس قابل ہیں کہ ہم اس روشن خیالی کے دامن

میں انہیں چراغ راہ بنائیں۔ لیکن ان کے باوجود مرزا ضبط و آداب رسوم سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور جماعت ہندی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ مرزا آفتاب کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "بندہ پرور میں کرنی آدم کو مسلمان ہر یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دراصلی یا نہ مانے۔ بانی رہی وہ عزیز داری جسکو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اسکو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اس کے مراتب و درجے ہیں۔"

مرزا آفتاب کی قدر و اہمیت سمجھتے تھے۔ لیکن مذاہب کے جزوی اختلاف اور فرق پیچیدگیوں اور بلا ضرورت پابندیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آج کل لوگ قانون کی پرستش کرنے کے خوب واقف ہیں۔ لیکن فقہ کی باریکیاں کچھ اس سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ قانون رسمی میں جتنا

مفکروں کے نزدیک ایک اہم مسئلہ فرشتوں کے گھر کا تھا۔ اور ان کے درمیان اکثر اس سوال پر بحثیں ہوتی تھیں کہ ایک تلوار کی رگ پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔ وقت گزرتا ہوتا ہے۔ اسلامی فقہ کے کئی مسائل بھی اسی طرح فرضی اور حقیقت اور روزمرہ کے واقعات سے پیدا ہوتے تھے۔ لیکن

کی تعلیم اعلیٰ کو یہ خیالی قلابازیاں پسند نہیں تھیں۔ اور انہوں نے اپنے غلط فہمی میں مرد و عورت کی مثال اور ضابطہ کے خلاف بیت بچے سے نفرت سمجھی تھی۔ ان کے خیال میں انسان کو

کہ مذہب کی اصولی بات کو سمجھنے کے لئے ان پر کیا جان سکتی ہے۔ فقہ اور مذہب کی جزوی باتوں کو علیحدہ کرنا بیجا ہے۔ اور یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف مرنا چاہئے میرا۔ اس میں نہ سرفروشی نہیں کرتے۔ میں سیال سے کہتا ہوں کہ

نقد و چکر میار کیا۔ جب و نجوم و ہجرت و منطق فلسفہ پڑھو۔ ہر آدمی بنا چاہے۔ مذہب کے بعد نام نہی ہے مذہب حق و اسلام والا کرام۔ علی علی کیسا کہ اور قارغ اہل اسلام انہوں نے ایک دو مذہبی بحثوں میں سے لیا ہے۔ لیکن ان میں ہی جزوی اختلافات تھے جو مسلمانوں کو نا پسند کیا۔ چنانچہ مقدسوں اور فیقہوں میں خدا کے علاوہ کسی اور کے متعلق جو اہم اختلافات تھے مرزا اسلام کے لیے ضرورت اور جزوی سمجھتے تھے۔

ابہاں را زانکہ دانش نارسا است

گفتگو ما بر سرِ حریفِ نداد است

عقیدتاً مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ وہ توحید اور رسالت کے قابل تھے لیکن ان کے کلام سے خیال ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا ان کے بدن پر پوری طرح بھتی نہیں تھی۔

رموز دینِ شناسم درست و معذورم

نہاد من عجبی و طریق من عربی است

تمام مغلوں میں ایک طرح کی پیگن ازم "پانی جاتی ہے۔ وہ بیشتر عیشِ امروز" کے قائل ہوتے ہیں۔ اور "روزِ فردا" کا خیال انہیں اس طرح مضطرب نہیں رکھتا جس طرح سامی نسل کے لوگوں کو۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اور عیشِ امروز کے وہ بھی اسی طرح قائل تھے۔ جس طرح بابر یا جہانگیر اور جس طرح مغلیہ سلطنت کے بانی نے کہا تھا۔

با برعیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی طرح مرزا کے کئی اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قابل نہ تھے بہشت کا جہاں کہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ قنوی ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا رباعی، ہمیشہ شوخی بلکہ تسخر سے ہی کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دورِ عباسیہ کے کئی حکماء نے اسلامی یا مسیحی دنیا پر نعیمِ جسمانی کے قابل نہ تھے۔ مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی۔

حال ہی میں مرزا کے چند ملاحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت

حُب وطن

کرنا چاہا ہے کہ ان میں حُب وطن کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط انداز سے پر مبنی ہے۔ مرزا بقول خود شہد کی مکھی نہیں تھے مگر ان کی مکھی تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بابر شاہ کے بعد

شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اسکے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو۔ تو مرزا کو شاہی سلسلہ ختم ہونے کا کوئی صدہ نہیں ہوا۔ کوئی فکر تھا۔ تو اپنے مستقبل سے متعلق اور انہوں نے ملکہ و نوویرکا خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کر دیں۔ کہ شام و روم کے بادشاہوں کے درباری مشائخ کو یمن کوٹ بھیجا جائے!

موتے ہیں۔ مجھے کیوں نہ کوئین پوسٹ آگیا جاتے!

مرزا معاملہ ختم آدمی تھے۔ اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ نے ان کی کوششیں سبھی بھی اتنی جبری نہیں ہوئی کہ وہ وہاں ہی بہادری سے تیز لڑا۔ بہادر شاہ نے ان کی کوششیں سبھی بھی اتنی جبری نہیں ہوئی کہ وہ وہاں ہی بہادری سے تیز لڑا۔

پہلے شاہ سے ان کا راجہ کو مستعد کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنے
 ادا کر بھیج دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنے ادا کر بھیج دیا جاتا ہے۔

مرزا کے خطوط سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی موت کے بعد اس کا جو مرثیہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کا جو مرثیہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کا جو مرثیہ انہوں نے لکھا ہے۔

[illegible]

دہلی اسے لے کر اپنے گھر پہنچا۔ لیکن وہ اس وقت تک نہیں آیا۔

[illegible]

کتاب کریمیا تو انہوں نے دعوت جو محمد کی تھی
مگر نہ میں یہ دیکھ سکتا تھا
یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ

دینے جیسے اندر میں دیکھیں
شیخ و دوستانہ ایساں راگ
تیرے لئے جس قدر ہے اور انا

تاریخ: ۱۳۸۵/۰۵/۰۵
محل: تهران
موضوع: درخواست وام

[Faint, illegible handwritten notes]

1950年10月1日

زین ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت سعی بریشینیاں بیشی گرفت
حق این قومست آئیں داشتن کس نیار و ملک بہ زین داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند ہندرا صد گونہ آئیں بستہ اند

بیش این آئیں کہ دارد روزگار

گشتہ آئیں دگر تقدیم یار!

معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ تقریظ سرسید کے پاس پہنچی۔ تو چونکہ انہوں نے اہی تقلید کی ان ذہنی زنجیروں کو نہیں توڑا تھا۔ جن سے مرزا آزاد تھے۔ انہیں مرزا کی شادی پسند نہ آئی۔ اور انہوں نے اسے کتاب کے ساتھ شائع نہ کیا۔ لیکن مرزا کی اس شادی سے بھی تہ چلتا ہے کہ وہ "درع ماکدر خذما صفا" کے اصول پر پوری طرح عامل تھے۔ اور ملکی پائسلی تعلقات کو بہت بہت نہیں دیتے تھے۔

مرزا نے اپنے اشعار اور خطوط میں جا بجا اپنی محرومی قسمت

غالب کے معاصرین

اور معاصروں کی ناقدر شناسی کی شکایت کی ہے۔ اس سے اور یادگار غالب کے بعض اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے۔ کہ مرزا کی بقدر استحقاق قدر ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہوئی۔ حقیقتاً یہ خیال جب قدر عام ہے اسی قدر غلط ہے۔ اور مرزا کے زمانے کے حالات اور اس زمانے کے تذکروں میں جتنی تحقیق کی جائے۔ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانے نے مرزا کی قدر میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر مرزا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تو اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کی نسبت جو اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس سے پورا پورا اتفاق کرنا صحیح ادبی مذاق کو ناگوار تھا۔ درست ہے کہ شاعری میں جب کوئی نئے راستے نکالتا ہے۔ تو اسکی قدر آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ لیکن مرزا نے فن شعریں کوئی تیار راستہ نہیں نکالا۔ فقط اپنے طبعی جہر سے پرانی روش میں کامیابی حاصل کی۔ اور اپنے کمال شاعری سے غزل کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا۔ نیز باوجودیکہ اب تعلیم اور چھاپہ خانہ کی توسیع سے کلام غالب کے پڑھنے والے

بڑھ گئے ہیں۔ غزل کی خرید و بیع کے سبب کی صلاحیت اس نسل میں جس کی ادبی تربیت نے اصول پر ہر مہر ہے۔ غالب کے معاصرین سے کچھ بہت زیادہ نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہم تمام حالات کا با تفصیل مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ زمانہ غالب کی نہیں بلکہ معاصرین غالب کی رائے کی تائید کر رہا ہے۔ مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی منظر پرے اٹھانا تھا۔ اور فارسی غزل گوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو غلط میں نہیں دیتے تھے۔ لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں۔ مرزا اُسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے۔ اُس سے متعلق ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اس کے متعلق جو کچھ مرزا کے معاصرین (مثلاً نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مولانا صدیق آزادہ، پنجپور وغیرہ) کی رائے تھی۔ وہی درست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو ہر زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ ان کی شاعری کو جو بلند جگہ دی جاتی ہے۔ وہ ان کے مقب دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے۔ عوام الناس مرزا کا یہ مصداق دیکھ

شہرت شوم جلیس بزم میں خواہ شدن۔
پڑھتے ہیں اور مرزا دھتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج اب بھی سمجھا جاتا ہے۔ جسکی نسبت ان کے معاصرین کہتے تھے۔ قطع

اگر اپنا کہ تم آپ ہی سمجھ کر کیا کہے
مرزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دکر لکھے
کلام تر شیعے اور کلام میندہ کہے
مرزا کہنا یہ آپ سمجھیں یا خدا کہے
یہ قطع حکیم آغا جان پیش کا ہے۔ ہر انہوں نے جو مرزا کے دروازے پر مشاعرہ میں پڑھا تھا۔ حکیم صاحب شعر کا اچھا انداز سننے تھے۔ لیکن شعر میں ان کا وہ رتبہ نہیں تھا۔ جو ان کے دوسرے معاصرین کا جو اس قطع کے معنیوں سے متعلق نہ تھے۔ لیکن آخر یہ قطع اس منتخب دیوان متعلق نہیں جس کو سب شعر حکیم مرزا جان بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں مرزا کی ہشت لکھ دیوان ہے۔ انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اور کھٹک کہتے ہیں کہ دیوان سے باہر جو میرت و شہادتیں انہیں میرزا نے سمجھا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر مرزا کی رائے

کے بعد بھی اس سلسلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی۔ تو اس کا جواب نہ بھوپال ہے۔ جس میں خارج شدہ اشعار شایع ہوئے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم سمجھنا چاہیے کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا۔ تو ان پر کفر کا فتوے نہیں عائد ہوتا۔ بلکہ اردو ادب ان کامنوں ہے۔ کہ انہوں نے تنقید اور تسخر سے مرزا کو ان سرخ و سپید خرف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا۔ اور ان کی توجہ اس بحر شعر و سخن کی طرف پھینچی جس میں غوامی کا صلہ وہ بے بہا مرقی ہیں۔ جو اردو ادب کیلئے مایہ ناز ہیں!

اس کے علاوہ جن لوگوں نے مرزا کے معاصرین کے متعلق فقط مرنا اور حالی کی شکایتیں ہی کی ہیں۔ وہ اس قدر منزلت سے ناواقف ہیں۔ جو مرزا کے ممتاز معاصرین کے دلوں میں مرزا کی تھی۔ اور جسکا ثبوت تمام معاصرانہ تذکروں میں ملتا ہے۔ شعرا کے تذکروں میں جگہ انہیں اس وقت سے ملنی شروع ہو گئی تھی جب وہ ابھی سولہ سترہ سال کے تھے۔ گلشن بیجار جو اس زمانے کا ہم ترین تذکرہ ہے۔ اس میں مرزا کی اس قدر تریف اور ان کے کلام سے اس قدر طویل انتحاش ہے کہ گارہن نامی اپنی تاریخ ادبیات اردو میں حیرت ظاہر کرتا ہے۔ کہ شیفتہ جسکی نمایاں خصوصیت میانہ روی ہے۔ ایک شاعر کا اس قدر مداح ہے! سر سید احمد خاں نے آثار الصفا دید میں دہلی کے ممتاز لوگوں کے جو حالات درج کئے ہیں۔ ان میں غالب کو دہلی کے باقی سب شعرا سے پہلے جگہ دی ہے۔ اور اس میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا جسطرح اعتراف کیا ہے اس پر غالب جتنا بھی فخر کرتا بجا تھا۔ نواب ضیا الدین نے خود دیوان غالب کا دیباچہ لکھا۔ جو اگرچہ دیوان کے ساتھ شایع نہیں ہوا۔ آثار الصفا دید میں چھپ چکا ہے۔ اُن کے دوسرے مداحوں میں سے مولوی فضل حق، خان بہادر منشی غلام غوث تجر تریں، ناسخ، نساخ آسمان علم و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ لوگ مرزا سے ملنے اور ملاقات کر نیکے دہلی آتے۔ عزیز بکھنوی اور صفیر بلگرامی کی ملاقات کے حالات ہم درج کر چکے ہیں۔ اُن کے علاوہ سید غوث علی شاہ قلندر جنکا مرزا پانی پت میں مرجع خاص و عام ہے۔ اور جو مولانا الطیل میر بھی کے مرشد بھی تھے۔ مرزا سے ملنے اُن کے مکان پر گئے اور مرزا سے اُنکی ملاقاتوں کا حال اُن کے لاجواب تذکرہ

میں مفصل درج ہے۔ اسکے علاوہ زمانے نے مرزا کی تصانیف کو ناقصوں کا تھمہ لیا۔ اسکا اردو دیوان شائع
 کر نیکی نے دو نامہ جس طرح بیابان تھے۔ انکی تفصیل انکی خطوط میں ہے۔ انکی دستخطوں کا تھمہ بھی اور
 تو اور انکی رقعات کی بہت مانگ تھی۔ ہندوستان کے اکثر ممتاز رؤسا و اکابر نے انکی تعلقات تھے
 اور وہ انکی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک فارسی خط میں قاضی القضاۃ سروری رلایت حسین کے تین سو
 روپے بھیجنے کی رسید ہے۔ اردو کے سلی میں ذاب میر ظلام بابا خاں رئیس شہزاد کی طرف سے پہلے ایک گولی
 اور بعد میں زہرا دہلی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ بہادر اور انہیں تحفے قائف بھیجے رہتے تھے۔ دہلی
 مصطفیٰ خاں نے ان کی مصیبتوں کے دوران میں ہمیشہ مدد کی۔ ہر روز وہ جس انہیں نقدی مالی قافی شہزاد
 لکھنؤ کی طرف سے بھی پہلے تصدیق پر پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوا۔ وہ جب تک سہ وقت قائم رہی مرزا کو ملتا
 ان تک نہ پہنچی۔ بعد میں پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوا۔ یہ بھیج تے کہ وہ بارہوی میں انکی قدر چھوٹی
 وہ بارہامپور کے مرزا پر چوا حسانات تھے۔ سبکو معلوم ہیں۔ یہ بھیج تے کہ وہ بارہوی میں انکی قدر چھوٹی
 نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ان حالات کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو مرزا کی ترقی میں شامل تھے۔ مرزا ابھی تیرہ سال تک
 کہ ذوق فکر کے استاد ہو گئے۔ اسکے بعد انکی واقعات ایسے ہوئے کہ ان کو ضرور حال رہا ہوگا۔
 یہ امر عجیب و غریب ہے کہ ظفر احمد لاشار اور اردو شاعرانہ قافیہ میں تھا۔ اور مرزا اس زبان کو
 اسکے دربار میں نشوونما پا رہی تھی کسی قابل سمجھتے تھے۔ نہ صرف وہ مرزا شاعر کا دلدادہ تھا بلکہ
 ہمارے خیالی اور شعری آفرین پر جان دیتے تھے۔ لیکن اسے باوجود غور سے مرزا کیسے نہ سمجھیں بے انتظام
 کی پشت میں جب مرزا پر قمار بازی کی وجہ سے قافیہ میں پائیا۔ تو مرزا نے مجسٹریٹ کو مرزا کی
 سفارشی خط لکھا۔ اسکے بعد اگرچہ مرزا اپنا ابتدائی حرفہ شاعری ترک کر چکے تھے۔ ذوق کی انکی
 انہیں استاد مقرر کرنا بہادر شاہ جیسے و مستعد بادشاہ کیسے ناممکن تھا۔ لیکن اسکے باوجود انہیں
 انہیں درباری سرورج مقرر کیا۔ جو بے شک ایک بڑی مدد تھی۔ اور چھوٹی مدد بھی تھی۔
 سالانہ مقرر کیا۔ جو یہ خیال کرتے ہوئے کہ ذوق و ابتدائی استاد مرزا پانچ سو روپیہ ماہوار تھا۔ انکی
 جنہیں معلوم ہوتا تھا کہ قافیہ میں ہاتھ دے رہے تھے۔ یہ بھیج تے کہ وہ مرزا کی ترقی میں شامل تھے۔

ہوتی تھی۔ وہ بہادر شاہ نے نہ کی۔ لیکن وہ ہو ہی کیسے سکتی تھی۔ جب زمانہ ہی بدل چکا تھا۔
زمانہ دگرگون آئیں نہاد
شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

مرزا عبد الرحیم خان خاناں کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے ایک شاعر کی اس درخواست پر کہ میں ایک لاکھ روپیہ
کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے لاکھ روپیے کا ڈھیر لگا کر اسے بخش دیا۔ لیکن پچاسے بہادر شاہ نے تو شاید خود
ایک لاکھ روپیہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس طرح کی فیاضی کیسے کرتا!

سروالہ رائے انگریزی شاعر ملٹن کی نسبت لکھا ہے کہ ملٹن کا سب سے بڑا مداح ملٹن ہے۔ اور ملٹن کی
جو کوئی تعریف لکھیگا۔ اسے ملٹن کے اپنے خیالات ہی مختلف الفاظ میں ادا کرنے پر پینگے۔ یوں تو شاعرانہ
خود نمائی میں ہمارے سب شعرا مغربی شعرا سے بہت آگے ہیں لیکن جتنے نے جو کچھ ملٹن کی نسبت لکھا ہے۔
وہ غالب کی نسبت لفظ بلفظ صحیح ہے۔ لوگ ڈاکٹر بخزوری کے ”مقدس وید اور دیوان غالب“ والے فقرے
کو دہراتے ہیں۔ اور اُسے خوش اعتقادی اور مبالغہ کا انتہائی اظہار سمجھتے ہیں۔ لیکن آخر بخزوری نے بھی فقط
غالب کے دو قافیہ اشعار لکھ کر شاعرانہ نثر میں انکی تشریح کر دی تھی۔ ہے

گر شعر و سخن بدست آئیں بودے دیوان مرا شہسرت پروں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے آں دین را ایزوی کتاب ایں بودے!

مرزا اپنی تعریف میں بھی وہی مبالغہ روا رکھتے تھے۔ جو مدحیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں۔ اسے لفظ
بلفظ صحیح ماننا مذاق سلیم کو گوارا نہیں۔ اور یہ امر افسوس ناک ہے کہ کلام غالب کی موجودہ شہرت اور مرزا
کے معاصرین کی مزعومہ اور معروضہ ناقدر شناسی سے یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے۔ کہ ایک شاعر کی اس کے
زمانے میں یا اسکے ملک میں صحیح قدر دانی نہیں ہو سکتی۔ اور آج جو شاعر عزوجل کا ایک دیوان مرتب کر لیتا
ہے۔ وہ اسے جرمن قوم کے نام ہی معنون کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہندوستان میں تو شعور فہم کوئی نہیں رہا۔
ان حضرات کے کلام کو کوئی سمجھ سکتا ہے۔ تو جرمن قوم کے افراد۔ ہم شاعرانہ عقلی کو اگر ایسے ”شاعرانہ عقلی“
ہی سمجھا جائے۔ بہت بڑا عیب نہیں گنتے۔ لیکن موجودہ شاعروں اور ان کے حواریوں کا طرز طریق کہ وہ

ناظرین کو اشعار کی خوبیوں سے واقف کر کے نہیں بلکہ انہیں مرعوب کر کے اور انکی ناقابلیت جتا کر
 داد دیتے ہیں۔ کسی طرح بھی قابل تحسین نہیں۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اس طرز استدلال کے عام ہونے کی
 بڑی وجہ غالب کی موجودہ شہرت اور پرخمال ہے کہ غالب کی اپنے زمانے میں صحیح فہم نہیں ہلا۔
 ہم نے پہلے حصہ میں معفیہ ملگرامی اور عزیز مکسٹونی کی غالب سے ملاقات
 کا حال مدح کیا ہے۔ اس سے مرزا کی اخیر فکر کی کڑوی اور انکی اس زمانے

حلب

کی وضع قطع کا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ لیکن مرزا نے اپنے شاگرد مرزا عاتق علی بیگ مہر کے نام پر خط
 ان کی تصویر ملنے پر لکھا ہے۔ وہ اس بابے میں نہایت جانت ہے۔ اور یہ کہ نہ صرف اس پر مرزا
 ایام جوانی کی ایک دلآویز تصویر ہے۔ بلکہ ان کی بدلت پنداری اور قیاسی رنگ تامل رکھنے کی تصویر
 پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس میں سے ایک طویل اقتباس درج کر رہے ہیں۔ تنہا را خدیو دیکھ کہ تبار
 کشیدہ قامت ہونے پر کچھ کو رشک نہ آیا۔ جس واسطے کہ میرا قدمی دراز سی میں انشت نہایت
 قہارے گندی رنگ پر رشک نہ آیا جس واسطے کہ جب میں بیتا تھا تو میرا رنگ چینی تھا۔ اور
 دیدہ و رنگ اس کی شائش میں کرتے تھے۔ اب جو کسی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو چھاتی پر پاپا
 روٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس گل پر کہ ڈاڑھی غریب
 گھٹی ہوئی وہ مرے یاد آئے۔ کیا کہوں کی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں سے

تا دم سترم بودم سپاس تریاں

شر صدی از فرقہ پست سینہ نہ دایم

جب ڈاڑھی منچو میں بال سفید آئے۔ نصیب و ن پیہم تو نے اندھے گلوں پر نور
 ملے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آئینے کے دو درخت ٹوٹ گئے۔ ناپارسی جی چھوڑ دی۔
 اور ڈاڑھی جی۔ مگر یاد رکھئے اس جھوٹے شہر میں ایک دردی ہے عام۔ ملا۔ مانتہ۔ بال
 نیچہ بند۔ دھوئی۔ رشتا۔ جنس۔ وہ۔ ہر جا ہر آنسو منہ پر ڈاڑھی سر پر بال بغیر جس وہ دلا
 رنگ اسی دن مر رہا ایتا۔

اخلاق و عادات

(مرزا کے اخلاق و عادات کی حالی نے یادگار غالب میں جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور شاعر کی شہرت کی بنیاد شاید دیوان غالب سے بھی زیادہ مولینا حالی کے اس شاہکار پر ہے۔ لیکن جیسا کہ حالی نے حیات جاوید کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ یہ تصویر ایک طرف سے۔ اس کتاب میں مصنف نے مرزا کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔) مرزا کی ذہنی اور دماغی خرمیوں سے ان کی شگفتہ طبعی، زہانت، آزاد خیالی اور محققانہ نظر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مغلی اور ذہنی راستہ بازی کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور ان کے فارسی خطوط میں "راستی بالائے طاعت است" کا فقرہ اتنی دفعہ دہرایا گیا ہے۔ کہ یہ اصول ان کی زندگی کا اہم ترین مسلک معلوم ہوتا ہے۔ جب ان کی کوئی غلطی انہیں سمجھا دی جاتی۔ وہ بلا تامل اس کا اعتراف کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ پرے درجے کے وضعدار تھے۔ اور گو انہیں صحیح نوابی شان کبھی میسر نہیں ہوئی۔ ان سے جہاننگ ہوسکا۔ انہوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں۔ دوستوں کا وہ بہت خیال رکھتے۔ اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے۔ ان کی مصائب اور بد حالی سے متاثر ہو جاتے۔ حسن اخلاق اور لحاظ و مروت میں وہ عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ لیکن مرزا آخر انسان تھے۔ فرشتہ نہیں تھے۔ ان کا دل غصے سے۔ رنج سے رشک سے اور اس طرح کے تمام انسانی جذبات سے متاثر ہوتا۔ بعض وقت وہ طیش میں اپنے مخالفین کی نسبت ایسے سخت فقرے لکھ جاتے کہ انہیں دہرانے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ فارسی لغت نویسوں کی نسبت جو درشت اور خشن الفاظ انہوں نے استعمال کئے۔ ان کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح نواب شمس الدین اور ان کے درمیان جاہلاد کے متعلق تنازعہ تھا۔ قصداً نواب دلیم فرہز کے قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہوئے۔ اس موقع پر مرزا نے ایک فارسی خط میں تاج کو لکھا ہے۔ "اذا بدست مگر کش ستم رسیدہ نواز بد عالمائے محمدی میخواستہم کہیں خبر دسر بے آرم زود تر بیا و افراہ گرفتار و از سر فرازی بیایہ وار آید و دادم کہ ہم ظفر بیا"

تاریخ

و عایم مستجاب است۔ نواب شمس الدین تختہ دار پر ٹکا دیے گئے۔ لیکن مرزا کا غصہ فرو نہیں آیا
۵ ایک اور خط میں لکھتے ہیں یہ قبلہ حاجات۔ وہ لگے کہ درگشاہ عزت نامہ روئے داد بر
فسر دئے شوق حمل نشود۔ حکم بہت بجا ہے شگرف آویختہ بود۔ و نظر منظر سے بلند ما دید
انی ہمیکرد۔ تا آنکہ ہنگام سرا آمد و ہر کردار کیفر سے کہ بایست یافت۔ مرزا بان میرات
اند کریم خاں سرہنگ خویش بخلق آویختہ شد و بہارش بدم آباد رفت و
ہر کے آں درود و عاقبت کار کہشت

یہ صحیح ہے کہ نواب نے بھی مرزا کو تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اس کے علاوہ مرزا کو نواب کے خرم کا یقین بھی ہو گا۔ لیکن پھر بھی ان خطوط میں ذاتی اطمینان اور غلبہ و غضب کا اظہار درمیان نسبت سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہ جذبات ایک دروغ و غیب کا اظہار درمیان نسبت سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہ جذبات ایک ایسے شخص کے نہیں ہونے چاہئیں جس کے تمام ایمان، قلندر سی ماثر اور گی دیشار درگم کے ہوں۔

ہوں۔
 مریتا حال یادگار غالب میں ایک بگڑ چکے ہیں۔ اندر سے بعد ان کی آمدنی تیار ہوا اور ان کو
 مہوار ہو گئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی پورا کیا جو ان کا تھا۔ غرور غریبوں اور محتاجوں
 کی امداد اپنی بساطت سے زیادہ کرتے تھے۔ اس نے اکثر تنگ رہتے تھے۔ مرزا کے ایک دوست
 اور حیدر خاں سیاح میں بھی اسی طرح کا خیال رہا۔ لیکن میرے خیال میں عام طور پر یہاں
 لینا کہ مرزا کا سارا وقت ان کی خیالات کی جستجو سے ضائع ہو جاتا تھا۔ حالی کے علاوہ کسی اور شخص
 سے ان کی خیالیوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ غریبوں اور مسکینوں کے لئے کچھ
 دینا تو یہی گوارا کر سکتا ہے۔ یہاں کی خدمت اپنے آرام و اپنی ضروریات پر ان کو ہے۔ مرزا
 باہم اپنے آرام اور دنیا کی آسائش و بہت خیال رکھتے تھے۔ در خواہ انہوں نے اپنے حال
 مرزا یوسف اور ان کے ارادہ خیال کی خاطر اور ان کے بعد موتی خاں سے دوستی کی۔ مرزا کی طبیعت
 مرزا یوسف کو اتنی تنہا بھیجی کہ وہ یہاں سے واپس نہ آیا۔ مرزا یوسف مرزا کا بھائی اور مرزا کا

نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی بھتیجی، ابھاراج وغیرہ کیلئے کیا کیا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ لیکن ان کے ایک سار دو خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کم از کم تین سال تک اپنی بھتیجی کو ایک پائی نہیں بھیجی (حالانکہ مرزا کا اپنا بسراوقات بیشتر چچا کی پیشین پر تھا) بیشک یہ غیر معمولی وقت تھا۔ اور مرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان کے حالات کا بغور مطالعہ کریں گے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں۔ کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے۔

مرزا کو زندگی کی مہم تن تنہا طے کرنی پڑی تھی۔ اس لئے وہ اپنی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ اسکے علاوہ انہوں نے زندگی کا سبق کتابوں اصولوں سے نہیں بلکہ زمانے کے طمانچوں سے سیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اخلاق کے معلمین خود نمائی اور فخر کے خلاف کیا کہیں۔ انسان کو اپنی خوبیوں کی طرف اکثر خود توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم بالتفصیل بتا چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم و نشر کے متعلق انگلستان اور کسٹرنسی سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور غالب کا سب سے بڑا مداح غالب ہی ہے۔

ہم نے سطور مندرجہ بالا میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ اگرچہ مرزا بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے احساسات اور جذبات عام انسانوں کے تھے۔ اور ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کا دل یوگیوں و لیونکا دل نہیں تھا بلکہ عام انسانوں کا۔ وہ شاعر تھے۔ عام

۱۔ یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ غالب کے متعلق مولانا مہر کی کتاب شایع ہوئی۔ ہمیں انہوں نے "اخلاق و عادات" کے باب میں غالب کے "انکسار" ایشاد و کرم اور مخالفت سے غفور و دگرز پر ہیبت زور دیا ہے۔ ایک خاص عنوان ہے "احسان لینا گوارا نہ تھا" ہم پہلی تین خصوصیات کی نسبت ذکر کر چکے ہیں۔ چوتھی کی نسبت ہمیں سمجھ نہیں آتا۔ کہ قاضی ولایت حسین نواب میر غلام بابا خاں اور کئی دوسرے بریتوں کا زور و مادی بھیجتا اگر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ اور مرزا کے تصانیف، خطوط وغیرہ کے کئی اندازاً بت کے باوجود مولانا نے کیسے مان لیا۔ کہ غالب کسی کا ذرا سا احسان بھی گوارا نہیں کرتے تھے؟

انسانوں سے زیادہ حساس اور اپنے احساسات کے اظہار پر قادر۔ لیکن انکے جذبات اور احساسات وہی تھے۔ جو تمام انسانوں کو یکساں رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ناظرین ان کے دل کی داستان میں اپنی ہی کہانی پڑھتے ہیں۔ مرزا کو خود اپنی اس بشریت پر ناز تھا۔ ہے

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
مشکارا آدم ز عیال میز نم

ہم ایک قادی قندے جس میں انہوں نے اپنی جیسی افتاد کو نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔ اس نظم کو نظم کہتے ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب

از نسوین سے حسد اس نظم	نہ چاہم کہ برقعہ و عروس
ما سے را خدا شناس نظم	تو از نصیحت و خط
ویرا انسانا قیاس نظم	نہ کہ احباب و شانی را
بہ تیرا زہ آفتاب نظم	نہ کہ ز آفتاب پرچہ شہر است
تو کہ تو سے سب اس نظم	نہ کہ از ہر خطائے بہشت
مسا زہ زہ چاس نظم	نہ کہ در عالم فساد و دہشت
نہ بہ نیم نہشت بچاس نظم	چوں زمین ساقیم ز خستہ
نہ بہ نیم نہشت بچاس نظم	نہ بہ نیم نہشت بچاس

تحت

احباب

فہرس
نخستہ



صفحہ
۱۷۷
۱۹۲

۱۸۲۱

نمخانہ شباب

۲۴۵ مات وغیرہ ۱۸۲۱ تا ۱۸۳۲ (۱۹۱۸)

بہار عجم

۲۸۹ ۱۸۳۰ تا ۱۸۲۷ سدا

۲۹۹ ۱۸۳۷ تا ۱۸۳۰ سا

۳۱۲ ۱۸۴۷ تا ۱۸۳۷ شیراز

اردوئے معلّٰی

۳۵۷ ۱۸۵۵ تا ۱۸۴۴ نوائے ظفر

۴۱۲ ۱۸۶۷ تا ۱۸۵۷ چراغ سحر

کلام غالب کی تاریخی تدوین

دیوان غالب کی تاریخی تدوین میں غالب سے پہلے قدم مہتمی، ذوالفقار علی خان، جہانگیر خان
کی اشاعت کے وقت غالب کے ۱۰ اشعار جو دو درجہ کی شہرت سے لے کر تھے، بعد کے اشعار جو
کے ترتیب دیئے مہتمی صاحب نے یہ ترتیب صحیح سمجھا۔ وہ ان کے متاثرہ ترقی سے، لیکن ہر
میں انہیں بہت پیچیدگیوں میں نہیں آتے۔ کیونکہ دیوان کے مرتبہ بہت وقت لگے ہیں
دیوان غالب کا ایک ایسا قسمی نسخہ تھا جس کی تاریخ تصنیف بہت مشتبہ ہے۔ غرض کہ اس
اس نسخہ میں جو دو تھے، وہ تاریخ تصنیف سے پہلے ہی لکھے گئے تھے۔ اور یہ نسخہ شاعری کی طرف
ہیں کی تھی جو اشعار اس نسخہ کے قلم میں ہیں۔ اور ان اشعار سے پہلے مہتمی صاحب
پیشہ کی طرف تھے۔ وہ شاعر ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ ہے، اور یہ نسخہ شاعر کی
موجودہ کتاب نمبر ۱۰ کے مطابق ہے۔ اس نسخہ میں یہ ہے، اور یہ نسخہ شاعر کی ہے۔

حضرت مولانا ابوبکر محمد علی شاہ

دہلی، ۱۰۰۰ھ

مہتمی صاحب نے یہ نسخہ کیا تھا؟ یہ نسخہ شاعر کی ہے۔ اس نسخہ میں یہ ہے، اور یہ نسخہ شاعر کی ہے۔

مشہور غزل بھی قلمی نسخہ میں درج ہے۔ لیکن مطبوعہ نسخہ میں اس کی نسبت کوئی اشارہ نہیں۔

مدت ہوئی ہے یا رکوہماں کئے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس کے علاوہ مفتی صاحب نے قلمی نسخہ کے اشعار جس ترتیب سے شایع کئے ہیں۔ اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ قلمی نسخہ کے حاشیہ کے اشعار بھی تاریخ کتابت یعنی ۱۲۳۱ھ ہجری سے پہلے کے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ ان اشعار کا متن میں درج نہ ہونا ہی اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ دیوان کی کتابت کے وقت تو یہ اشعار موجود نہیں تھے۔ بلکہ بعد میں لکھ گئے۔

مفتی انوار الحق کے بعد دیوان غالب کی ترتیب کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر ریاض الطیف نے کی۔ ان کا مرتبہ دیوان غالب باوجودیکہ ۱۹۲۶ء میں ہی اس کی اشاعت کے وعدے ہوئے تھے۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ لیکن جن اصولوں پر وہ اسے مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تشریح انہوں نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں کر دی ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے شاعر کے اردو کلام کو تفصیل ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ دورِ ادل ۱۸۱۱ - ۱۸۲۱

۲۔ دورِ ثانی ۱۸۲۲ - ۱۸۳۲

۳۔ دورِ ثالث ۱۸۳۲ - ۱۸۵۵

۴۔ دورِ رابع ۱۸۵۶ - ۱۸۶۹

بظاہر تو یہ ترتیب نہایت معقول ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر شاعر کے کلام کو ان چار حصوں میں ترتیب دیکر مطالعہ کیا جائے تو اس سے شاعر کی ذہنی نشوونما سمجھنے میں بہت مدد ملنی چاہئے۔ لیکن اگر اس ترتیب کو بغور دیکھیں تو اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً چوتھے دور میں جس میں شاعر کا ۱۱ برس کا کلام درج ہے۔ مرزا غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اردو میں لکھی ہیں جنہیں قوت سے ان کا کلام کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو نظموں سے ایک شاعرانہ دور ترتیب نہیں دیا

یا سکتا۔ اور انہیں سامنے رکھ کر جو تاج ہم افذ کر گئے۔ وہ بیشتر قیاس آرائی پر مبنی ہوئے۔
 علاوہ انہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس تاریخی ترتیب کا ذریعہ جو پالی نسخہ کے علاوہ اور کئی نہیں۔
 بیشک اس نسخہ کے حاشیہ کے اشعار کو انہوں نے ترتیب دیکر ہماری واقفیت میں اضافہ کیا لیکن اس
 میں بھی انکی رائے کہ جو اشعار قلمی نسخہ کے متن یا حاشیہ میں درج نہیں وہ سب ۱۲۲۰ء کے بعد کی ہیں
 غلط ہے۔ زبابطیفی خان شفیع نے گلشن ینار ۱۲۳۰ء میں لکھا۔ اور اسکا ایک قلمی نسخہ جس کی زبانی
 مصطفیٰ خان نے خود تصحیح کی تھی۔ پرنس میوزیم میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کے اور اورانی
 کا انتخاب دیا ہے۔ اور اس میں کئی ایسی غزلیں موجود ہیں جو ہوپالی نسخہ کے حاشیہ پر موجود نہیں۔ لیکن
 کا انتخاب دیا ہے۔ ۱۸۳۲ء سے بعد لکھی گئی ہوتیں۔ اور انکا انتخاب تصنیف اپنے ہزارے میں درج
 ظاہر ہے۔ کہ اگر وہ ۱۸۳۲ء سے بعد لکھی گئی ہوتیں۔ تو قیامت کھاتے۔ دو قیامت کھاتے میں جن ۱۲۲۰ء سے پہلے
 اسی طرح قلمی نثر کی تعریف میں مرزا نے جو قطعہ لکھا ہے۔ دو قیامت کھاتے میں جن ۱۲۲۰ء سے پہلے
 کیا۔ لیکن قلمی نسخہ کے حاشیہ پر اس کا کوئی اندراج نہیں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کے انتخاب
 ہے۔ کہ جو اشعار نسخہ جو پالی کے حاشیہ پر ہیں۔ وہ ۱۲۲۰ء سے پہلے کے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ
 افذ نہیں ہو سکتا۔ کہ قلمی نسخہ ۱۲۳۰ء تک کے تمام اشعار کی اصل بارداشت ہے۔ اور جو اشعار
 میں نہیں وہ ۱۲۳۰ء سے ۱۲۴۰ء میں قیسہ اور کے زمانے کے ہونے چاہئیں۔
 ان سب باتوں کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کلام غالب کے علاوہ
 کسی اصول پر مضبوطی کو نہ کی جلی خصوصاً علمی و مستند ہے۔ اور سب سے پہلے انہوں نے شاعروں
 کلام کو تاریخی ترتیب سے معائنہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جس قدر ڈاکٹر صاحب
 تنقید اور ریسرچ کے اصولوں سے واقفیت ہے۔ اتنی غالب کی تصنیفات میں۔ اور انکی کتابوں
 انہوں نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں جنہیں ان میں سے کسی کتاب کی علمی وقعت کو بہت دور ہے۔
 مثلاً وہ اپنی کتاب کے سفر ۱۰ پر غالب کے شعروں کو لکھتے ہیں۔ وہ ۱۲۲۰ء کے نزدیک ہر فرد کے
 میں مشغول رہا۔ لیکن ان کا ذریعہ کتاب ۱۲۳۰ء سے پہلے کے تمام اشعار کو ایک ناکام طریقہ
 وجہ ملی خاص کو انہوں نے ۱۲۳۰ء سے پہلے کے تمام اشعار کو ایک ناکام طریقہ

رواں داشتہ ام و ہنوز از رسیدش نشان نیافتہ ام۔“ ان کا ایک اور خط مارچ ۱۸۵۲ء کے کچھ در بعد مولوی رحیم علی خاں کو لکھا گیا۔ اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے اور لکھا ہے۔ ”بعد حمد و نعت و منقبت و مدح والی عصر و سبب تا لیف کتاب کہ آئین نامہ طراز ان ہنگامہ است۔ از کشور کشایاں تانصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام۔ باقی فزاد است۔“ چونکہ مرزا نے کبھی بھی ہمایوں کے بعد کے حالات نہیں لکھے۔ ظاہر ہے کہ مہر نیمروز ۱۸۵۲ء تک ہی مکمل ہو گئی ہوگی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ نواب ضیاء الدین کی تاریخ طباعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۵ء میں چھپ چکی تھی۔ اور اس کا ایک نسخہ ۱۸۵۵ء کا چھپا ہوا برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ۱۸۵۹ء کے بعد کی اہم تصنیف مرزا کی فارسی شہزادی ابرگر بار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سرسید نے ۱۸۴۵ء میں آثار الصنادید لکھی۔ تو یہ شہزادی لکھی جا چکی تھی۔ چنانچہ سرسید لکھتے ہیں۔ ”... اور ایک شہزادی مشتعل اور بغزوات ... کے اگرچہ ہنوز ناتمام ہے۔ لیکن میر بھی قریب پندرہ سولہ جڑوں کے ہو چکی ہے“ علاوہ ازیں اس شہزادی کے کئی اشعار مہر نیمروز میں انتخاب ہو چکے ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ۱۸۵۵ء کے قریب منتخب ہوا۔ لیکن مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں جو تذکرۃ الشعراء اردو دہلی سے شایع کیا۔ اس میں وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”... اور ایک دیوان اردو انکی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء کے چھپا تھا۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔“ اسی ضمن میں انہوں نے انتخاب کے متعلق بھی ذکر کیا ہے۔ کہ مرزا نے ایک ضخیم دیوان کو ”منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان بنالیا ہے۔“ ظاہر ہے کہ یہ دیوان جو ۱۸۴۳ء میں چھپ کر شایع ہوا۔ اس سے بہت پہلے منتخب ہوا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ انتخاب مرزا کے سفر کلکتہ ۱۸۲۷ء سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ اور اسکا ویسا چھپ بھی لکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ مرزا نے کلکتہ سے حکیم احسن اللہ خاں کو جو خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں ”سطرے چند کہ بدیہی علی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ ...“

اس کے علاوہ مرزا کی فارسی نظم و نثر کا ایک شیش قیمت مجموعہ بانک پور لائبریری میں
 موجود ہے۔ جس کی تاریخ کتابت تو ۱۱۵۵ ہجری ورنج ہے لیکن جزیقیاً ۱۲۵۴ء ہجری یعنی ۱۸۳۸ء
 میں لکھا گیا۔ اس میں بھی دیوان ریختہ کا فارسی دیباچہ موجود ہے۔ اس زبردست شہادت کی بنا پر ہم
 خیال میں یہ یقین کرنا خطرے سے خالی ہو گا کہ مرزا کا پہلا اردو دیوان ۱۲۵۵ ہجری سے پہلے ہی
 مرتب ہو چکا تھا۔ اور اسکے چند سال بعد یعنی ۱۲۵۸ء سے پہلے انہوں نے اس میں سے مشکل اور
 کم پایہ اشعار نکال کر منتخب دیوان ریختہ مرتب کر دیا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے بیشتر فارسی شعر کے
 اردو اشعار بہت کم ان کا پہلا اردو دیوان ۱۲۵۸ء یا ۱۲۵۹ء میں سید المطابع
 میں شائع ہوا۔ اس مطبوعہ نسخہ کی ایک جلد اب بھی خان بہادر سید ابوالمحمد کلکتہ کی بیٹ کے پاس ہے
 میں شائع ہونے والے اسکے چند سال بعد دربار کے تعلقات کی وجہ سے مرزا کو اردو کی طرف زیادہ توجہ دینی
 معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲۵۹ء میں جب انہوں نے نواب رام پور کی تحریف میں ایک قصیدہ لکھا تو اسکے
 ساتھ انہوں نے اپنے اس زمانے تک لکھے ہوئے اردو کلام کا مجموعہ بھیجا۔ یہ مجموعہ متداول
 دیوان کی بنیاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلام غالب کا پہلا انتخاب نہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مرزا کی فارسی تصنیفات کو بہت اہمیت نہیں دی۔
 انہوں نے غالب کے اردو کلام کو چار دوروں میں تقسیم کرنی کوشش کی ہے۔ لیکن فارسی کلام
 کو بالکل بالائے طاق رکھا ہے۔ اب ایک شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کا سب سے بڑا فائدہ
 ہے کہ اس سے شاعر کی طبعی نشو و نما اور اس کی ذہنی تربیت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور خیالات کا
 تغیر و تبدل دکھانے سے شاعر کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اب مرزا کی ذہنی حالت
 اور ان کے خیالات کا اظہار فقط ان کا اردو کلام ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی انہوں نے شعر لکھے
 ہیں۔ جو تعداد میں اردو سے کہیں زیادہ ہیں۔ اسکے علاوہ شاعرانہ نقطہ نظر سے بھی مرزا اپنے فارسی

کلام کو اردو دیوان سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے تھے۔
 نیست نقصان یکد جز دست از کلام فارسی
 کان و ذہن ہر گز نہ خست از فرہنگ غنیت

غالب نامہ

فارسی میں تابہ بینی نقشہاے رنگ رنگ بگڑ راز مجموعہ اردو کہ بیرنگ نیست
فارسی میں تابہ بینی کا نذر اقلیم خیال مانی وارثرنگ و آن سخت از رنگ نیست
کے درخشاں جوہر آئینہ تابا قیست رنگ صیقلی آئینہ ام ایں جوہر ایں رنگ نیست
اور یہ بھی صحیح ہے کہ مرزا کے اردو دیوان میں یا تو انکی طفولیت اور عنفوان شباب کے چند سالوں
کا کلام ہے یا درباری دوز کے اشعار ہیں جن کا بیشتر حصہ فرمائشاً لکھا گیا۔ اب اگر اس کلام
کو مرزا کا حاصل زندگی سمجھا جائے۔ تو اس سے غالب کی ذہنیت یا اس کے کمال شعر گوئی کی
نسبت جو نتائج اخذ ہونگے۔ وہ غیر مکمل مواد پر مبنی اور غلط ہونگے۔

اس اصول کی کمی کے علاوہ فارسی سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے
تصنیفات غالب کی تعین میں کئی فاش غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً یہ ایک مسئلہ اصولی ہے۔ کہ کسی خط
کی تاریخ تحریر اس کے مصنفوں سے معین ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۱۸
پر جو مثال اسے واضح کرنے کیلئے دی ہے۔ وہ خود غلط ہے۔ وہ مرزا کے دو خطوط کا ذکر کرتے ہوئے
جوش ۱۸۸۷ کے ہیں اور جنہیں غالب کے اردو دیوان کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں ”اسی طرح نواب ضیاء الدین کا
کا وہ خط بھی جو بلا تاریخ ہے۔ (جب کا اقتباس درج ذیل ہے) اسی سال سے منسوب ہونا چاہئے“

”جناب قبلہ و کعبہ۔ آپ کو دیوان دینے میں کیوں تاخیر ہے۔۔۔۔۔“

ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو تمہاری

تعریف کا قصیدہ اہل عالم پہ بکھلیں۔ تمہارے بھائی کی شرب کی نظر سے گزرے“

اس خط کی تاریخ تحریر معین نہایت آسان نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ خط اردو دیوان کے متعلق نہیں۔
جوش ۱۸۸۷ میں میر لکھا گیا۔ بلکہ فارسی کلیات کے متعلق ہے۔ کیونکہ نہ تو اردو دیوان میں نواب ضیاء الدین
کی تعریف کا قصیدہ ہے اور نہ انکے ”بھائی (نواب امین الدین) کی تعریف کی شرب“ یہ دو چیزیں فارسی
کلیات میں ہیں۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے فارسی کلیات کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر
مندرجہ بالا دو جملات کی بنا پر ہم نے فیصلہ کیا کہ غالب کے فارسی کلام کو وہی اہمیت دی جائے۔

غالب

جو اسے شاعر خود و متاقتا اور تاریخی تدوین میں کلیات فارسی کا انتخاب بھی شامل ہوا۔ اس تدوین کیلئے مراد کی فراہمی میں ہمیں کئی برس لگے۔ ہمیں زیادہ محنت اسلئے کرنی پڑی۔ کہ غالب کے اردو فارسی کلام کے قلمی اور ابتدائی مطبوعہ نسخوں کی نسبت جہاں تدوین کے ماخذ ہیں کسی کو واقفیت نہیں تھی۔ ہم اپنی تحقیقات کے آغاز میں ہی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایک مغز لگو شاعر کے کلام کو قیاسات اور اندازوں شہادت کی بنا پر تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ ترتیب اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب اسکی بنا فارسی شہادت پر ہو۔ ہمیں اس مطلب کیلئے برٹش میوزیم میں کشن بیچار کا جو قلمی نسخہ ہے وہ بہت مفید پڑا۔ پھر مغرام پور کے دیوان میں مشتمل کا لکھا ہوا اردو دیوان اور فارسی دیوان (مطبوعہ مشتمل) کی قلمی نقل ملی۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ دیوان غالب کے سب سے پہلے مطبوعہ نسخہ کا مرزا طاجر بالا خیر ہیں خان بیاد سید ابو محمد لکھنؤ میں حیات کی عنایت فرمائی تہ دستیاب ہوا۔ اس مطبوعہ میں مراد دیوان اور دوسرے بہت کم شریں۔ ونداری دوسرے اشعار ہیں اور اشعار کی تعداد قریباً اسی ہے جو اس دیوان اردو میں تھی جس کا خاتمہ ۱۲۵۵ھ یعنی ۱۸۳۹ء میں نواب ضیاء الدین نے لکھا اور دیوان اردو میں فقط غزلیات کے اشعار ۱۵۹۸ میں قصائد و قطعات وغیرہ کے سپر مسٹر اور جب نواب ضیاء الدین نے مشتمل میں دیوان غالب اشاعت کیلئے مرتب کیا اور وہ خاتمہ لکھا جو آٹا نا لکھا ہوا میں چھپ گیا ہے۔ تو اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ مرتب ہونیکے چار برس قبل نہ چھپ سکا۔ اور جب شایع ہوا تو اس میں چند اشعار کی کمی بیشی ہوئی۔ جس طرح غالب نے مشتمل میں متبادل اردو دیوان سے نواب ضیاء الدین کا خاتمہ حذف کر دیا تھا۔ اور اس مطبوعہ نسخہ میں بھی اسے شایع نہ کیا یہ نسخہ سید الطالع دہلی میں مشتمل میں جمع ہوا۔ اور عدد سے پہلے ایک دفعہ اور کا پورا ہوا جو دیوان خان بیاد سید ابو محمد کے نسخہ کی نسبت سے اس سے سرورق غالب ہے۔ لیکن کتاب فارسی خدمت اشعار کی تعداد اور دوسری وجوہات کی بنا پر یقیناً باہر جاتا ہے کہ یہ نسخہ با حقائق ایسی قلمی نقل سے ہے جو مشتمل میں نواب ضیاء الدین نے مرتب کیا۔ اور جو مشتمل میں سید الطالع خان ہم نے قلمی نسخہ کشن بیچار دیوان غالب (نسخہ سید بڑی) اور نسخہ سید یحییٰ کی مدد سے روانہ کیا

اور فارسی دیوان کے ان نسخوں کی مدد سے جو ہمیں رام پور ملے یا جنہیں ہم نے بانکے پور لاہوری میں تلاش کیا۔ کلام غالب کو مندرجہ ذیل چار دوروں میں ترتیب دیا۔

۱۔ پہلا دور ۱۸۲۱ تک

اس دور میں وہ اشعار ہیں جو ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے۔ اور جو نسخہ حمید یہ کے متن میں موجود ہیں۔
۲۔ دوسرا دور ۱۸۲۱ ۱۸۳۲ تک

اس دور میں وہ غزلیات ہیں جو نسخہ حمید یہ کے متن میں موجود نہیں۔ لیکن دیوان غالب (مملوکہ سید بوجہ) میں چھپ چکی ہیں۔ یہ دیوان غالب ۱۸۳۲ء میں چھپا تھا اور بظاہر تو ہمیں دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۲ء تک گنتا چاہئے تھا لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کر نیکی کئی وجوہات ہیں کہ اس دیوان کے قریباً سبھی اشعار ۱۸۳۲ء تک لکھے جا چکے تھے۔

(۱) غالب ۱۸۳۲ء کے قریب یا اس سے پہلے اردو شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ اور اس زمانے سے دربار کیساتھ تعلقات استوار ہونے تک انہوں نے فارسی شری لکھے۔ وہ خود ایک خط میں شمس الامراء نائب الی حیدر آباد کو لکھتے ہیں: ”در آغاز ریختہ گفتے وہ اردو زبان غزل سرا بودے۔ تا بہ پاری زبان ذوقی سخن یافت و از ان ادبی عنوان اندیشہ بر تافت۔ دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد و اس را گلدستہ طاق نسیاں کرد۔ کما بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است۔“ اس سے یہ امر قریب قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا نے جو اشعار ۱۸۳۲ء میں لکھے ان میں آئندہ دس سالوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہو گا۔

(۲) نواب ضیاء الدین نے اردو دیوان کیلئے جو خاتمہ ۱۸۳۲ء میں لکھا۔ اس میں دیوان غالب کے تمام اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ بتائی ہے۔ اور نسخہ ابو محمد میں بھی اشعار کی تعداد قریباً اتنی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۲ء تک چار سال میں اردو اشعار میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔

(۳) اس دور میں ہمارے شمار کے مطابق ۵۸ غزلیات ہیں۔ ان میں سے کئی غزلیات ایسی ہیں جو بھوپالی تلمی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں اور بقول ڈاکٹر لطیف ۱۸۳۲ء سے پہلے کی ہیں نصف کے قریب غزلیات کا انتخاب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشن بیجار میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا۔ اور

ایت ابتدائی قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ان دونوں ذرائع سے ہم ۲۲ غزلوں کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۱۸۲۲ء سے پہلے کی ہیں۔ باقی غزلوں اور قطعات میں سے شاید ایک آدھ اس سال سے بعد کی ہو لیکن بہت سی ایسی ہوئیں جو گلشن بیخار کی تصنیف سے پہلے لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن جبکہ انتخاب شیفٹ اپنے مختصر سے تذکرہ میں درج نہ کر سکے۔ مثلاً چٹنی ذلی کی تعریف میں جو قطعہ ہے۔ وہ یقیناً ۱۸۲۲ء سے پہلے لکھا ہے لیکن گلشن بیخار میں اسکا کوئی شعر منتخب نہیں ہوا۔

(۴) مرزا غالباً اپنا دیوان کلکتہ جانے سے پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے حکیم حسن خاں کو جو فائز خط لکھا ہے۔ اس میں انہیں دیوان رکھنے کا دیا جا چھوٹے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دیوان کو اشاعت کیلئے مرتب کرتے وقت مرزا نے یہ دیا جو درج کیا گیا تو اسکی تاریخ تحریر ۲۴ ربیعہ ۱۲۴۰ھ لکھی یعنی آغاز ۱۸۲۳ء ان وجوہات کی بنا پر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ نسخہ ابو محمد کے اشعار کو ۱۸۲۲ء سے پہلے کے لکھا جائے بیشک اس میں دس ہیں اشعار ایسے ہونگے جو اس سال کے بعد لکھے گئے اور غالباً اشعار کا معتد بہ حصہ ۱۸۲۶ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ لیکن جو شہادت ہمیں دستیاب ہوئی ہے۔ اسکی بنا پر ۱۸۲۸ء کو درج کر دیا گیا کا اختتامی سال تسلیم کرنا موزوں ترین ہے۔ اور اس میں غلطی کا بہت کم امکان ہے۔

۳۔ تیسرا دور ۱۸۲۶..... ۱۸۴۷

اسے ہم نے تین مختصر دوروں میں ترتیب دیا ہے۔ (ا) ۱۸۲۶..... ۱۸۳۰ یعنی وہ اشعار جو مرزا نے سفر کلکتہ کے دوران میں لکھے۔ (ب) ۱۸۳۰..... ۱۸۳۷ یعنی وہ اشعار جو میخانہ آرزو مرتب کرنے تک لکھے جا چکے تھے۔ (ج) ۱۸۳۷..... ۱۸۴۷ یعنی وہ باقی ماندہ اشعار جو دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۷ء کی رام پور والی نقل میں موجود ہیں۔

۴۔ چوتھا دور ۱۸۴۴..... ۱۸۵۵

اس میں وہ اشعار ہیں جو نسخہ ابو محمد میں نہیں۔ لیکن رام پور عابریہ کے اس قلمی نسخہ میں ہیں جو مرزا نے نواب یوسف علی خاں کو ۱۸۴۷ء میں رام پور بھیجا۔ غدر میں اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے تھے۔ ان سے پانچواں دور شاعری ترتیب دیا گیا

غالب نامہ

تھا۔ لیکن دو تین اردو غزلوں اور چند فارسی قصائد سے ایک علیحدہ وعدہ شاعری ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں حقیقتاً یہ زمانہ مرزا کی اردو نشر کا تھا۔ اور مرزا نے جو اردو فارسی اشعار اس زمانے میں لکھے چونکہ وہ زبان اور بیان کے لحاظ سے چوتھے دور کے اشعار سے مشابہ ہیں سمجھنے انہیں بھی چوتھے دور میں باقی اشعار سے علیحدہ درج کر دیا ہے۔

مضمون ختم کر بیسے پہلے ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں کہ مکمل شرح کلام غالب کی جن غزلوں کو مولانا نیاز اور دوسرے اہل قلم نے غالب کے نتائج طبع مان لیا۔ انہیں کلام غالب ماننے میں یہ بہت تامل ہے۔ ہماری وجوہات بالاحتمار یہ ہیں۔

(۱) جس بیاض سے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں اُسکے مالک اُرتب اور کاتب کی نسبت کوئی قابل ذکر واقفیت نہیں۔ تاریخ کتابت اس پر درج نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ ”کوئی صاحبِ کتب نہ تھا، انکو مرزا نے وقت بے وقت رام پور میں یہ غزلیں کھولیں

اور وہ انکے پاس رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں بھی اس میں شریک کر دی جائیں گی۔“ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ رام پور فقط دو دفعہ گئے۔ ایک دفعہ آخر جنوری ۱۸۶۰ء

میں اور دوسری دفعہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں۔ دوسری دفعہ جب مرزا رام پور گئے۔ انکی عمر اڑسٹھ سال

سے زیادہ تھی۔ اور صحت کی حالت ناگفتہ بہ۔ اسی حالت میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے ۲۵ ایسی غزلیں

جو دقیق خیالات سے پر ہیں بکھی ہوئی عبارت ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ غزلیں فرمائش بھی نہیں لکھی

لکھیں اور ان میں نواب رام پور کی طرف کسی جگہ اشارہ نہیں۔ مرزا نے بہادر شاہ کی فرمائش پر جو

غزلیں لکھیں، ان میں بادشاہ کا ذکر اکثر آ جاتا ہے اب اگر مرزا نے یہ غزلیں بامرِ محبوبی فرمائے دئے

رام پور کے ارشاد پر لکھیں۔ تو کم از کم ایک غزل میں نواب کا ذکر ہوتا۔ غالب نے پہلا سفر ۱۸۶۰ء

میں کیا اس سفر کے دوران میں انہوں نے نواب منیا الدین کی فرمائش پر نواب صاحب رام پور سے

اپنے دیوان کا نسخہ بیکر نواب منیا الدین کے پاس بھیجا۔ واپسی پر میرٹھ اترے تو منشی ممتاز علی نے

انہیں دیوان کے ایک نسخہ کیئے کہا۔ اور جیسا کہ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے انہوں نے نواب منیا الدین

غالب نامہ

کے پاس سے یہ نسخہ لیکر میرٹھ بھیج دیا۔ اب اگر ان ۲۵ غزلوں کی نسبت یہ بیان درست ہے کہ وہ دیوان کی طباعت کے وقت شامل ہوئی تھیں تو یہ بات بہت عجیب ہے کہ اس فیصلہ کے منظور ہونے بعد جب مرزا میرٹھ اپنے دیوان کی اشاعت کا فیصلہ کرتے ہیں، تو اپنے تازہ ترین کلام کو اس میں شامل نہیں کرتے۔

(۳) مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے اردو خطوط میں لیکن وہ رام پور کے سفر میں غالب کے شریک نہ تھے۔ غالب انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں: قلیلہ و کعبہ، فقیر یا در کا ب ہے۔ یہ شنبہ چہار شنبہ ان دونوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہو چکا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں بنگال کا پتہ لکھنا ضروری نہیں، شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ خاصہ یہ کہ اگر شاکر صاحب رام پور ہوتے تو انہیں مرزا کے نام (اور شہر کے نام سے) خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مولوی عبدالرزاق کے سوا اور کسی شاکر کا غالب کے خطوط میں کوئی ذکر نہیں۔

(۴) اس زمانے میں مرزا نے جو غزلیں لکھیں، ان کے خیالات سادہ اور زبان صاف ہے مثلاً:

نہیں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی

تم پر عیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

لیکن مرزا نے جو اشعار شایع کئے ہیں ان میں سے اکثر دقیق اور مرزائی اس زمانے کے شعری شاعری کے خلاف ہیں۔ جو اشعار سادہ ہیں، وہ بھی مرزا کی طرز شاعری کی ان خصوصیات سے ملتا ہیں جو ان کے اس زمانے کے اشعار کا مایہ ادا کیا ہے۔ ایک شعر تو ایسا ہے کہ بڑھنے سے میرا دل آسدا کلا مطلع جبر مرزا نے اپنا شخص بدل دیا تھا، یاد آتا ہے۔

وفا جفا کی طبع بدلا دہوتی آئی ہے ازل کے دن سے یہ اسے یاد ہوتی آئی ہے

(۵) مرزا کے علاوہ غالب بنگال اور دہلی کے شعرا و شاعری میں غالب تھا۔ گریبا خ کے سارے اشعار غالب کے ہوں ممکن ہے کہ وہ کسی اور شاعر کے ہوں، غالب کے یقیناً نہیں۔ جسے ان وجوہات کی بنا پر ان غیر مطبوعہ غزلیوں کو غالب کے اشعار نہیں لانا اور ان کا انتخاب غالب کی شاعری کے کسی دور میں نہیں دیا۔

خند

۱۸۰۶ء تا ۱۸۲۱ء

{ رنگِ بیدل
بادہٴ نیمِ رس }

مرزبیدل میں رنجیت لکھنا
اسد خاں قیامت ہے
غالب

دیباچه دیوان نخبه

مقام شہیم آشنایاں را صلوات نہاد انجمن نشیناں را مرزہ کہ نختہ از سالمان مجرہ گردانی آمادہ ودانے
 از عود ہندی دست بہم دادہ است نہ چو بہائے سنگ شمع خورہ بہنجار نا طبعی شکستہ بے اندام
 ترا شنیدہ بلکہ بہ تیر شگافتہ بکار و ریز ریز کردہ بسوہاں خرا شنیدہ ایدوں نفس گداختگی شوق بجستہ آتش
 پاری است نہ آتشی کہ در گلخنہائے ہند افسردہ و خاموش و از کف خاکستر برگ خوش سیہ پوش بینی
 چہ بردے مسلم است تا پایکی با ستخوان مرودہ تا مار شکستن و از دیوانگی پرشتہ شمع مزار کشتہ آوختن بر آئینہ
 بدل گداختن نیز و وزیم افروختن را نشاید رخ آتش بیض بر افروزندہ و آتش پرست را بہ بادہ فراہ ہم
 در آتش سوزندہ نیک میداند کہ پند ہندہ در ہوائے آں خشنندہ آرد نعل و آتش است کہ چشم روشنی
 ہو شنگ از سنگ بیرون تافتہ و در ایوان لہر اسب نشو و نما یافتہ جسٹن را فروغ است و لالہ راز نگ
 و بخ را چشم و کدہ را چراغ بخشنہ یزدان در دل بحسن بر افروز را سپاسم کہ مژدہ آں آتش تاباک
 در خاکستر خویش یافتہ بجاکاو سیدہ شتافتہ ام داد نفس و مہ بران بر نہادہ بود کہ در کم مایہ و ز کاراں
 آئینہ فراہم تواند آمد کہ مجرہ را فرو و شنائی چراغ و رایجہ عود و ابال سٹناسائی و مانع تواند بخشید ہمسما
 نگارندہ این نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوان نخبہ برگرد آرد و در سنای دیوان فارسی
 بخیر و استغاضہ کمال این فریورن پس تراوے خویش نشیند امید کہ سخن ہر این سخن و ستائے پر آگندہ
 ابائے را کہ خاسج ازین اوراق یا ہند از آثار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ نشناسد و چامہ گرد آرد و اور
 ستائش و کوشش آں اشعار ہمزون و ماخوذ نسکالند یا رب این بچے ہستی ناشنیدہ و از نیستی بہ پیدائی نرسیدہ
 یعنی نقش بھیمہ آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف بہ غالب مخلص است
 چنان کہ اکبر آبادی مولود و دہلوی مسکن است فرجام کار بخشی مدفن نیز یاد -
 تمام شد بست و چہارم شہر ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ

غالب

تشریح

غالب نے جو اشعار ابتدائے شعر گوئی سے ۲۵ برس کی عمر تک لکھے، انہیں سنیہ و حصول میں تقسیم کر دیا ہے۔ صفحہ ۱۷۱ سے صفحہ ۱۹۱ تک ان غزلوں کے اشعار و ردج ہیں جنہیں ردج اول میں ترتیب کرتے وقت مصنف نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جو غالباً نہایت ابتدائی شعر گوئی کا غرہ ہیں ان میں سے پہلے ایسے اشعار کا انتخاب کر دیا ہے جو شاعر کی ابتدائی طرز شاعری کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور ادبی نقطہ نظر سے بھی بے پایہ نہیں۔ صفحہ ۱۹۲ سے صفحہ ۲۰۲ تک ان غزلیات اور قصائد کا انتخاب ہے جنہیں شاعر نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا تھا۔ اور جن کے بیشتر اشعار منتخب دیوانِ بخشہ میں جوہان ان صفحات میں جب کسی شعر کے مقابل نام ردج ہو تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ ردیف اور تانیہ کی وحدت کی وجہ سے یہ شعرائی اشعار کے ساتھ درج ہے۔ یہ شعرا اس دور کا نہیں بلکہ بعدی شاعر تھے اضافہ کیا ہے جہاں ۲۱۱ لکھا ہو وہاں مصرعہ اول یا مصرعہ ثانی بعد کا ہو گا۔ اسی طرح جہاں کسی شعر کے مقابل نام ردج ہو وہاں اس سے پہلے دو کا شعر تھا چنانچہ جہاں ایک غزل کے چند اشعار لکھے گئے ہیں وہ اس دور کے نہیں بلکہ بعدی شاعر کے بعدی اشعار کہئے ہیں۔ عموماً ایسے اشعار و ردج اول کے اور یہ حصے میں پیش کیے گئے ہیں تاکہ سناوے دیوان ترتیب کرتے وقت (یعنی دوسرے دور میں) اضافہ کیا۔

رنگبیدل غزل

بشغل انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
کے کر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں
عیادتِ ہائے طعنِ آلودِ یاراں نہرِ قافل ہے
کے ہے حسنِ خروباں پردہ میں شاکلِ اپنی
فنا کو عشق ہے بہ قصداں حیرت پرستاراں
سرتارِ نظر ہے رشتہٴ تسبیح کو کب ہا
نہ نکلے خشتِ مثلِ استخوانِ بیرونِ قالب ہا
رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا
کہ ہے تہ بندِ یی خطِ سبزہٴ خطِ درترب لب ہا
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو دپا بندِ مطلب ہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے

نہاں ہیں نالہٴ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

وحشی بن صیاد نے ہم مخوروں کو کیا رام کیا
مہرِ بجائے نامہ لگائی برب یکٹا مہ رساں
رشتہٴ چاکِ حبیبِ دریدہ صرف تماشاں دم کیا
قاتلِ تمکینِ سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیر و سری سے ہنسنے آند

ماہ کو در تسبیح کو اکب جائے نشینِ امام کیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا
زمین کو صفحہٴ گلشنِ بنیاخوں چکانی نے
نہیں ہے کف لبِ نازک یہ فرطِ نشہ سے
عروجِ ناامیدی چشمِ زخمِ چرخ کی جانے
کہ طوقِ قمری از ہر حلقہٴ زنجیر ہے پیدا
چمنِ بالیدنی نازِ دمِ نچیر ہے پیدا
لطفِ ہائے جوشِ حسن کا سرِ شیر ہے پیدا
بہارِ بے خزاں از آءِ بے تاثیر ہے پیدا

اسد جس شوق سے قہقہے پیش فرما ہوں زندہ ہیں
جراحت لئے دل سے جو ہر شمشیر ہے پیدا

بہ ہر نامہ جو بد سے گل پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہووانہ مجھ سے بجز درد حاصل صیاد
بسان اشک گرفتار چشم دام رہا
دل و جگر تو فرقت سے چلے خاک
وے ہنوز خیال وصال خام رہا
شکست رنگ کی لائی سحر شبِ نسل
یہ زلف یار کا افسانہ ناتمام رہا
دکان تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کرتش خیال میں دوسوں کا اڑدہا رہا

نہ پوچھ مال شبِ درد زہر کا غالب
خیال زلفِ درخ دوست صبح و شام کا

ہے بہاراں میں غزاں پر در خیالِ عنذلیب
رنگ گل آتشکدہ ت زیرِ بالِ عنذلیب
عمر میری ہو گئی صربِ ہزارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے اہ وصالِ عنذلیب
منع مت کرتش کی ہلکے پرستش سے کہ ہے
بادِ نظار و گلشنِ حلالِ عنذلیب
ہے اگر معروف بروقت اگر کارِ اسد
اے شبِ پروانہ و ریزہ وصالِ عنذلیب

ناخنِ دغلِ عزیزاں یکساں ہے نقبِ دن
بسانِ قلمِ سخنِ تنہائیِ عبث
عملِ پیانہِ فرصت ہے بردشِ مہاب
دعوتِ دریا نشی رشتہ پیمائیِ عبث
اے اسد بیجا ہے نذرِ سجدہ عرضِ نیاز
عالمِ تقسیم میں یہ دعوتِ آرائیِ عبث

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سونے دشت

بنگیا تقلید سے میری یہ سووائی عبت !

قطع سفر ہستی و آرام فنا پہنچ رہا نہیں، بیشمار از غرضش یا پہنچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی ہستی نہیں جز بستنِ میانِ وفا پہنچ
تمثال گذار آئینہ ہے عبرتِ بنش نظارہ تجیرِ چمنستانِ بقا پہنچ
گلزارِ میدان، شہرستانِ میدان فرصت تیش و حوصلہ نشو و نما پہنچ
آہنگِ عدم نالہ بہ کہہ سار گروہ ہے بستی میں نہیں شوخیِ ایجاد صدا پہنچ
کس بات پہ مغرور ہے اسے عجزِ تنہا سامانِ دعا و حشت تاثرِ دعا پہنچ

آہنگِ افسد میں نہیں جز نغمہٴ بیدل

عالم ہمہ افسانہٴ مازاد و مائید

توسیتِ فطرت اور خیالِ بسا بلند اے طفلِ خودِ معاملہٴ قفسِ عصا بلند
ویرانیِ جز آد و رفتِ نفس نہیں ہے کوچہا سے نے میں غبارِ صدا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست میزگانِ باز ماندہ سے دستِ دعا بلند
موقوف کیجئے یہ تکلفِ نگاریاں ہوتا ہے ورنہ شعلہٴ رنگِ حنا بلند
ہے دلبری کی نگارِ احباب و یک نگاہ کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیادِ قد جانفزا افسد

در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

رُگِ گردنِ خطِ پیمانہ بے گلِ تاجند
عینکِ چشمِ جنوںِ حلقہٗ رکاکلِ تاجند
بزبانِ عرضِ فسونِ ہوسِ گلِ تاجند
شعِ و گلِ تاسکے و پروانہ و بلبلِ تاجند
شرحِ برخوردِ غلیظِ ہائے تحملِ تاجند
ناکسِ آئینہٗ نازِ توکلِ تاجند

حسرت و شگ و پائے تحملِ تاجند
کو کب بختِ بجزِ رونینِ پُرودہ نہیں
چشمِ بے خوںِ دل و دلِ ہی از جوشِ نگاہ
بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادہ پر گل
نالہ و امِ ہوسِ دردِ اسیری معلوم
ساوگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا

— اسدی خستہ گرفتارِ دو عالمِ ابد نام
مشکلِ آساں کن یک غلقِ بقا لایِ تاجند

ہوئی ہے لغزشِ پاکستِ زباں فریاد
ز دستِ مشتِ پردِ خارِ آشیاں فریاد
برنگِ نے ہے نہالِ دہراستخوانِ فریاد
برئی ہے محو بہ تقریبِ امتحانِ فریاد
جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد
ندستِ شیشہٗ و پہلے دوستاں فریاد

بہ کامِ دل کریں کس طرحِ گڑھاں فریاد
کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی
فرازشِ نفسِ آشنا کہاں و ورنہ
تغافلِ آئینہٗ دارِ خوشیِ دل ہے
ہلاکِ پیچریِ غم و وجودِ عدم
جوابِ نگدِ یہائے دشمنانِ بہت

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اسے شاہِ بیکساں فریاد

بنشِ سبِ غیظِ جنوںِ نوبہارِ
دلِ دگرگازِ نالہ بہ کاہِ آبیاد

قاتلِ بجزمِ ناندول از زخمِ درگداز
شمشیرِ آبدار و نگاہِ آبدار تر
ہے کسوتِ عریضِ تغافلِ کمالِ حسن
چشمِ سیہِ مبرکِ نگہِ سوگوار تر
اے چرخِ خاکِ بر سرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر
آئینہ دارِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیمابِ بیقار و اسدِ بیقدر تر

گو بیا بانِ تمنا و کجا جولانِ عجز
آبلے پاسے ہیں یاں رفتارِ کوہِ نازِ عجز
ہو قبولِ کم نگاہی تحفہِ اہلِ نیاز
اے دلِ واسے جانِ نازِ لے دینے ایمانِ عجز
یوسفِ انتخابِ بد گمانیہاں کے حسن
یاں ہجومِ عجز سے تاسجد ہے جولانِ عجز
حسنِ کوغیچوں سے ہے پوشیدہ چہی لے ناز
عشق نے واکِ ہر یک غارت سے نازِ گانِ عجز
وہ جہاں مسند نشین بارگاہِ ناز ہو
قامتِ خوباں ہے محرابِ نیازِ گانِ عجز
بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت لے اسد
گرد و باد اس راہ کا ہے عقدہِ پیمانِ عجز

نہ بندھا تھا بے قدم نقشِ دلِ مور ہنوز
تب سے ہے یاں دہنِ یار کا ند کوہِ ہنوز
صد تجلی کہ ہے صرفِ جبینِ غمِ بہت
پیرہن میں ہے غبارِ شذرِ طورِ ہنوز
پایہ از آبلہ راہِ طلبِ مے میں ہوا
ہاتھ آیا نہیں یک دانہ انگورِ ہنوز
گلِ ٹھلے، غنچے چٹکنے لگے، اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمورِ ہنوز
اے اسد، تیر گئی بختِ سیہ ظاہر ہے

نظر آتی نہیں صبح شب بھور ہنوز

حاصل دہلی ہے عمر کوتاہ اور بس
وقت عرض عقدہ لائے متصل تہا نفس
تیز تر ہوتا ہے ختم تندریاں عجز سے
ہے رگ رنگ فسان تیغ شعلہ خاروں
سختی راہ محبت لہجہ فصل غیر ہے
پیچ و تاب بادہ ہے یاں جو تہی غس
اے اسد ہم خود اسیر رنگ بونے بلغ ہیں

ظاہر اسیا و ناداں ہے گرفتار ہوس

رشت الفت میں مال گشتگاں مجھوں بس
پیچ و تاب بادہ ہے غلط کف افسوں بس
ہے تصویر میں نہاں سرمایہ صد گلستاں
کاسہ زانو ہے مجھ کو بیضہ طافوں بس
غیر ہے، غیر از دود و شوق، دیر خواستن
راہ صحرائے حرم میں تہ جرس ناؤں بس

یک جہاں گل تخیل مشق شگفتن ہے اسد

غنیہ خاطر افسردگی مانوس و بس

شان اشک چشم سے دھو دیں ہزار داغ
دیتا ہے دوزخوں گل و شبنم بہار داغ
روں اعتماد نامہ و خط کا، ہو لہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سبب اعتبار داغ
یتے ہیں نیست جلوہ خورشید سے لہاں
ویمہ استخوان سے مٹ گئے بے اعتبار داغ

وقت خیال جو احسن بیت اسد

دھندائے ہے مجھے دوجوں لاسز داغ

بہوں کو دوست کرتے ہے بار داغ
ستہ زبان پاسبان غار سیر دیوار داغ

کون آیا جو چین بیتیاب استقبال ہے
کون گل سے ضعف خاموشی بل کہہ سکے
جنش موج صبا ہے شوخی رفتارِ باغ
نے زبانِ غنچہ گویا نے زبانِ خارِ باغ

جوش گل کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسد
زیرِ مشق شعر ہے نقش از پے احضارِ باغ

عسّی مہریاں ہے شفا ریزِ یک طرف
سجیدگی ہے ایک طرف رنج کو کہن
درد آفریں ہے طبعِ الم خیزِ یک طرف
خوابِ گراں خسرو پر دینِ یک طرف
خرمن ببادِ دادہ دعوے ہیں، ہو سو ہو
ہر موبدن پر شہیرِ پرواز ہے مجھے
ہم اک طرف ہیں برقی شریزِ یک طرف
بتیابی دل تپش انگیزِ یک طرف

یک جانب اے اسد شبِ فرقت کا ہم جو
دامِ ہوس ہے ڈلفِ دلاویزِ یک طرف

بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال
بسکہ ہے اصل و میدِ نہا غبار
نما فلاں : نقصان سے پیٹ ہے کمال
نور سے تیرے ہے اسکی روشنی
بے نہالِ شکوہ ریحساں سفال
ورنہ ہے خورشید یکدست سوال

ہو جو بلبلِ پیرو فکرِ اسد
غنچہ منقار گل ہو زیرِ بال

از انجا کہ حسرت کش یار ہیں ہم
رسیدن گلِ باغ و اماندگی ہے
رقیب تمنائے دیدار ہیں ہم
عبثِ محفلِ آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہونہ معزول شعلہ وروں
تغافل کی نگاہ وحشت شناسی
تماشائے گلشن، تمنائے چدین
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں
کہ ضبطِ تپش سے شرکار ہیں ہم
نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم
بہارِ آفرینا، گنہگار ہیں ہم
نگاہِ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی

ہجومِ تنہا سے لاچار ہیں ہم
ہیں خارِ راہ، جو ہر تیغِ عس تمام
یک پرزدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام
مرغابِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام
دُر تارہوں کو چہ گردی بازارِ عشق سے
اے بالِ اضطراب کہاں تک فسرِ دگی
گذرا جواشیاں کا تصور بوقتِ بند
کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسد

اب کی پیار کا یونہی گذرا برس تمام
شامِ خیال زلف سے صبحِ امیدہ ہوں
تبہجِ اشکائے زمراں چکیدہ ہوں
میں عنندیبِ گلشن نا آفسیدہ ہوں
مضربِ تارائے گلوئے بریدہ ہوں
سودائے عشق سے دمِ سر و کشیدہ ہوں
کی متصل ستارہ شمار میں غمِ صرغ
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہِ سنج
دیتا ہوں شتکماں کو سخن سے سریش

جوں برے گل ہوں گرمیہ گرا نیا بہشتِ زر
لیکن اسد، بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں
میں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب
خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں
لے بے خبر! میں نغمہ چنگ خمیدہ ہوں
مانند موج آب زبان بریدہ ہوں
یار پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یار ہیں کس غیب کا بخت رسیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفت بتان (مسد)

یعنی کہ بندہ بہ درم ناخریدہ ہوں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
طلسمِ ستی دل آنسوئے حجومِ رشک
برنگِ جاوہرِ سر کوئے یار رکھتے ہیں
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں
ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں
ہولے گریہ بیباک ضبط سے تسبیح

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب

بسانِ دشتِ دل پر غبار رکھتے ہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی و گیر نہیں
ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدر و منزلت
دامنِ تمناں آپ آئینہ سے تر نہیں
عدلت آباد و مدفون قیمتِ گوہر نہیں
لحنتِ شیشہ بشکستہ جز نشتر نہیں
عاجزی سے ظاہر تہ کوئی برتر نہیں
ہے فلک بالانشینِ خیمِ گردیدنی
کب تلک تھیمے (مسد) بہائے تفتہ پر زبان

طاقتِ لب تشنگی اے ساقی کوثر نہیں

ق ہے صفیہ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخِ دزمیں یک درقِ گردانہ
بلکے میں نذل افندہ گئی باوہ کشاں
موج کے مثلِ خطِ جام ہے ہر جامانہ
راہش دل ہے زباں کو سببِ گفت میں
جے سخنِ رُزد امانِ ضمیر افشانہ
دلی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فردِ جہاں میں درقِ ناخواندہ

حیفِ کمالی اہلِ ریا پر غالب

یعنی ہیں ماندہ ز آئینہ سوراخ

شکوہ و شکر کوثر ہم و امید کا سبھ
خاندانِ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سبھ
وحشتِ درد کیسی ہے اثر اس قدر نہیں
رشتہ عو فیض کو نالہ تار سا سبھ
گاہ بہ خلد امید دار کہ بہ تجسیمِ ہیناک
شرچہ خراب کی یاد ہے کلفتِ ناسا
اے بہ سرابِ حُسنِ خلق تشنہ سخی آسمان
شوقِ سوسنل نہ کرنا ز کو انتخاب
ہے خطِ عجزِ ماد تو اقبال در پس آوند
تجہ یہ سیاق گفت کو کچھ نہ سمجھتا
نغمہ ہے محو سازِ زرہ، نشہ ہے بہ نیاز
رزد تمام نازِ زرہ، خلق کو پار
نے سرورِ برگ آرزوئے رہ و رہیم نشہ
دل و جان خلق تر ہو بھی آشنا

غرض پاک ہے بد، نفسِ ماضی مدد

نوشے کر آئینہ آسید سجد کو خوں بہا سبھ

بندِ شیم از انتظار خوش فطال ہے زور ہے
یک قلمِ شاخِ گل ز زُسنِ عصالے کو

ہے عجب مردوں کو غفلت لئے اہل ہر پر
سبزہ جوں انگشت حیرت دروہان کو رہے
حسرت آباد جہاں میں ہے الم علم آفریں
نوحہ اگیا خانہ زاو نالہ رنجور ہے
کیا کروں غمہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار
دزد اگر ہو خانگی، تو پاسباں محبوب ہے

ہے دلاں تکلیف عرض ہے دماغی اور اسد
یاں صریح قلم مجھ کو نالہ رنجور ہے

یہ سر نوشت میں میری ہے، اشک افشانی
کہ موج آب ہے ہر ایک چین پیشانی
لب نگار میں آئینہ دیکھو آب حیات
بہ گری سکندر ہے، محو حیرانی
کہوں وہ مصرع برجستہ، وصف قامت میں
کہ سرو ہونہ سکے اسکا مصراع ثانی
اسد نے کثرت دلہائے خلق سے جانا

کہ زلف یار ہے، مجموعہ پریشانی

ہوا جب حسن کم، خط بر عذار سادہ آتا ہے
کہ بعد از صاف سے، سراغ میں در باد آتا ہے
محیط دہریں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک احباب آسا، شکستہ مادہ آتا ہے
دیا عشق میں جاتا ہے، جو سوداگری سامان
متاع زندگانی، بہ غارت دادہ آتا ہے

اسد دار ستگاں با وصف سامان بے تعلق ہیں

صنوبر گلستاں میں با دل آزادہ آتا ہے !

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدد و حبل نے
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدد
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

جنوں فرودہ تمکلیں ہے، کاش عہد وفا
گدازِ حوصلہ کو پاس آبرو جانے
زباں سے عرضِ تنائے خاموشی معلوم
مگر وہ خانہ بر اندازِ گفتگو جانے

میچ کشتہ الفت پر علی خاں ہے
کہ جو اسلہ تیش نبض آرزو جانے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلان! آغازِ کار آئینہ انجام ہے
بسکہ ترے جلوہ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بیتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے
کیا کمالِ عشقِ نقص آباد گیتی میں ملے
پچھلی لائے تصویریاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقی خورشیدِ مجلسِ فروز!

واں اسلہ! تارِ شعاعِ مہرِ خطِ جام ہے

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستانِ داکرے

تار و پودِ فرشِ مغلِ پنبہ میسا کرے

یک درے بر روئے رحمتِ بستہ و پیشِ جہت

نا امید سی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے

نا توانی سے نہیں سرورِ گریبانی، اسلہ

ہوں مرا یا یک قلمِ تسلیم، جو مولا کرے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جامِ بھوکھو بھوکھو کیا

آسماں سے بادِ گلِ فامِ گوہر سا کرے

۴

بہ زمین ضبط ہے آئینہ بندی گوھر وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشم پریم ہے
اگر نہ ہووے رگ خواب صرف شیرازہ تمام دفتر ربطو مزاج برہم ہے

اسد بہ ناز کی طبع آرزو انصاف

کہ ایک وہم ضعیف و غم و عالم ہے

تا چند ناز مسجد و تہ خانہ کھینچے جوں شمع دل بہ غلوتِ جانانہ کھینچے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو آج اُسکے حریفانہ کھینچے

ہے ذوقِ گریہ، عزمِ سفر کچھ اسد

رختِ جنوں سبیل بہ ویرانہ کھینچے

کاشانہ ہستی کہ بر انداختنی ہے یاں سوختنی چارہ گر ساختنی ہے

ہے شعلہ شمشیر فنا حوصلہ افکار لے دارِ تمنا! سپہ انداختنی ہے

ہے سادگیِ ذہن تمنائے تماشا

جائے کہ اسد رنگِ چمن باغی ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے کہ خاموشی کو ہے پیرایہ بیاں تجھ سے

فردگی میں ہے فریادِ بید لال تجھ سے چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

طراوتِ سحر ایجادِی اثر، ایک سو بہارِ نالہ و رنگینیِ نغماتِ تجھ سے

نیازِ پردہِ اظہارِ خود پرستی ہے جبینِ سجدہ فشاں تجھے آستانِ تجھ سے

یہاں جوئی رحمت کی سنگرِ تقرب وفائے حوصلہ و رنجِ امتحانِ تجھ سے

غالب نامہ

اسد! بہ موسم گل در طلسم کنج قفس
 خرام تجھے سے، صبا تجھے سے، گلستاں تجھے
 بخش یار مہریاں، عیش طرب کا ہے نشاں
 دل سے اٹھے ہے جو غبار اگر دسواں باغ ہے
 شعر کی فکر کو اسد! چاہئے ہے دل و دماغ!
 عذر کہ یہ فرودہ دل بے دل و بے دماغ ہے

خدا یا دل کہاں تک دن بصدِ نخ و تعب کاٹے
 خم گیسو ہوش شیر سیہ تاب، اور شب کاٹے
 کریں گر قدرِ اشک ویدہ عاشق، خود آریاں
 صدف دندان گوہر سے، بہ حسرت اپنے لب کاٹے
 دریغا وہ مریضِ غم، کہ فرطِ ناتوانی سے
 بہ قدرِ یک نفس جاوہ، بہ صدِ نخ و تعب کاٹے
 یقین ہے آدمی کو دستگاہ فقر حاصل ہو
 دم تیغ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے
 اسد مجھ میں ہے اسکے بوسہ پاکی کہاں جرات
 کہ میں نے دست دیا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

جُعتا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتشِ غم
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
جام ہر ذرہ ہے سرشارِ قیمت مجھ سے
ہزار قافلہ آرزو بیا باں مرگ
ہر ایک داغ جگر آفتابِ محشر ہو
اب اس سے ربط کر دل جو بہت تنگ ہو
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگا ہے مجھ
ہنوز محفلِ حسرت بہ دوش خود رانی
جس طرف سے آئے ہیں آخراؤ ہر ہی حبا ئینگے
مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم بہمیدہ ہے

جنت
مٹا ہے دہلیزِ عالم میرا دل
نہیں کہے کوئی کہ میں جاں
آسان بکھنی کرستی ہیں قوتیں
لوگ مٹل دگر نہ کیوں مٹل
مٹل

بانہ نیم رس

غزلت

نقش و یاد ہی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
کا و کا و سخت جانہائے تنہائی نہ پوچھ

جذبہ بے اختیار شوق و یکھا چاہئے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دارم شنیدن جب قدر چاہے بچھلے
مدعا غنقا ہے اپنے عالم تقصیر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موتے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شمار سبجہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا
تماشا ہے بیک کف بردن جدول پسند آیا
بہ فیض بیدلی نو میدی جاوید آساں ہے
کشائش کوہ مارا عقدہ مشکل پسند آیا

ہو اے سیرِ گل آئینہ بے مہرِ قاتل کہ اندازِ سخن غلطی را اہلِ پسند آیا
جراحتِ تحفہ الماس ارمغانِ خونِ جگرِ بدیہ
مبارکباد اسلحہ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرانگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا
آشفگی نے نقشِ سوید کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دور تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سہ تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر کس کو داغِ منتِ گفت و شنود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں تنگ و جود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبقِ ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا، اور پود تھا

تیشے بغیر مرنے کا کوہن اسلحہ
برگشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہونہ وینگے ہم دن از پرِ پایا دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدد پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزایا درو کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزایا
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب رہنے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا
سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا
ناکبازیِ امید، کارِ خسانہِ طفلی یاس کو دو عالم سے لبِ بخندہ و پایا

غنجِ پھر لگا کھلنے آج پہنے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
پہنے بارٹا ڈھونڈا، تم نے بارٹا پایا
دوستدار دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم

آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی غریاں نکلا
سلفِ جلوہ سرشار ہے ہر وہ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا
بوسے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
زخم نے وا دے دی، تنگی دل کی یارب
تیر ہی سینہ بسمل سے پر افشاں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکان نکلا
دل حسرت زدہ تھا، مابعدِ لذت و درد
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا
نقی نو آموزِ فنا، ہمت و شوارِ پسند
سختِ شکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شورا اٹھایا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفان نکلا

دہریں نقش و فادِ وجہِ تعلق نہ ہوا
بے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہوا
سبزہ خط سے ترا کا کل سریش نہوا
یہ زہِ دہی، ریف دم افغی نہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاقہ نہوا
وہ سنگِ مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا
دل گزر گاہِ خیال سے دسا غریب نہوا
گر نفس جاوے سر منزلِ تقوی نہوا

ہوں تے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی اگر کبھی
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
گوش منت کش گلابِ نک نسل نہوا
ہمنے چاہا تھا کہ مر جائیں اسودہ بھی نہوا

مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب

ناتوانی سے حریفِ دم عیسے نہ ہوا

جب بتقریب سفر یار نے محفلِ باندھا
اہلِ بنیش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز
تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا
پاس و امید نے یک عریضہ میدان مانگا
یار نے تنگنی شوق کے مضمون چاہے
عجزِ ہمت نے طلسمِ دل سائل باندھا
ہمنے دل کھوکے دریا کو بھی ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب

ساز پر رشتہ پئے نعمتِ بیدل باندھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
نہ ہو حسن تماشا دوستِ بیوفائی کا
بخول غلطیدہ صدر رنگِ دعویٰ پارسائی کا
بہ ہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
نہ ہو حسن تماشا دوستِ بیوفائی کا
بخول غلطیدہ صدر رنگِ دعویٰ پارسائی کا
بہ ہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
چراغِ خانہ درویش ہے کاسہ گدائی کا
رہا ماند خونِ بے گتہ حقِ آشنائی کا
عدم تک بیوفائی چاہے تیری بیوفائی کا
مٹا جس سے تقاضا شکوہِ بیدست و پائی کا
نہ مارا جائے بھیرم، قاتلِ تیری گردن پر
وہاں بہت پیغاراہ جو انجیسِ رسوائی
تملے زباں محوِ سپاس بے زبانی ہے

غالب نامہ

وہی اک بات جو یہاں نفس و انجمن گل ہے چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنجیں نوالی کا
نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب محقر لکھ دے

کہ حسرتِ شیخ ہیں، عرضِ سہاگے جدائی کا

شبِ غمارِ شرقِ ساقی، رختِ نازِ اندازہ تھا تا محیطِ باد، صورتِ خانہٴ شیرازہ تھا
یکتہ لم و حشت سے دریں دفترِ امکان کھلا باد، اجڑائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشتِ خواہمہائے یسلی کون ہے؟ خانہٴ مجنونِ صحرِ اگر دے بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن دستِ مہجورِ حنا، رخسارِ رہنِ غازہ تھا

نالہٴ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد

یادِ گارِ نالہٴ اک دیوان بے شیرازہ تھا

وہ مری چینِ جہاں سے غمِ نہاں سمجھا راہِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا
ایک الفِ بیش نہیں، صیقلِ آئینہٴ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جبے کے گریبان سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر، مت پوچھ اس قدر تنگ ہوا دل، کہ میں نہ ڈال سمجھا
ہمنے وحشتِ کدہٴ بزمِ جہاں میں جوں شمع شعلہٴ عشق کو اپنا سروِ سامان سمجھا
تھا گریزاں مژدہٴ یار سے دلِ تادمِ مرگ دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا
عجوبے اپنے یہ جاننا کہ وہ بد خو ہو گا نفعِ خس سے پیشِ شعلہٴ سوزاں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خسران رنج پہ ہر قطرہٴ عرقِ دیدہٴ حیراں سمجھا

دل دیا جانئے کیوں اُسکو وفادار آسدا

غلطی کی، کہ جو کا غیرِ مسلمان سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
مگر ستمزدہ ہوں فوق خامہ فرسا کا
مجھے دماغ نہیں خنسدہ ٹٹے پیجا کا
مری نگاہ میں ہے جمع و فروع دریا کا

دل اسکرپٹ ہے ہی ناز و احاسے دے بیٹھے
خانے پائے خزاں ہے، بہار اترت ہی
ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد لستہ

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش و نیا کا
کرتے ہے ہر بن مو کام چٹم بیٹا کا
جنا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
دیکھی وفا کے فرست رنج و نشا و دہر
موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

تو راجہ تو نے آئینہ تمثال وار تھا
خمیازہ یک و راز می عمر خسار تھا
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا
خون بجز و دیت مرثگان یار تھا

جاں داد و ہوائے سیر بگذار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا

غالب نامہ

سراپا رہی عشتی و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور فوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساتی خمارِ شہ کامی بھی جو تو دریا سے ہے تو میں خمیازہ ہوں حاصل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ نوحہ اسے سخن ہے خامہ بیدل کا

لب خشک و تشنگی مردگاں کا زیارت کدہ ہوں دل آزدِ بگاں کا
سراپا یک آئینہ دارِ شکستن ارادہ ہوں یک عالمِ افسردگاں کا
ہمہ ناامیدی بہم بدگانی میں دل ہوں فریب و فاحورِ دگاں کا

بصورتِ تکلف ، بمعنی تا سرف

اسد میں تبسم ہوں پیرِ مردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تیش در بھی دور تھا اک گھر میں مختصر سا بیا باں ضدِ دور تھا
اے واسے غفلتِ نگہ شوق ورنہ یاں ہر پارہ سنگِ سختِ دل کوہِ طور تھا
درسِ تیش ہے برق کو اب اُسکے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا
آئینہ دیکھ اپنا سامنہ بے کے رہ گئے صاحبِ کورل نہ دینے پہ کتنا غور تھا
قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے اسکی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِ نئے انتظار

پر دانہ تجائی شمعِ ظہور تھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داری سگلی جہاں ساتی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری

لطف بے کثافت جلوہ چیرا کر نہیں سکتی
چمن زنگار سے آئینہ باوہساری کا
اندلس سا غرض تسلیم ہو گردش تو گرد و غمی
کہ ننگ فہم مستان ہے گلہ بدروز گاری کا

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانہ صبا نہیں طرہ گسیاہ کا
بزم قدح سے عیش تمنانہ رکھ کہ رنگ
عینہ زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا
جاں در ہوا کے یک نفس گروہ اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بے سیر ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل اس نشاط سے باتا ہوں میں کہ ہے
پیرنگ نیال زخم سے دامن نگاہ کا

خود پرستی سے ہے باہم و گردنا آشنا
بیکسی سیری شریک آئینہ تیرا آشنا
رابط یک شیرازہ دشت میں ایسا ہے بار
سبز بیکانہ صبا آوارہ گل نا آشنا
وزہ وزہ سا غرضناشنہ نیرنگ ہے
گردش مجنوں بہ چٹنگ لائے میں آشنا

رنگ کہتا ہے کہ اس کا غیر سے انداز ہے
عقل آہتی ہے کہ وہ بے ہر س کا آشنا
شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز
وزہ بھراؤ سنگاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل جوشی کہ ہو
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنج رنگ ہمدگر نہ رہنا چاہئے

میرا زانو منس اور آئینہ تیرا آشنا

ایک درجہ زمین نہیں بیکار باغ کا
بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
یاں جاوہ بھی فقیہ ہے لالے کے داغ کا
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایام کا
تازہ نہیں ہے نشہ فکری سخن مجھے
یہ میکہ خراب ہے مے کے سراغ کا
بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار
باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل
ابریہا رخسکہ کس کے داغ کا

بلبل کے کاروبار پہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے داغ کا

سوار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے

پر کیا کریں کہ دل ہی عدم ہے فراغ کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
آدمی کو بھی میسر نہیں آساں ہونا
وائے دیرانگی شوق کہ ہر دم بھکو
درود یواستہ ٹپکے ہے بیاہاں ہونا
جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
آپ جانا اور مراد آپ ہی حیران ہونا
عیدِ نگارہ ہے شمشیر کا عسریاں ہونا
جبر آئینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا
تو ہوا اور آپ بعد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ قتل گہر اہل تمنامت پوچھ
رے گئے ناک میں ہم داغِ منائے شباب

عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا
کی مرے قتل کے بعد اُسے جفا سے توبہ
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ ٹکداں ہوں
ہائے اُس زودِ پشیمان کا پشیمان ہوں
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

گر نہ اندوہ شبِ فرقت بسیاں ہو جائیگا
زہرِ گرا یا سیا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
بے تکلف داغِ مہرِ دہاں ہو جائیگا
پر تو مہتابِ سیلِ خاماں ہو جائیگا
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
شعلہِ خس میں جیسے خوں گ ہیں نہاں ہو جائیگا
دوستیِ ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
سبکے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحان ہو جائیگا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
ہر گلِ نر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا
ہر گلِ نر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا
وائے گر میرا ترا انصافِ محشر میں نہر
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ داں ہو جائیگا

پھر مجھے دید و تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

عذروا ماندگی اے حسرتِ دل
سادگی ہائے تنہا، یعنی
کوئی دیرانی سی دیرانی ہے
آہ وہ جراتِ نسیا دہاں
میں نے مجھوں پہ روکپن میں اسد
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
دشنت کو دیکھئے گھر یاد آیا
دل سے تنگ آئے جگر یاد آیا
سگٹ ٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیا اپنی رضواں سے لڑائی ہوگی
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ گر یاد آیا

تو دوست کسی کا بھی ستم نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ بھانے
ترقیوں، بانڈازہ ہمت ہے ازل سے
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قریار کا عام
میں سادہ دل، آذر دگی یاد سے خوش نہیں
دریائے معاصی، تنگ آتی ہوا خشک
اوروں پہ ہے وہ نعلیم، مجھ پر نہ ہوا تھا
خورشیدِ بہروز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گھر نہ ہوا تھا
میں مقصدِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا
یعنی اسبقِ شوقِ لکڑ نہ ہوا تھا
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسد داغِ جگر نے مجھے نہیں

آتشِ کدہ جاگیرِ سمد نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ غلوتِ ناموس تھا
رشتہ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ فوس تھا
کیا کہوں بیمارِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک اگتی ہے حنا

۴
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پاؤس تھا
گلشن میں بندوبستِ برنگِ گرے آج م
آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغاں کے ساتھ
قمری کا طوقِ حلقہٴ بیرونِ در ہے آج
اے عافیت کنارہ کراے انتظامِ پیل
تارِ نفس کندِ شکارِ اثر ہے آج
دورِ اوقتا دو چینِ منکر ہے اندھا
سیلابِ گریہ درپے دیوار و درہِ آج
مرغِ خیالِ ببلِ بے بال و پر ہے آج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمی سبھی تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خارِ مرے آئینے سے جبر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائی وصال نہیں
اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرر کھینچ
تجھے بہانہٴ راحت ہے انتظارِ ایدل
کیا ہے اس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
بدیمِ غمزہ ادا کر حق و دیعتِ ناز
نیام پر دہ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبانے آتشِ نہاں
بروئے سفوفِ کبابِ دلِ مسند کھینچ
تری طرف ہے چہرستِ نظارہٴ نرس
بکوریِ دل و چشمِ رقیبِ ساغر کھینچ

خمارِ منت ساقی، اگر یہی ہے آسلا
دلِ گداختہ کے میکدہ میں ساغرِ کھینچ

نکاح شوق کو ہیں بال و پر و دیوار
کہ ہو گئے مرے دیوار و در و دیوار
گئے ہیں چند قدم پیشتر و دیوار
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
کہ ہیں دکان متاعِ نظر و دیوار
کہ گرہ پڑے نہ مرے پاؤں پر و دیوار
ہوئے خدا و دیوار پر در و دیوار
کہ ناچتے ہیں پڑے سرسبز و دیوار
میشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر و دیوار

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر و دیوار
و فوراً شک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ بار
ہوئی ہے کس قدر ارنائی سے جلوہ
جو ہے تجھے سرسودائے انتظار تو آ
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
وہ آراء - ہمایہ میں تو سایہ سے
نہ پرچہ بخودی عیش مقدمِ سیلاب
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
نہ کہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں

حریفِ رازِ محبت مگر و دیوار

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خاں بیابان پر
سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زغال پر
کہ جنوں لاسم الف کھتا تھا دیوارِ ہستان پر
جو گر صبح کرتے پارہ لائے دل لکھداں پر

رزاقے مراد ز دست مہر و خشاں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے ماں جو غلامِ آملی
فنا تعلیم و دین بخودی ہوں اس زمانہ سے
ذراغت کس قدر مستحق تھے تشریفِ مہر سے

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا
مجھے اب دیکھ کر ایشیق آلودہ یاد آیا
کہ شپتِ چشم سے جسکے نہ ہوئے مہر عنوان پر
کہ فرقت میں تری آتش بستی تھی گلستاں پر
قیامت اک ہوا اُسے تند ہے خاکِ شہیاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کی باقی رہا ہوگا

نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہوا اگر اُسے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گرمیاں پر

بزرگ کا غزا آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی
میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ کھتا ہے
ہزار آئینہ دل باندھا ہے بالِ یک پندین پر
شعلِ مہر سے تہمت نگ کی چشمِ روزن پر
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر
اُس کا سہل ہے کس انداز کا قاتل سو کہتا ہے

جنوں کی دستگیری کس سو ہو گر ہو نہ غریانی
فلک سے بھوکیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
متاعِ بردہ کو سمجھ ہوئے ہیں قرضِ ہزن پر

فنا کو سوئیپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغِ طالع خاشاک ہے موقوفِ گلخن پر

حریفِ مطلب مشکل نہیں فسوںِ نیاں
نہ ہو بہ ہرزہ بیا باں فور و دہم وجود
دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز
ہمنوز تیرے تصور میں ہے نشیبِ فراز
کہ دیکھے آئینہ انتظار کو پرواز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پھر دماغ کہاں

غالب نامہ

ہجوم فکر سے دل، مثل موج لرزے ہے ث کہ شیشہ نازک صہبائے آبگینہ
ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوئے جلوہ

نہ پوچھو وسعت میخانہ جنوں غالب

جہاں یہ کاسنہ گروں ہے ایک خاک انداز

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آراشِ شمشیرِ سہم کا کل میں اور اندیشہائے دور و دراز
لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی ہم ہیں اور رازِ کسے سینہ گدا
ہوں گر فتارِ الفتِ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پروا
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے نازِ بھینچوں، بجائے حسرتِ نا
نہیں دل میں مے وہ قطرہ خون جس ت مڑکاں ہوئی نہو گلب
اے ترا جلوہ یک تسلیم انگیز اے ترا ظلم سرسبز انداز
تو ہوا جلوہ گر، مسبارک ہو ریزشِ حجبہ جبینِ نیل
مجھ کو پرچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو عزیز ا

امداد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغ، وہ رنہ شاہد باز

رُخِ نکار سے ہے سوزِ جاوہرِ آبی شمع ہوئی ہے آتشِ گلِ آبِ زندگا
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی

کرے ہے صرف بہ ایلکے شعلہ قصہ تمام
غم اُس کو حسرتِ پرواز کا ہے اے شعلہ
ترے خیال سے روح اہتراز کرتی ہے
نشاطِ داغِ غم عشق کی بہار نہ پرچھ

بہ طرزِ اہل فنا ہے فنا نہ خوانی شمع
ترے لرزے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
بجلوہ یزنی باد و بہرِ فشنائی شمع
شگفتگی ہے شہیدِ گل خزانِ شمع

جلتے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع

نامہ بھی لکھتے ہیں تو بختِ غبارِ حیف
بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداغِ ہوش
بیش از نفسِ تنہا کے کرم نے وفانہ کی
تھی میرے ہی جلانے کو لے آہ شعلہ ریز

رکھتے ہیں مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف
مجبوریاں تنگ ہوئے اے اختیار حیف
تھا محملِ نگاہ بہ دوشِ شرار حیف
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شدار حیف

جھلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جلیگے
اے نامِ سامی نفسِ شعلہ بار حیف

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پڑانک
گردِ راہِ یار ہے سا انِ نازِ زخمِ دل
شورِ جلال تھا کنارِ بحرِ یکس کا کہ آج
مجھ کو ازانی ہے تجھ کو مبارک ہو جیو

کیا نہ اہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدائک
گردِ سائل ہے بزمِ موجِ دریا نمک
نالہ بلیل کا در اور خندہِ گل کا نمک

دل طلب کرتا ہے زخم اور انگلیں ہیں غنائک
چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے

غیر کی منت نہ کھینچو نکالے تو فیر درد
زخم مثل خندہ قاتل ہے سرتاپا تک
یاد ہیں غالب تھے وہ دن کہ فطر ذوق میں
زخم سے کتنا آدین پلکوں سے پتا تھا تک

آہ کو چاہئے اک سدا اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سرتاپا تک
دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے بے قطرہ یہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیگے ہم اتم کو خبر ہونے تک
پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گر مٹی بزم ہے اک قصہ شر ہونے تک
غم ہستی کا اسدا کس سے ہر جز مرگ علاج
شع ہر رنگ میں جلتی ہے عہد ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آذا دوں گیش زیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خسانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چمکے چمکے جلتے ہیں جہل شمع ماتم خسانہ ہم
باوجودیک جہاں ہنگام پیدائی نہیں
ہیں چراغین شبستان دل پروانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجہ بانہ خیال
ہیں ورق گردانی نیز نگ یک بت خانہ ہم
منعوت سے چہ نے قناعت سے یہ ترک جستجو
ہیں وبال تنکیہ گاہ بہت مردانہ ہم

دائم الجسوس میں ہیں لاکھوں تمنائیں (اسدا)

جانتے ہیں سینہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

غنچہ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
 بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مَنہ سے مجھے بتا کہ یوں
 پریش طرزِ دہری کیجئے کیا کہ پن کہے
 اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کیوں
 رات کے وقت مے پیئے، ساتھ رقیب کو لئے
 آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
 بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھے
 اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں
 میں نے کہا کہ بزمِ نازِ حیا ہے غیر سے تہی
 سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا، تو دیکھئے
 مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوشِ کس طرح
 کب مجھے کہے یار میں بہنے کی وضعِ یاد تھی
 گر تیرے دلیں ہے خیالِ دل میں شوقِ کازال
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
 دیکھنے میری بخود ہی پہلنے لگی ہوا کہ یوں
 آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پاکہ یوں
 موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دستِ پاکہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہر شکِ فاسی !
 گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

ورنہ ہم پھڑکیں رکھکر عذرتی ایکدن
رنگ لائیکل ہمساری فاقہ مستی ایکدن
ابن مہندی کے نصیبوں میں ہرستی ایکدن
بے صدا ہر جائے گایہ ساز ہستی ایکدن

ہم سے کھل جاؤ بوقتے پرستی ایکدن
قرض کی پیتے تھے نے یکن سمجھتے تھے کہاں
عقرۂ اوج بنائے عالم اسکاں نہو
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے
ہاتھ پاؤں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایکدن

خیابان خیابان ارم دیکھتے ہیں
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
تجھے بس تمناسات ہم دیکھتے ہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
دل آشفٹاں خال کنج و ہن کے
ترے سرو قامت سے اک تدادوم
تماشا کراے محو آئینہ داری

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشا کے اہل کرم دیکھتے ہیں

ایک چکر تہ مرے پاؤں میں نہیں
جادو غیر از نگہ ویدہ تصویر نہیں
جادو ساہ و فاجز دم شمشیر نہیں
خوش ہوں گزنا لہ زبولی کون تائیں نہیں
لذت سنگ بانداز و تقصیر نہیں

مانع وشت نور دی کوئی تدبیر نہیں
شوق اس شت میں دوڑنے بھیکو کہ جیاں
حسرت لذت آزار رہی جباتی ہے
رنج نو سیدی جادویدہ گوارا نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سراپا چا مو جائے

جب کرم نصیبِ بیا کی دستاخی دے کوئی تقصیرِ سحرِ خجابتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ تمیر نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر! برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
نشہِ رنگ سے ہے واشدِ گل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامین مست پر چھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی دامانِ گسیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب

ہم سے پیمانِ دنا باندھتے ہیں

حد سے دل اگر اندر وہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشمِ تنگ شاہِ کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی خبروں یک گوشہ دامنِ اگر آبِ بہشتِ ویا ہو
اگر وہ سرو قدِ گرمِ خرامِ نازِ آجائے
کفِ ہر خاکِ گلشنِ بھیلِ قریٰ نالہ فرسا ہو

جزدل سراغِ دردِ بدلِ خفتِ گال نہ پوچھ! آئینہ عرضِ کو خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

ہندوستان سایہ گل پائے تخت تھا
 ہر داغ تازہ یک دل داغ انتظار ہے
 ہے سبز نزار ہر درو دیوار غن سکدہ
 ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
 م م
 سامان بادشاہی وصل بتاں نہ پوچھ
 عرض فضاے سینہ درد امتحاں نہ پوچھ
 جس کی بہاریہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
 دشوار مئی رہ دستم ہر ماں نہ پوچھ
 م م
 کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل

دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

صد جلہ رو برو ہے جو مرثاں اٹھائیے
 ہستی فریب نامہ موج سدا ہے
 ہے سنگ پر بات معاش جنوں عشق
 ضبط جنوں سے ہر سر موت ترانہ خیز
 دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
 یا میرے زخم رشک کوڑھوانہ کیجئے
 طاقت کہاں کہ وید کا احساں اٹھائیے
 یک عمر ناز شوخی عنوان اٹھائیے
 یعنی ہنوز منت طفلان اٹھائیے
 یک نامہ بیٹھے تو نیستاں اٹھائیے
 اسے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
 یا پردہ تبسم پنہاں اٹھائیے

انگور سعی بے سرو پائی سے سبز ہے

غالب بدوش دل ختم ستاں اٹھائیے

ہے بریم بتاں میں سخن آرزو لبوں سے
 ہے دور تدرج وجہ پریشانی صوبہ
 زندان درمیکدہ گستاخ ہیں زابد
 تنگ آنے میں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
 یک بار نکادو خم مے میرے لبوں سے
 نہ تہار نہ ہر ناظر ان بے ادبوں سے

بیدار و فادیکھ کہ جاتی رہی آخر

مہر چنڈ مری جان کو تھار بٹ بہوں سے

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سراٹھانے کی
کھٹے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کا یارب
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
قسم بھائی ہے اس گزرنے کا غز کے جھلانے کی
مری طاقت کہ ضامن تھی تو نیکے نازاٹھانے کی
دلے مشکل ہے حکمت دل میں سو غم چھپانے کی
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی
ترا آنا نہ تھا، ظالم مگر تھید جانے کی
ہماری سادگی مٹی اتھاتی ناز پر مرنا

کہوں کیا خوبی اذ ضلع اہلئے زمان غالب

بدی کی اُنسے جس سے ہم نے کی تھی بارہائی

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی

سورہتا ہے بہ انداز چکیں دن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شورش سے آزر دہ ہم چنڈے تکلف سے

تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار حجام و اڑگوں وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے

کہیں ہو جائے جلد اے گردش گرد و بن دُوں وہ بھی
 نہ اتنا ہر شے تیغِ جفا پر نازِ نساؤ
 مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
 خیالِ مرگ کب تکیں دلِ آزر وہ کونستے
 مرے و اہم تمنا میں ہے اک صیدِ زبرد وہ بھی
 نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمد
 کہ ہو گا باعثِ افزائش دردِ دروں وہ بھی
 نظرِ راحت پہ میری کرنے وعدہ شب کے آنے کا
 کہ میری خواب بندی کے لئے ہو گا فسوں وہ بھی
 مرے دل میں ہے غالبِ شوقِ دُخل و شکوہِ جِواں
 خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

کیا تنگِ ستمِ زوگانِ کاجہان ہے
 جس میں کہ ایک بیضہِ مورا آسمان ہے
 ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
 پر تو تے آفتابِ ذرے میں جان ہے
 کی اُس نے گرم سینہ اہلِ بوس میں جا
 آوے تریوں پند کہ ٹھنڈا مکان ہے
 بیٹھا ہے جو کہ سایہ و یارِ یار میں
 فرما زو اسے شورِ ہندوستان ہے
 کیا خوب، تم نے غیر کو بوس نہیں دیا
 بس چپ رہو ہمارے کھی منہ میں زبان ہے

حالا نکہ ہے یہ سیلی خار سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پر مے کا گمان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر

غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہ بان ہے
گشت تگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے توید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرور تب غم کہاں تنک
ہر مومرے بدن پہ زبان سپاس ہے
پی جس قدر شب ماہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گر می ہی راس ہے
ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ و فاس
ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسدا
مجنوں جو مر گیا ہے تو جگل اداس ہے

گر فاشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا بکھ
دل فرو جمع و خریج زباں ہائے لال ہے
کس پر وہ میں ہے آئینہ پرواز اسے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے
ہے خدا خواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل ایہ تجھے کیا خیال ہے
وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا
دیر یا زمین کو عسقری انفعال ہے
مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف ز زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

۴

ہستی کے مت فریب میں جایو اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

کہ خاک خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے

لب تاج پہ کف بادہ جوش تشنہ لہی ہے

جنون و یاس و الم رزق مدعا طلبی ہے

حذر کرو مے دل سے کہ اسمیں گلابی ہے

نظرِ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دل حریص زیادہ

خوشادہ دل کہ سراپا طسسم پیغمبری ہو

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھو دکھو کے پوچھو

اسد یہ درد و الم بھی تو مغنم ہے کہ آخر

نہ گریہ سحری ہے نہ آفیم شہی ہے

اس سال کے حسابِ برق آفتاب ہے

بالِ تدر و جلوہ موجِ شراب ہے

جوشِ بہار جلوت کو جسکے نقاب ہے

مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کا میاب ہے

قاسد پہ مجھ کو رشکِ سواں و جراب ہے

رفتارِ عمر قطعِ ردا و اضطراب ہے

مینائے مے ہے سرو نشاطِ بہارے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں

گذرا اسدِ سرت پیغامِ یار سے

نہ بھانسنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا

باد و باد و نورشی رند الہی شہِ جہت

غافل گماں کرے ہے کرگیتِ خراب ہے

ہے آرمیدگی میں نکو ہش بجا مجھے صبح وطن ہے خندہ دندان نما مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں آنے لگی ہے نکبت گل سے حیا مجھے
کھٹنا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
تا چند پست فطرتی طبع آرزو یارب ملے بلند می دست دعا مجھے
لیکبار امتحان ہو س بھی ضرور ہے اسے جوش عشق بادہ مرو آزا مجھے
ڈھونڈے ہے اُس مغنی آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

مستانہ طے کرے ہوں رو وادی خیال

۴ تا با ز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جنوں تہمت کش تسکین نہ ہو، گر شادمانی کی

نک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش اے ہستی سے کرے کیا سعی آزاوی

ہوئی نہ نجیر موج آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیدانہ زیارت گاہ طفلان

شرار سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

نکو ہش ہے سزا فریادی بیدار دلبر کی مبادا خندہ دندان نما ہو صبح محشر کی
رگ بیلی کو خاکِ ثمت مجنوں، ریشگی بخشتے اگر بودے بجائے دانہ و مہقال فک شتر کی
پر پروانہ، بنایداد بان کشتی مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ سناغ کی

غزور لطف ساقی نشہ بیباکی مستان
 کروں بیدار فوق پر فشان کی قدرت م
 کہاں تک رسول اُسکے پیچھے کچھ بھی قیامت م
 نیم دامن عصیاں ہے طراوتِ مہج کوثر کی
 کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہر کی
 مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی
 اسد جز آب بخشیدن زور یا خضر کو کیا تھا
 دُورِ ناچشمہ حیراں میں گر کشتی سکندر کی

آہ کہ مری جان کو تیرا نہیں ہے
 دیتے ہیں جنت حیات و ہر کے بے
 گریہ نکالے ہے تری ہزم سے بھوک
 ہم سے عبث ہے ایمان بخش خاطر
 دل سے اُنھا لطف بلورہ ہائے معانی
 قتل کا میرے کیا ہے عہدِ قیاس
 طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے
 نشہ بہ اندازہ خسار نہیں ہے
 ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
 خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے
 غیر گل آئینہ ہمارا نہیں ہے
 دائے اگر عہدِ استوار نہیں ہے

تو نے قدمِ میکشی کی کھائی تے غالب
 تیری قلم کا کچھ اعتبار نہیں ہے
 ہجومِ غم سے یاں تک سرنگوئی بھٹکو حاصل ہے
 کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
 بہیل اشکِ محنتِ دل تے دامِ شکارِ مشکان کا
 غرقِ بحرِ جویاں کے نس و نسا شاکِ حاصل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
 سمجھو موت کہ پاس درو سے دیوانہ غافل ہے
 وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
 چمکنا غنچہ دل کا صدائے خندہ دل ہے
 تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفۃ بیانی مانگے
 نقش نازبت طناز بہ آغوش رقیب پائے طاؤس پے خسامہ مانی مانگے
 وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
 شعلہ آتا بسبب جگر ریشہ دوانی مانگے
 پایہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
 دیکھنا حالت مے دل کی ہم آغوشی کو وقت ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے
 ہوں سراپا ساز آہنگ کایت کچھ نہ پوچھ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھڑے تو مجھے
 کثرتِ جوہر ستم سے ہو گیا ہوں بید ماغ
 خوبرویوں نے بنایا غالب بدخو مجھے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
 خار خارِ اہم حسرت دیدار تو ہے
 شوق گلچین گلستاں تسلی نہ سہی
 ایک دن گر نہ ہوا بنم میں ساتی نہ سہی
 گر نہیں شمع سید خانہ یلی نہ سہی
 فے پرستاں زخم فے مند سے نکائے ہی بنے
 نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ محسرا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نوحہ غم ہی سہی انفسہ شادی نہ ہی
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ ہی

عشرت صحبت خروباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ ہی

گلشن کو تری صحبت از بسک خوش آئی ہے
واں کنگر استغنا ہر دم ہے بند ہی پر
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشتائی ہے
یاں نالے کو اور انا دعوائے رسائی ہے
از بسک سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جوداغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالب

حد جلوہ آئینہ یک صبح جدائی ہے

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
حیراں کئے ہوئے ہیں دل بقیدار کے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشق منکر وصل و غم ہجرت اسل

لائی نہیں رستہ میں غم روزگار کے

ہجوم تالہ حیرت عاجز عرض یک انفساں ہے

خوشی ریشہ مدنیستاں سے شمس بہ ونداں ہے

مکلف بر طرف ہے جانتاں تر لطف بدخویاں

نگاہ بے حجاب یا ریشہ تیغ عسکریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ غیبِ مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقدِ لاساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغرِ متاعِ دشتگرداں ہے
غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قسزم صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوہ جانا نہ چاہئے	فانوسِ شمع کو پر پروانہ چاہئے
ہے وصلِ ہجرِ عالمِ تمکین و مضبط میں	معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہئے
پیدا کریں دماغِ تماشا ئے سرو و گل	حسرتِ کشوں کو ساغرِ مینا نہ چاہئے
دیوانہ کمال ہیں حاملِ رازِ نہاںِ عشق	اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہئے
اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ بھی تو ہاں	شوقِ فضول و جراتِ زندانہ چاہئے
ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش	چہاں سے ہم گزر گئے، پھیانہ چاہئے
جاوے طرہ گفتگئے یار، اے اسدا	

یاں خیز فسون نہیں اگر افسانہ چاہئے

چاک کی خواہش اگر دشتِ بزمیائی کرے	صحیح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے
نیکہ گرِ چشمِ مستِ یار سے پائے شکست	موتے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت کا عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال
دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نوید یارب کتبک
آئینہ کوہ پر عرصہ گراں جانی کرے

ہر قدیم و دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میرے رفتار سے بھاگنے ہے بیاباں مجھے
غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بستان
کس قدر خانہ آئینہ ہے دیراں مجھ سے
درج عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتہ شیرازہ مژگاں مجھ سے
وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں
صورت دور و سایہ گریزاں مجھ سے
اثر آبلہ سے جاوہ صحرائے جنوں !
صورت رشتہ گورہ ہے چراغاں مجھ سے
بیکسی لمبے شب ہجر کی وحشت ہے بے
سایہ خورشید قیامت میں ہی نہاں مجھ سے
یہ خودی بستر تمہید فراغت ہو جو
پرے سائے کی طرح میرا شبستان مجھ سے
شوق و یار میں گر تو مجھے گردن مارے
توں گل شمع ہر نظارہ پریشاں مجھ سے
گردش ساغر صد جلوہ رنگیں تجھ سے
آئینہ واری یک دیدہ حیراں مجھ سے
اے اسد! دسترس وصل تمنا معلوم
کاش ہو قدرت بر حیدر دامن مجھ سے

نور گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستان مجھے

غالب نامہ

تپش سے میری وقفِ کنگش ہزار بستر ہے م م
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
سرشکِ سر پہ صحرادادہ، نور العینِ امن ہے
بہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
ابھی آتی ہے بد بائش سے اسکی زلفِ مشکیں ک

مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ میدارِ بستر ہے
دل بے دست و پا افتادہ بر خورِ بستر ہے
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشرِ تارِ بستر ہے
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہی ہو یار میں غالب

کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بسترِ خارِ بستر ہے

کرے ہے بادہ تم سے لبِ کسبِ نگِ فروغ
بجائے گردنِ سنے، نالہ دئے بلبلِ زار
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داو ملے م

خطِ پیالہ، مرا سر نگاہِ گلچیں ہے
کہ گوشِ گلِ نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

اسد ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا

مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکین ہے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارِ ب مجھے
ہے کشادِ خاطر و ابتداء درِ رہن سخن
یارِ باس آشفنگی کی داد کس سے چاہئے

سجودِ زائد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانہ مکتب مجھے
رشتکِ سائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

لے یہ دو اشعار جو دیرانِ غالب کے عام نسخوں میں ملتے ہیں نسخہ حمید یہ کے ۲۲۳ اور ۲۲۴ پر بطور غلطی اشتراک کے شائع ہوئے ہیں۔ باقی دو اشعار نسخہ حمید یہ میں موجود نہیں اور غالباً بھوپال نسخہ کی ترتیب کے بعد لکھے گئے۔

شومی طالع سے ہوں ذوقِ محاسن میں سیر
نامہ اعمال ہے تاریکی کو کب مجھے !
طبع ہے مشتاق لذت اسے حسرت کیا کرں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو طلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاوتِ مستِ مشرہ سیلی ندامت ہے
بہرِ بیچ و تاب ہوں ملکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ جزیرِ رشتہ سلامت ہے
وفا مقابلِ ودعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فضلِ گلِ قیامت ہے
نہ جانوں کیونکہ شے داغِ طعن بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی درِ طرّ ملامت ہے

اسد! بہارِ تماشا ہے گلستانِ میات

وصالِ لالہ عذارانِ سرورِ قیامت ہے

شوخیِ مضرابِ جلالِ آبِ نغمہ ہے
برگریزِ ناخنِ مطربِ بہارِ نغمہ ہے
سازِ عیشِ بیدی ہے خانہِ ویرانی مجھے
سیلِ یاں کوکبِ مدائے آبشارِ نغمہ ہے
نشہِ لاشارابِ رنگِ سازِ نامستِ طرب
شیشہِ سرورِ سبزِ جو بہارِ نغمہ ہے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کرنے بزمِ عیش و مست

داں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

خود و شبائے سستی بسکہ جائے خندہ ہے
تاشکستِ قیمتِ دہا اصدائے خندہ ہے
مرضِ نازِ شوخی و مذاںِ پراسے خندہ ہے
دعوائے جمعیتِ احبابِ جائے خندہ ہے

ہے علم میں غنچہ محو عبرتِ انجام گل
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
نقشِ عبرت در نظر با نقدِ عشرت در بساط
یک جہاں زانو تا مل در قفائے خند ہے
ورنہ دندال در ول افشرون بنائے خند ہے
دو جہاں وسعت بر قدر یک فضا ئے خند ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ شکر و نہ یاں

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خند ہے

۲

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
سر بر ہونی نہ وعدہ نصیر آزما سے عمر
عالم غبار و وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
افسردگی نہیں طرب انشاء القات
رونے سے اسے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے
تمثالِ جلوہ عرض کر اسے حسنِ کسب تک
چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وا ہوئی
بیکار بی جنوں کو ہے سر پینے کا غسل
لختِ جگر سے ہے رگ ہر خار شاخِ گل
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یا مس خیز
ناکامی نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
عرضِ سرشتِ کسے فضا ئے زمانہ تنگ
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
کب تک خیالِ طرہ بیلہ کرے کوئی
ٹاں دروین کے دل میں مگر جا کرے کوئی
آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی
آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
تا چند باغبانِ صحرایہ کرے کوئی
یہ درود نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
صحرایہ کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

ہر رنگ و خشت ہے صدفِ گہر شکست م نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کسے کوئی
 حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسل
 پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

باغِ تجھ بن گلِ تر گس سے ڈراتا ہے مجھے
 نالہ سرِ مائیہِ یک عالم و عالم کفِ خاک
 چاہوں گر سیرِ چین آنکھ دکھانا ہے مجھے
 آسماں بیفتہ قمری نظر آتا ہے مجھے
 بہ خوں نگہ ناز ستا تا ہے مجھے
 ہوں میں وہ سبزہ کہ نہ ہر آبِ گاتا ہے مجھے
 آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
 مدعا محو تماشاے شکستِ دل ہے
 باغِ پاکِ خفتانی یہ ڈراتا ہے مجھے

زندگی میں تو رہ محفل سے اٹھاتے تھے

دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گردا ہو جائے
 یاد رکھئے نازِ ملے التفاتِ اولیں !
 بے تکلف لے شرابِ جستہ کیا ہو جائے
 آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائے
 از سرِ روزِ زندگی ہو گر رہا ہو جائے
 بے تکلف یک نگاہ آشنا ہو جائے
 لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائیگا

داد از دستِ جنائے صدرِ مرزبانی مثل

گر ہمہ افتادگی جوں نقشِ پا ہو جائے

کار کا ہستی میں، لالہ داغ سماں ہے برق خرمین راحت خونِ گرم دہقاں ہے
غنیچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم با وجود کجی، خوابِ گل پریشاں ہے
م ہم سے سبجِ بیتیابی، کس طرح اٹھایا بائے
داغِ پشت و ستِ عجز، شعلہ خنِ نذاں ہے

آہِ سیلاب طوفانِ صدا کے آب ہے نقشِ پا جو کان میں کھتا ہے انگلی جاوے
بزمِ نئے وحشت کہوت کی چشمِ مست کا شیشے میں بخشِ پری پنہاں ہی موجِ باد ہے
خیمہ لیلی سیاہ و خانہ مجنوںِ خراب جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغِ بیرونِ ادھے
بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسلہ دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادھے

جس جانیم شانہ کش زلفِ یار ہے نافہ، دماغِ آہوئے دشت تیار ہے
ہے ذرہ زہ تنگی جا سے غبارِ شوق گردِ دام یہ ہے و معیتِ صحرا شکار ہے
کس کا سراغ جلو ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فریش شش جہت انتظار ہے
پھر کس کے شبنم آئینہ برگِ گل پر آب اے عندلیب، وقتِ وداع بہار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی اے بے دماغ آئینہ تماشِ دار ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر ہر ذرے کے نقاب میں دل بیکار ہے
اے عندلیب، یک کفِ خس بہر آسیاں طوفانِ آمد آمدِ فضل بہار ہے
دلِ مدعی و ویدہ بنا مدِ عالیہ نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے
م

بیچ آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے م وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے
 غلفت کفیل عمرو اسل نامن نشاط
 اسے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے تری سرسہ سا نکلتی ہے
 برنگ شیشہ ہوں یک گوشہ دل خالی کبھی پری مری خلوت میں آنکلتی ہے
 فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردے میں جھلکتی ہے
 نہ پوچھ سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ
 کہ زخم روزن درت ہوا نکلتی ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں ہے ایسا کہاں سے داؤں کہ تجھ سا کہیں ہے
 ہے انتظار سے شرر آباد رستخیز مرگ گاہ کو کہن رنگ خارا کہیں ہے
 حسرت نے لار کھاتری بزم خیال میں گلہ مستہ نگاہ سویدہ کہیں ہے
 کس فرصت وصال پہ گل کو غنایب زخم فراق سندہ بجا کہیں ہے
 درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو صبح جبار پنبہ مینا کہیں ہے
 پھونکا ہے کس نے گوش بہت میں سدا رنوں انتظار مینا کہیں ہے
 یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیے یہ محشر خیال کہ دنیا کہیں ہے
 سر پہ جھوم ورد غریب سے دانے وہ ایک مشت خاک کہ صحر کہیں ہے
 ہے چتر تر میں حسرت دیدار سے نہاں شوق غنا کی سیختہ وریا کہیں ہے

غالب ہر آنہ جان جو واعظ بڑا کہے !
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب چھا کہیں جسے

شبہم بہ گل لالہ ! نہ خالی نہ ادا ہے
دل نوح شدہ کشمکش حسرت و یدار
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصدوق
قری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
مجبور مئی دعوائے گرفتار مئی الفت
اے پر تو خورشید جہاں تاب و عمر بھی
معلوم ہوا حال شہیدان گذشتہ
بیگانگی خلق سے بے دل نہ ہو غالب
دارغ دل بیدار نظر گاہ حیا ہے
آئینہ بدست بہت بدست حنا ہے
آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے
اسے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے
دست تیر سنگ آمدہ پیمان وفا ہے
سائے کی طرح ہم یہ عجب وقت پڑا ہے
تیغ ستم آئینہ تصویر نہا ہے
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ سے جو کہ
خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے
معشوقی سے جو صلیگی طرفہ بلا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داوا !
یار ب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے
موج شراب ایک شرعہ خوابناک ہے

اسے یہ شعر موجود ویران میں ملتا ہے۔ نسخہ حمید یہ کے ۱۲۵ پر غیر مطبوعہ مغزوں کی تحت میں شائع ہوا ہے۔

غالب نامہ

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں رز
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاکر
جویش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدا
صحر اہماری آنکھ میں اک شبت خاک سے

جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسانی
تو فسروگ نہاں ہے بہ کین بے زبانی
بفرازا گاہ عبرت چہ بہار و گوتسا
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بجزائے زندگانی
یہ فراق رفتہ یاراں خط و حرف ہو پریشان
دل غافل از حقیقت ہمہ ذوق قصہ خزان
نہ وفا کو آبرو ہے نہ جفا تمیز جزو ہے
چہ حساب جانفشانی چہ غرور دستا
مشو شور آرزو سے تب و تاب عجز بہتر
نہ کرے اگر ہوس پر غم بیدلی گرائی
مجھے امتعاش غم نے پئے عرض حال بخشی
ہوس غزل سرائی تمیش فسانہ خزان
مجھے اُس سے کیا توقع یہ زمانہ جوانی
کبھی کو دکھی میں جس نے نہ سنی مری کہا
دل نا امید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو
جو امید دار بستے نہ برگ نہا گیا
مجھے بادہ طرب سے بہ شمار کا قسمت
جو ملی تو بلیغ کامی جو ہوئی تو سرگراں
نہ ستم کرا بتو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ایں تھی
مجھے طاقت آزمائی اتھے الفت آزما
یہ نہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خزان گفتگو پر دل و جاں کی مہمانی

۱۷۰۰ء شکار جو سرحد و بران میں تھے میں قند حمید کے سفر ۱۳۳۰ء پھر بطور غزلوں کی تحت میں شائع ہوا

میرے بعد

حُسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
منصفِ تنگی کے کوئی تابل نہ رہا
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
خوں ہے دل خاک میں احوالِ تباں پر مبنی
درِ غورِ عرض نہیں جو ہر سیداد کو جا
ہے جنوں ہل جنوں کے لئے آغوشِ دواع
کون ہوتا ہے حریفِ مرادِ فگنِ عشق
غم سے مریا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
تھی نگہ میری نہا بخانہٴ دل کی نقاب
تھیں گلہ سبزِ احباب کی بندش کی گیارہ

بارے آرام سے ہیں ہل جفا میرے بعد
ہوئی معذولیٰ اندازِ وادامیرے بعد
شعلہٴ عشقِ سید پوش ہوا میرے بعد
اُنکے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
نگہِ ناز ہے سُسے سے خفا میرے بعد
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
بے فکر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
بے خطر جیتے ہیں اربابِ یا میرے بعد
متفرق ہوئے میرے رفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

نوحہ

دردِ میرے ہے تجھ کو بیکراں سی ٹائے ٹائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلتِ شکاری ٹائے ٹائے

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری لئے لئے
 دشمنی اپنی تھی میری دوست داری لئے لئے
 عمر کو بھی تو نہیں سے پا بداری لئے لئے
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری لئے لئے
 خاک پر سہتی ہے تیری لالہ کساری لئے لئے
 یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری لئے لئے
 دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری لئے لئے
 اٹھ گئی دنیا سے راہ درسم یاری لئے لئے
 ہے نظر خور وہ اختر شماری لئے لئے
 ایک دل تس پر یہ نا امید داری لئے لئے

تیرے دل میں گرنے تھا آشوب غم کا حوصلہ
 کیوں مری غمخوار لگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
 عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
 شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
 گلشنانی لئے نازِ جدوہ کو کیا ہو گیا
 زہر لگتی ہے مجھے اب دہرائے زندگی
 ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
 خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئے
 کس طرح کاٹے کوئی شب لئے تارِ برشکال
 گوشِ ہجو پر پیامِ وحشیم محرومِ جمال

عمر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھایتے اسد
 میری دہلی ہی میں رہتی تھی یہ خرابی لئے لئے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ ۲ رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خرابی لئے لئے

قطعہ

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرِ زہر آب تھا م شعلہ جوالہ بریکِ حلقہ گرداب تھا
 والِ کرم کو غمِ بادشہ تھا غناںِ غیرِ خرام گریہ سے یاں پنبہ بالمش کفِ سیلاب تھا

یاں ہجوم اشک میں تاریکِ نایاب تھا	م	داں خود آرائی کو تھا موتی پرٹنے کا خیال
یاں رواں مژگانِ چشم تر سو خونِ ناب تھا	م	جلوہ گل نے کیا تھا داں چراغاں آب جو
داں وہ فرقِ نازِ محوِ باہشِ کنوَاب تھا	م	یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
جلوہ گل داں بساطِ صحبتِ احباب تھا	م	یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بخودی
یاں زمیں سے آسمان تک بوختی کا باب تھا	م	فرش سے تاعرش داں طوفانِ تھلجِ رنگ کا
ناخنِ غم یاں سرِ تاریکِ نفسِ مضراب تھا	م	داں ہجومِ نغمہ ٹٹے سازِ عشرتِ تنہا آسود
دل کہ ذوق کا ویشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا	م	ناگہاں اس رنگ سے خونِ بیپکا نے لگا

۰۰

شوخیِ وحشت سے افسانہِ فنونِ خواب تھا	م	شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دلِ قیاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گو قیاب تھا	م	نالہ دل میں شب اندازِ اثرِ نایاب تھا
خانہِ عاشقِ مکرِ سازِ صدائے آب تھا	م	مقدمِ سیلاب سے کیا نشاطِ آہنگ ہے
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا	م	نازشِ ایامِ خاکِ تر نشینی کیا کہوں
دڑہ دڑہ روکشِ خورشیدِ عالمِ تاب تھا	م	کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے ورنہ یاں
کلِ تلک تیرا بھی دلِ مہر و وفا کا باب تھا	م	آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
انتظارِ رسید میں اک دیدہ بخواب تھا	م	یادِ کردہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دم کا

میں نے رو کا رات غالب کو گرنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کعبِ سیلاب تھا

قصیدہ منقبت

سایہ لالہ بے وارغ سویدائے بہار
 ریزہ شیشہ سے جو ہر تیغ کہسار
 تازہ ہے ریشہ نابج صفت ارٹے شرار
 سینہ بتابی سے ملتا ہے بہ تیغ کہسار
 کہ اس آغوش میں ممکن ہو دو عالم کا فشار
 راہ خواہید ہوئی خندہ گل سے بیدار
 مد نوشت دو جہاں ابر بہ یک سطر غبار
 دام ہر کا غذا آتش زدہ طاووس شکار
 قوت نامید اسکو بھی نہ چھوڑے بیکار
 بھول جا یک قدح بادہ بطاق گلزار
 گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار
 سبز مثل خط نو خیز ہو خط پر کار
 طوطی سبز کہسار نے پیدا انتظار
 چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
 رشتہ فیض ازل سار طغاب ہمار

م

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
 مستی باد صبا سے ہے معرض سبزہ
 سبزہ ہے جام زمرہ کی طرح وارغ پلنگ
 حسرت جلوہ ساتی ہے کہ ہریارہ ابر
 مستی ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
 کہ وہ صحرائے معرور کی شوقی بلبل
 سوچے ہے فیض ہوا صورت مرزا گانیم
 کف ہر خاک بگردول شدہ قمری پرواز
 کاش کر چھینکے ناخن اتربہ انداز ہلال
 میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
 مروج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدہ غنچہ باغ
 کھینچے گرمائی اندیشہ چمن کی تصویر
 صل سے کی ہے پئے زمزمہ بہ حبت شاہ
 وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیر ہوا
 فلک العرش جویم خم و دوشیں مزدور

رفعت ہمت صدعارف ویک اندج حصار
وہ رہے مروجہ بال پری سے بیزار
گرداں دشت کی امید کو اجرام ہزار
چشم نقش قدم آئینہ بخت بیدار
عرض خمیازہ ایجاب دے ہر مروج غبار
دل پروانہ چراغال، پر بلبل گلزار
سلک اختر میں مہ نور مشہ گوہر بار
جام سے تیرے عیاں بادہ جوش امرا
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار
کمی ربط نیاز و حظ ناز بسیار
دل وارستہ ہفتاد دولت بزار
یک طرف نازش مژگان و گر سو غم خار
خاک در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
عرض خمیازہ سیلاب ہوا طاق دیار

سبزہ نہ چمن ویک خط پشت لب بام
واں کی خاشاک سے حال ہو جسے یک پرکاش
وزہ اس گرد کاخ رشید کو آئینہ ناز
خاک صحرائے نجف جو ہر سیر عرفا
آفریش کو ہے واں سے طلب مستی ناز
فیض سے تیرے ہے لے شمع شبستان بہار
تیری اولاد کے غم میں ہے بروئے گروں
مدح میں تیری نہاں زمزمہ نعت نبی
ہم عبادت کو تیرا نقش قدم مہرباز
تہمت بیخودی کفر نہ کھینچے، یارب!
ہے اسیر ستم کش دام ونا
جو ہر دست دعا آئینہ یعنی تاشید
مردمک سے ہو عز خانہ اقبال نگاہ
دشمن آل نبی کو بطر بخسانہ دہر

دیدہ تادل اسل آئینہ یکت تو شوق
فیض معنی سے حظ ساغر را تم سرشار

قصیدہ فی المنقبت

سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو تجہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوا خود ہیں
سر کرے ہے دل حیرت زدہ شغل تسکین
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
لفو ہے آئینہ فراق جنوں و تمکین
وہم آئینہ پیدا ئی تمثال یقین
صورت نقش قدم خاک بفرق نکین
دور یک ساغر غفلت ہرچہ بنیاد چیں
سخن حق مہم پیانہ ذوق تحسین
دسل زنگار رخ آئینہ حسن یقین
بیتوں آئینہ خواب گراں شیریں
کجی یک خط مسطرچہ تو ہم چہ یقین
تعب و بکدہ یک محمل خواب سنگین
س نے پایا اثر نالہ دہائے حزن
نہ سرو برگ ستائش نہ داغ نفیر

نورے ہے عجز تک حوصلہ بروئے زمین
دہر جز جلوة یکتا فی معشوق نہیں
نورے ہے نالہ سر رشته پاس انقاس
بیدی لائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
یاس تمثال بہار آئینہ استغنا
مثل مضمون وفا باو بدست تسلیم
لافت دانش غلط و نفع عبادت معلوم
نقش معنی ہمہ خیازہ عسر و حزن صورت
عشق بیرونی شیرازہ اجزائے حواس
کو کہن گر سنہ مرور و طرب گاہ و رقیب
موج خمیازہ یک نشہ چہ اسلام و چہ کفر
قید و ابروئے بت یک رہ خوابیدہ شوق
کس نے دیکھا نفس ابل و فنا آتش خیم
سامع زمزمہ اہل جہاں ہوں، یکن

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیر، نہ نگاہ
 شورِ اولام سے مست ہو شہِ خجے بن انصاف
 نقشِ لاحول لکھ، اے خامہ ہذیاں تحریر
 کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
 ہو وہ سراپہ ایجاب و جہاں گرم خرام
 مظہر فیضِ خدا جان و دل ختمِ رسل
 نسبت نام سے اسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے
 جلوہ پرداز ہوں نقشِ قدم اس کا جس جا
 فیضِ نعت اس کا ہی شامل ہو کہ ہوتا ہے سدا
 بر پیش تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا
 کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہو کہ جس سے ٹوٹے
 جاں پناہ دل و جان فیضِ رسانی شام
 جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبرِ مفسر
 تری مدحت کیلئے ہیں دل و جان کام دزبان
 آستان پر ترے ہے جو ہر آئینہ سنگ
 تیرے در کے لئے اسبابِ تبارِ آمادہ
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا

گرد جو ہر ہیں ہے آئینہ دل پر وہ نشین
 گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نکلیں
 یا علی عرض کر اے فطرت و سواس قرین
 شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین
 ہر کفِ خاک ہے والِ گردہ تصویر ہیں
 قبلہ آلِ نبی، کعبہ ایجابِ یقین
 اید ایشیت فلک خم شدہ ناز زین
 وہ کفِ خاک ہے ناموسِ عالم کی ہیں
 بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین
 قطع ہو جائے نہ سر رشته ایجا و کہیں
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانہ چہیں
 وصی ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقین
 نامِ نامی کو ترے نامیدِ عرشِ یمن
 تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جہیں
 رقمِ بندگی حضرتِ جبریل امیں
 خاکیموں کو جو خدا نے دیے جانِ دل دین
 کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ یں

کہ سواتیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
ہے ترے حوصلہ فضل پہ از بسکہ یقین
کہ اجابت کہے ہر حرف یہ سب تو بار آہیں
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
کہ جہاں تک چلے اُس قدم اور مجھے جہیں
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزین
وقف احباب گل و سنبل فردوس ہیں

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
شومئی عرض مطالب ہیں ہے گستاخ طلب
دے دعا کو میری وہ مرتبہ حسن قبول
غمِ شبیر سے ہر سینہ یہاں تک لبریز
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمی شوق
دل الفتِ نسب و سینہ توحیدِ قضا
صرف اعداء اثرِ شعلہ و دود و وزخ

متفرقت

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پایاں
کہ ہے سرِ پنجہ مرثکان آہو پشت خسار اپنا

حبابِ مرجہ رفتار سے نقش قدم میل
کہ مرجہ بوئے گل سے ناک میں تاپے دم میل

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
محبت تھی چین سے لیکن اب یہ بڑا مانگی ہے

قطرہ مے بکے حیرت نفس پرور ہوا
عقبار عشق کی خانہ خسرابی دیکھنا
خطِ جام مے سرا سر رشتہ گوہر ہوا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

سرمہ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
زنجبیر نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
کہ رہے چشم خردار یہ احساں میرا
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم نہاں میرا

شکایتِ مصلحت ہوں کہ خواب تجھ پر عاشق ہیں
تکلف بر طرف مل جائیگا تجھ سا قیاس آخر

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیرِ وحشت کی
تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
ہوا، جامِ زمرہ بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

دستِ سبھی کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک
یقلم کا غدا آتش زدہ ہے صفویہ وشت
گذرے ہے آبلہ پا ابر گوہر بارہنوز
نقشِ پامیں ہے تپ گرمی رفتارِ ہنوز

نیوے گرض جو ہر طراوتِ سبزہ خط سے
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ شکلِ عاشق
لگا دے خانہ آئینہ میں، روئے نگارِ آتش
نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گزہ خارِ آتش

جادو رہ، خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخِ واکر تا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

گر تھک رہے یقینِ اجابتِ دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یکِ دل بے مدد سنا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمارِ یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بقدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے
وگر نہ خانہ آئینہ کی فتنا معلوم
بہ نالہ حاصلِ لبیکِ سرِ اہم کر
متاعِ خانہ نہ بخیرِ جز صد معلوم
اسد فریفتہ انتخابِ طرزِ جفا
وگر نہ دلبری وعدہ وفا معلوم

دیر و حرم آئینہ مکر آئینا
وا مانندگی شوق تراشے ہے پناہیں
ستِ مردِ کب دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں بتِ سویدائے دل چشم میں آہیں

قیامت ہے کہ سنِ یلے کا دشتِ قیسِ یلِ نا
تعبت وہ بولایوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
دلِ نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرِ گرم اس کا فر کو الفت آزلے میں

برشکالِ دیدہ عاشق ہے دیکھا چاہئے
محلِ نشی ماند گلِ سو جا سے دیوارِ چین
الفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ وائے شکی
سروے باوصفِ آزادی گر قمارِ چین

معاف پیسہ گونئی ہیں ناصحان عزیز
دلے بہ دست نگارے نہ واہ رکھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دل نکا کر لگ گیا آن کو بھی تنہا بیٹھنا م
بارے اپنے دردِ دل کی ہنسی پائی داویاں
ہے مری وحشت عدھے اعتباراتِ جہاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

از مہر تابہ زرد دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو ششجہت سے مقابل ہے آئینہ

حاصل ہے لائقہ و سو بیٹھ لے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھاوے م
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں اُریغِ ناتامی

رحمِ کفر ظالم کہ کیا بود چراغِ کشتہ ہے
نہیض بیسار وفا وود چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
در نہ یاں بے رونقی سود چراغِ کشتہ ہے

غالب نامہ

تغافل دوست ہوں، میرا دماغ عجزِ عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل بہت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

خطر ہے رشتہ الفتِ رگ گردن نہ ہو جائے
غورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کرتا ہی نشو و نما غالب
اگر گلِ سرو کے قامت پہ پیرا، من نہ ہو جائے

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
تاکجا اے آگہی رنگِ تماشا بافتن
آئینہ ز نوائے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
چشمِ واگردیدہ آغوشِ دواعِ جلوہ ہے

غم و عشرتِ قدسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دغائے مدعا گم کرد گمانِ عشق آئیں ہے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنابی
قیامت کشتہٴ بلِ بستاں کا خواب سنگیں ہے

رباعیت

ایام جوانی رہے ساغر کشِ حصال	بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
اے عمرِ گزشتہ، یک قدم استقبال	آپہنچے ہیں تاسوا دیا قلمِ عدم
سمیہ شرحِ کروں کہ طرفہ تر عالم تھا	شبِ زلف و رخِ عرقِ فشان کا غم تھا
ہر قطرہ اشک، دیدہ پُر غم تھا	رویائیں ہزار آنکھ سے صبحِ تلک
بتیابیِ رشک و حسرت دیدہ ہی	دل تھا کہ جوجانِ در و تہسید ہی
نگہار روا نہیں تو تجھ دیدہ ہی	ہم اور فسدِ دن، اے تجھ بلیِ افسوس
وحشتِ کدہ تلاشِ لڑنے سیکھے	ہے خلقِ حسدِ قماش، لڑنے کے لئے
ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لئے	یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ	اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
یک دم و عبادتِ ہزار اندیشہ	یک قطرہ خون و دعوتِ مندرشتہ

مشکل ہے جس کلام میرا اے دل
سُن سن کے اے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فراموش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

التحباب

یا علی دانی کہ رویم سوئے تست از ہر نورد
موسے آتش دیدہ را مانم کہ بہر خویشتن
غافل از رفتار عمر فارغ از تکمیل عشق
نقد آگاہی برہم فرستہ در باختہ
خود تو میدانی کہ گم گردیدہ دشت امید
دل ز کار افتاد و پاواماند دست از شکست
مدعا ریزد بال آودن از بیگانگی است
زوق مطلب از تو من از تو مطلب ز تو
شعلہ شوقے ہوس و ارم ز سوز جنون
دین و دنیا را بلا گردان نازت کردہ ام

م
م

ہر چیہ آغازم مخاطب امت در خطاب
حلقہ دامن فنا گردیدہ ام از پیچ و تاب
کردہ آغوش و دایہ دل نشین گاہ خواب
دست ثانی بر سر و دل پانہال اضطراب
تشنہ تر میگردانے آبی موج سراب
قطع منزل کے تو اس کردن باریح خراب
جز نگاہت شاہد بار کفن باد انقلاب
خود توئی بخشی و می خمی زبان اضطراب
کاش آتش افروزہ را بخشہ بسیار التهاب
جلوہ رنگیں تر از صد گلشن خند انتخاب

حومت جان محمد یک نظر کن سنے من
یا علی یا مرتضیٰ یا برحقسن یا بو تراب

مخزنہ شہاد

۱۸۲۲ء (۹)

۱۸۲۱ء تا

آتے ہیں غم سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریحاً نہ نوائے سرور ہے

غزلت

دھمکی میں مر گیا جو نہاب نبرد تھا
تھا زندگی میں موت کا کھڈکا لگا ہوا
تالیف نسخہ نئے وفا کر رہا تھا میں
دل تا جگر کہ ساحل دیئے خوں ہے اب
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی؟
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا!
اُڑنے سے پیشتر بھی مرانگ نہ رہا تھا
مجموعہ خیال ابھی فروزہ تھا
اس رہگذر میں جلوہ گل آگے گرد تھا
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
زنداں میں بھی خیال بیا باں نور تھا

یہ لاش بے کنس (سلاخستہ جاں کی ہے
حقِ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سائنس گرتے زائد اس قدر جس باغِ صنواں کا
وہ اک گلہ ستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیدار کا و شہائے مرثاں کا !
 کہ ہر اک قطرہ خوں و آنہ ہے تسبیح مرجاں کا
 نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
 لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
 دکھاؤں گا تماشا، وہی اگر فرصت زمانے نے
 مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا
 کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
 کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستاں کا
 مری تعمیر میں مضمر ہے اک سورت خرابی کی
 ہیولی برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا
 آگاہے گھر میں ہر شو سبزہ ویرانی تہا شاخ
 مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
 خوشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 چراغِ مردہ ہوں تیں بے زبان، گوہرِ بیاں کا
 ہنوز اک پر تو نقشِ خیال یا رہا ہے
 دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
 بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ

غالب نامہ

سبب کیا خواب میں آکر تبسم لائے یہاں کا
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
 قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری شرکال کا
 نظر میں ہے ہماری جاوید راہ فنا غالب
 کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا لائے راز کا
 رنگ شکستہ، صبح بہار نظر آ رہا ہے
 تُو اور سوئے غیر نظر لائے تیز تیز
 صرف ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
 ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشہ اچل رہا ہے
 کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
 یاں ورنہ جرجاب ہے پردہ ہے ساز کا
 یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
 میں اور دکھ تری مرثہ لائے دراز کا
 طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا
 ہر گوشہ بساط ہے سرشیشہ باز کا
 ناخن پہ قرصِ اس گروہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ جہاں ہوا افسانہ
 سینہ کہ قصا د فیشہ گہرا لائے راز کا

دوست غمخواری میں میری سچی فرمائیں کیا
 بے نیازی حدِ گزری بندہ پرور کب تک
 حضرت ناصح گرائیں وید و دل فرمیں راہ
 آج والِ تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں
 زخم کے بھوسے تلک ناخن بڑھائیے کیا
 ہم نہیں گئے مالِ دل اور آپ فرمائیں کیا
 کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا ہے کہ سمجھائیے کیا
 عذریہ قتل کر رہے ہیں وہ اب لائیے کیا

گر کیا ناصح نے ہکرتِ اچھائیوں سہی !
خانہ زادِ زلف میں تجیر سے بھاگیں گے کیوں ؟
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائیگے کیا ؟
ہیں گرفتارِ وفازِ نداں سے گھرائیگے کیا ؟

ہے اب اس مہمورہ میں قحطِ غمِ الفتِ استاء قحطِ سب
بہمنہ یہ مانا کہ دہلی میں رہیں، لکھائیگے کیا ؟ ۱۸۲۲

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
تجربہ لیشگی سے عدا کیا ؟
نواز شہانے بیجا دیکھتا ہوں
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
فروغِ شعلہ خن، یک نفس ہے
نفس، مرجح محیطِ بخودی ہے
دماغِ عطریہ راہن نہیں ہے
دل ہر قطرہ ہے، سازِ انا بھرا
محابا کیا ہے؟ میں نہ امن الودھ دیکھ
سُن لے غارتگرِ حبسِ وفا، سن
کیا کس نے بگرداری کا دعویٰ ؟
یہ قاتل و عدو صبر آزما کیوں ؟
نہو مرنّا، تو جینے کا مزا کیا
کہاں تک لے سراپا ناز کیا کیا
شکایتِ لمّے رنگیں کا گلا کیا
تغافلِ لمّے نمکیں آزما کیا
ہوس کو پاس ناموسِ وفا کیا
تغافلِ لمّے ساقی کا گلا کیا
غمِ آوارگی لمّے سب کیا
ہم آس کے میں ہمارا پوچھنا کیا
شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
شکبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ کا فرفتہ طاقِ رب کیا

بلائے جاں ہے غالب اسکی مرآت

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا ق آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل دیا دیار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی یہی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہ میری آہ آتشیں سے بالِ عنق جل گیا
عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرِ اجل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا، ورنہ داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کو دل

و یکسر طرزِ تپاک اہل دنیا جل گیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ق جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
بروئے ششجہت در آئینہ باز ہے ق یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ بہتی لئے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ درخوردِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کر نہیں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
واکر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گوئیں رہا رہیں ستمہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشت و فامٹ گئی کہ داں حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسل ق عجب

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا ۱۳۲۲

عشرتِ قطرہ ہے دیا میں فنا ہو جانا در و کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا دا ہو جانا
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
کیوں ہے؟ گردِ روبرو جلانِ صبا ہو جانا
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بچتے ہے جلوہ گلِ ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہتے ہر رنگ میں دا ہو جانا

دے بڑے کو دل دوستِ شامِ شراب
سایہ تاک میں ہوتی ہے جو امواجِ شراب
سرت گزرے یہ بھی ہے بالِ کامِ شراب
موجِ ہستی کو کرے فیضِ بزمِ شراب
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
دسے تے تسکینِ بزمِ آبِ بجا، موجِ شراب
شہرِ رنگ سے ہے بل کشا، موجِ شراب

تجھ سے قیمت ہیں مری صورتِ قفلِ امجد
دل ہوا کشمکشِ چارہ زحمت میں تمام
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
صنف سے مگر یہ، متبدل بدم سر و ہوا
دل سے مٹا ترسی انگشتِ خانی کا خیال
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
گر نہیں نچت گل کو تیرے کوچہ کی ہوس؟
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیف

پیر ہوا وقت کہ ہوا بل کشا، موجِ شراب
پوچھت، وجہِ سہبتی اربابِ خشن
جو ہوا غرقِ سہبت رسا رکھتا ہے
ہے یہ برساتِ دوسم کہ عجب کیا ہے اگر
چار موجِ ہستی ہے، ہوا فانی طرب سے ہر سو
جس قدر روحِ نباتی ہے، بگڑت نہ نماز
بسکہ دوسے ہے رنگِ تاک میں خوں ہو ہو کر

موج گل سے چراغاں تو گزر گاہ خیال
نشہ کے پردے میں ہے مجھ تو شائے داغ
ایک عالم پہ ہے طوفانی کیفیتِ فصل
شرح ہنگامہ ہستی ہے، زہے موسم گل
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسلند

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھی ہے ادھر انگشت
گرمی ہے زباں کی سبب سوختن جاں !
شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا
کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل
افسوس کہ دنیا کا کیا رزق فلک نے
کافی ہے نشانی تری چھتے کا نہ دینا
یکدمت جہاں مجھ سے پھر ہے مگر انگشت
بے شمع شہادت کے لئے سرسبز انگشت
راہِ دل حد پارہ کی ہے پردہ و انگشت
آئی نہیں پیچھے میں بس اس کے نظر انگشت
جن جو گل کی تھی درخوردہ گہرا انگشت
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسلند سوزِ تیرے سخنِ رزم
تار کھنڈے کوئی مرے حرفِ پراگشت

آہِ خط سے ہوا ہے سرورِ جبار و دوست
برقِ خرم زار گوہر ہے نگاہِ تیزیاں
ہے سرائیز سے پر اس کے قاصدِ نوخیز سے
آفتاب صبحِ مشرعے گلِ رخسارِ دوست

کون لاسکتا ہے تاپِ جلوہ دیدار دوست
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتار دوست
کشتہ دشمن ہوں آخر اگرچہ تھا بیمار دوست
دیدہ پر خون ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدار دوست
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ غنبرِ دوست
سنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتار دوست
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزار دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب زبں تکرار دوست

چراکِ دوزخِ نا ہے حضرت سلامت
نکھ ہے نذا و نہ نعمت سلامت
دل و دستِ اربابِ بہت سلامت
مبارک مبارک سلامت سلامت
جگر پائے جوشِ حسرت سلامت
تماشا کے نیرنگِ صورت سلامت

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
خانہِ دیریاں سازِ حیرت تماشا کیجئے
عشق میں بیدارِ شکبِ غیر نے مارا مجھے
چشمِ مارِ دشمن کہ اس بیدارِ کاملِ شاد ہے
غیر یوں کرتا ہے پرش مجھے آنکھِ جیوں
تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائیِ دلِ ملک
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہِ ضعفِ داغ
چکے چکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
مہربانی نمائے دشمن کی شکایت کیجئے

رہاگر کوئی تاقیامت سلامت
جگر کو مے، عشقِ خوں تا بہ شرب
دو عالم کی ہستی پہ خط و قافِ بھینج
علیٰ الرعیم دشمنِ شبید و قاتل ہوں
نہیں مگر یہ کامِ دلِ خستہ گزروں
نہیں مگر سرِ درگاہِ اوراکِ معنی

نہ اور دل کی سُننا نہ کہتا ہوں اپنی
و فوراً بلا ہے ، ہجوم و فاقہ ہے
نہ فکرِ سلامت ، نہ بیمِ ملامت

سرخستہ و شوار و حشت سلامت
سلامت ملامت ، ملامت سلامت
ز خود رفتگی مائے حیرت سلامت

رہے غالب خستہ مغلوب گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت ملامت

کیوں جلیگیا نہ تابِ رخ یار دیکھ کر
آتشِ پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
کیا آبروئے عشق ؛ جہاں عام ہو جفا
آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا یہ خونِ خلق
وا حشر تاکہ یار نے کھینچا بستم سے ہاتھ
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
ز ناز باندھ بھیج دے داندہ توڑ ڈال
ان آبلوں سے پاؤں کھجور اگیا تھا میں
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آمینہ میں مے
گرفتہ تھی ہم پہ برقِ تجلی ، نہ طور پر

جلتا ہوں اپنی طاقبت دیدار دیکھ کر
سرگرم نالہ سائے شرر بار دیکھ کر
رگتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر
ہم کہ حریص لذت آزار دیکھ کر
لیکن غیارِ طبع خس دیدار دیکھ کر
ز سر و چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر غار دیکھ کر
طوطی کا عکس سمجھ ہے زنگار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ، ظرفِ قح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا دہ غالب شوریہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری دیدار دیکھ کر

ہے نازِ مفلساں ز راز دست رفتہ پر قی ہوں گلفروش شوخے داغ کہن ہنوز
فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر ہے داغِ عشقِ نینتِ جیب کفن ہنوز

میخانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں

خیمازہ کھینچنے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

کب فقیروں کو رسائی بتِ میخوار کے پاس
مردہ لے ذوقِ اسیری کو نفرتا ہے
جگر تشنہ آزار، تسلی نہ ہوا
منہ گمیں کھولتے ہی کھولتے ہنگامیں خود بخود
میں بھی ترک رک کے نہ مرنے بوزہاں کے پنے
دہن شیریں جا بیٹھئے، لیکن بے دل
دیکھ کر جھک کر چسمن، بسکہ ٹوٹ رہا ہے

تو ہے بودیجے میخانے کی دیوار کے پاس
دامِ غالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جوئے خوں بھنے بہائی، بن ہر خار کے پاس
خوب وقت آنے تم، اس عاشقِ بیمار کے پاس
دشنہ اک تیز سا ہوتا میرے غنوار کے پاس
نہ کھڑے ہوئے خوابِ دل آزاد کے پاس
خود بخود پیچھے ہے کل گوشہ دستار کے پاس

مر گیا پھر کے سرِ غالب جش ہے ہے! قی ن

پیشانی پر دم و آگرتی دیوار کے پاس

ہے کس قدر ہلاک فریب و فائے گل
آزارِ نبی نسیم مبارک کہ بر وقت
جرحہ، سوختہ رنگ کے جو کہ ہیں گیا
خوش حال اس حریتِ نیست کا کہ تو

بیل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ٹائے گل
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہوائے گل
اسے داکے نالہ لب خونیں نوائے گل
رکھتا ہوشِ سایہ گل سر پہائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گل
پینائے بے شراب، و دل بے ہوائے گل
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ دوائے گل
بے اختیار دوڑے ہے گلِ درقٹائے گل

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل ۱ ق ۱۸۳۲

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
فرصتِ کار و بارِ شوق کسے
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
ایسا آساں نہیں ہو رونا
ہم سے چھوٹا تھا خسانہ عشق
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
وہ شبِ روز و ماہ و سال کہاں
ذوقِ نظارہ جمال کہاں
شورِ سودائے خط و خال کہاں
اب وہ عنسائی خیل کہاں
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
واں جو ہائیں گرہ میں مال کہاں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قومی غالب
وہ عنصا صریں اعتدال کہاں ۲ ق ۱۸۳۲

حلقے میں چٹھائے کشادہ بسوئے دل
عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
گراک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک دہ نشیدن کہ کیا کہوں
 ظالم مرے گماں سے مجھے مستقل نہ چاہ
 ہے تھے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں
 نہیں ہے زخم کوئی بجھنے کے درخور مرے تن میں
 ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
 ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
 کفِ سیلابِ باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
 ودیعتِ خانہ بیداد کاوشِ نائے مرگال ہوں
 تنگین نامِ شاہ ہے مہرِ قطرہ خوں تن میں
 بیاں کس سے ہو غفلت گسترِ میرے شبستاں کی
 شبِ مہرِ جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
 نکویشِ مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی !
 ہوا ہے خندہِ احبابِ بخیہ حبیبِ دامن میں
 ہوئے اُس مہرِ دُش کے جلوہٴ تشال کے آگے
 پرافتخاں جو ہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں
 نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبتِ مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دے جو میں جنونِ عشق نے مجھ کو
 سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، قطرہ خوں تن میں
 اسلٰ زندانی، تاثیر الفت مائے خواباں ہیں
 ق خم دست نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں
 آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
 بے گریباں ننگِ پیرا ہن، جو دامن میں نہیں
 صغف سے اے گرہ یہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
 رنگِ بو کر اُڑ گیا جو خوں، کہ دامن میں نہیں
 ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہِ آفتاب
 ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
 کیا کہوں، تا یہ کی زندگی، اندھیر ہے
 پنبہ، نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں
 رونقِ ہستی ہے، عشقِ خانہ ویراں ساز سے
 انہیں بے شمع ہے، گر برقِ خدمن میں نہیں
 زخمِ سلوانے سے مجھ پر چارہ جوی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں
 بسکہ ہیں ہم اک بہ سا بہ ناز کے مارے ہوئے

جلوہ گل کے سوا اگر داپنے مدفن میں نہیں
 قطرہ قطرہ اک ہیولی ہے، نئے ناسور کا!
 خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
 لے گئی ساقی کی سخوت، تسلیم آشامی مری
 موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
 ہوشیارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
 قد کے چمکنے کے بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
 نقی وطن میں شان کیا غالب، کہ بوخت میں قد
 بے تکلف ہوں، وہ مشتِ خس کہ گلشن میں نہیں
 مہرباں ہو کے بلا لوجھے چاہو جو وقت
 ضعیف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
 میں گیا وقت نہیں ہوں کہ کھڑی نہ کھڑا
 بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ کھڑا
 زہرِ مٹا ہی نہیں مجھ کو شکر! اور نہ! ق م ب
 کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں ۱۸۶۶
 عشقِ تاثیر سے نرمید نہیں
 سلطنت دستِ چرت آئی ہے
 بے تہی تری سامان وجود
 رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
 جاں سپاری شجرِ بید نہیں
 بام نے خاتمِ جمشید نہیں
 ذرہ بے پر تو خورشید نہیں
 ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

گروش رنگِ طب سے ڈرے غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جلتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

ق گ ب
۱۸۳۲

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
وعدہ سیرِ گلستاں ہے خوش طالعِ شوق
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
حسرت لے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیٹے قیامت میں نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطفِ دریغ آتا ہو !
صاف دردی کش پیمانہ جم میں ہم لوگ

غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
مژدہ قتلِ مقدّر ہے جو مذکور نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے "پرہیز منظور نہیں"
ہم کو تقلیدِ تنگِ ظرفی منظور نہیں
عشق پر عہدہ کی گول تن رنجور نہیں
کس رعوت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
تو اخلاص میں کسی رنگ سے معذور نہیں
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ق گ ب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب !

۱۸۳۲ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ شہر نہیں

نالہ جزِ حسنِ طلب لے ستمِ اکباد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرتِ گہِ خسرو کیا خوب
کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
اہلِ ہنیش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب
ہے تقاضائے جفا، شکوہِ بیداد نہیں
ہم کو تسلیم نہ کرنا میسر نہ ہو نہیں
دشت میں ہے کچھ وہ عیش کہ گھریاد نہیں
لطمہ موجِ اکم از سیلیِ اُستاد نہیں

جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فرما نہیں
گر چراغانِ سیرِ بگذر باد نہیں
مژدہ اسے مرغ کہ کلزارِ دنیا نہیں
وہی ہے جانے وہن و آنکھوں پر کیا نہیں
یہی نقشہ ہے ورنہ اس قدر آباد نہیں

اے محرومیِ تسلیم و بدا حال وفا
تک تکین گلِ دلالہ پریشاں کیل ہے
سید گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
فی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
لم نہیں جلوہ گری میں تھے کچھ ہی بہشت

کرتے کس منہ سے ہر غربت کی شکایت غالب

تم کہ بے مہرئی یا راہِ وطن یاد میں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبان کا رگر

عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

سبھی سب کو کہیں نامہ بر کو دیکھتے ہیں

سبھی تو آنکھوں میں اپنے ٹھکر کو دیکھتے ہیں

یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

ترے جو ہر طرف کلا کو کیا دیکھیں

ہم ادبِ خانِ محفل و گم کو دیکھتے ہیں

بستی ہمارے جیب میں اب تار بھی نہیں

دیکھا تو ہم میں طاقت ویدار بھی نہیں

دشوار قرین ہے کہ دشوار بھی نہیں

دوا لگی سے دردش پہ زنا رہی نہیں

دل کو نیلِ حسرت و یاد کر چکے

منا اگر ترا نہیں آساں تر سبیل ہے

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
شوریدگی کے لہجہ سے ہے سروبالِ دوش
گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
ڈرنا ہائے زار سے میرے خدا کو مان
دل میں ہے یار کی صفیترگاں سے رکشی
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے لے خدا؟
طاقتِ بقدر لذتِ آزار بھی نہیں
صحرا میں اسے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں
یاں دل میں ضعف سے ہوس یا بھی نہیں
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
رہتے ہیں اور لہجہ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں ہارنا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
قی گرب

دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا
ہے مجھ کو شجہ سے تذکرہ غیسر کا گلہ
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
ڈالانہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہر گام نہ بونی بہت ہے انفعال
دارستگی، بہانہ بیگانگی نہیں؛
مٹا ہے فوٹِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہو
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو
یوں ہو تو چارہ غمِ الفت ہی کیوں نہو
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو
حاصل نہ کیجے دہرے عبرت ہی کیوں نہو
اپنے سے کرانہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسل
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں ہو

ق م گ ب
۱۸۳۷

دھوتا ہوں جب میں پیئے کو اس سیم تن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کو کہیں کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت اسو اسی کی سر پہ یہ
مرہم کی جستجو میں پھر اہوں جو دور دور
اللہ سے ذوقِ دشتِ نر وی کہ بد مرگ
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
شب کو کسی کے خواب میں آئے ہو کہیں

غالب مے کلام میں کیونکر مرزا نہ ہو؟

پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں تن کے پانو

وال پہنچ کر خوش آتے ہم ہے ہسکو
دل کو میں اور مجھے دل مجو و فار کھتا ہے
ضعف سے نقشِ پے مر بہ طوقِ گرون
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
رنگِ ہم طرعی دورِ دثارِ بانگِ تریں
سراٹانے کے جو دھوے کو مکرر چلا

سدرہ آبنگ زمیں برس قدم ہے ہسکو
کستہ ذوقِ کرقاری ہم ہے ہسکو
تیرے کو چہ سے کہاں طاقتِ دم ہے ہسکو
یہ نکاو غلط انداز تو سم ہے ہسکو
نالہ مرغِ سخنِ دو دم ہے ہسکو
ہنس کے بولے تر سنہر کی قسم ہے ہسکو

دل کے خوں کر نیکی کیا وجہ و لیکن ناچار
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی تم ہے ہم کو
ہویں سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
عزم سیر بخف و طوف حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک ترقی غالب
جاو رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو
ق۔ گ۔ ب
۱۸۲۶

ایک جا حرف وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا ق
اے سر شوریدہ، ناز عشق و پاس آبرو ق
جی جلع ذوق فنا کی نامتھی پر نہ کیوں
ہے دی بد مستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
بھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی

ظاہر کا غذ ترے خط کا غلط بردار ہے
یک طرف سودا و یکسو منت و ستار ہے
ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش ہے
جسکے جلوے سے زمین تا آسمان ہر شاہ ہے
زندگی سے بھی مرا جی ان دونوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر میرا ہے یہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اسکو حسرت دیدار ہے

بہ سختی لائے قید زندگی معلوم آزادی ق
امید یا بس تمنا سے نہ رکھ امید آزادی ق
مری اتنی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کسکو، کوئی موسم ہے

شر و در بند و دام رشتہ رگہائے خار ہے
گداز آرزو، آسپار آرزو، آرزو ہے
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عقلم ہے
وہی ہم ہیں نفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اسے ہم
 نہ لائے شوخی اندیشہ تاب نہیج نو میدی
 کف افسوس ملنا عجب یہ تمنا ہے

ہو سکے کیا خاک دست بازوئے فرادے ق
 ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبیں تیر نگاہ ق
 ہے بہار تیز رو گلگونِ نکبت پر سوار
 کیوں نہ جو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ
 مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی

عارض غل دیکھ روئے یار یاد آیا اسل
 جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

مسجد کے زیر سایہ خدایات چاہئے
 عاشق ہرے میں آپ بھی اک اور شخص پر
 دے داد اسے فلک دلِ حسرت پرست کی
 سیکھے ہیں سرِ رخوں کیلئے ہم مصوری
 مے سے غرض نشاط ہے نس رو سیاہو
 ہے رنگ لاد و گل و نسربِ خندِ خند
 سرِ پائے نم یہ چاہئے ہنگامِ بخودی

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے
 آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے
 دن کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہئے
 تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے
 اک گونہ بخودی مجھے دن ات چاہئے
 ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
 روموئے قبلہ وقتِ مناجات چاہئے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانہٗ صفات عارف ہمیشہ مستِ مے ذاتِ چاہئے
نشو و نما ہے اصل سے غالبِ فروع کو
غاموشی ہی سے بکھلے ہے جربات چاہئے ق ۱۸۳۲ گ.ب

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برقِ خسرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک! انصاف! آہ و فریاد کی شخصیت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خود ایں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھڑ چلی جائے اسل گر نہیں تو حسرت ہی سہی ق ۱۸۳۲ گ.ب
دیکھنا قیمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا ندیشے میں ہے

آگینہ، تندہی صہب سے پگھلا جائے ہے
 غیر کو یارب! وہ کیونکر منہ گستاخی کرے !
 گر چاہی اسکو آتی ہے تو شہرا جائے ہے
 شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے حبائیے
 دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
 دودھ چشم بد، تری بزم طرب سے واہ واہ
 نغمہ ہو جاتا ہے راں، گر نالہ میرا جائے ہے
 گرچہ ہے طرز تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
 پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
 اس کی بزم آرائشیں سکر دل رنجور، یاں
 مثل تیشِ بے سائے غیر، بیٹھا جائے ہے
 ہو کے عاشق وہ پری زرخ اور نازک بن گیا
 رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُرتا جائے ہے
 نقشِ کرا کے دستور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
 کھینچتا ہے جس تندہی اتنا ہی کھینچتا جائے ہے
 سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اصل
 پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرم فریاد رکھا، شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی برویالی نے مجھے
 نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری بہتِ عالی نے مجھے
 کثرتِ آرائی و حدت ہے، پرستاری ہم کر دیا کا فرانِ اصنام خیالی نے مجھے
 ہو س گل کا تصور میں بھی کھٹکانہ رہا
 عجب آرام دیا، بے پرواہی نے مجھے
 سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
 بس نہیں چلتا، کہ پھر خنجرِ کفِ قاتل میں ہے
 دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
 میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 گرچہ ہے کس کس برائی سے دے، با اینہما
 ذکرِ میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
 بس ہجومِ ناامیدی، خاک میں مل جائے گی
 یہ جو اک لذتِ ہمارے سب سے حاصل میں ہے
 رنجِ رہ کیوں کھینچے؟ واما ندگی کو عشق ہے
 اٹھ نہیں سکتا ہمارا جوت دم منزل میں ہے
 جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
 فتنہ شوقِ سیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دل شوریدہ غالب طلمسم ہیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دو نول کو اک ادا میں رضا مند گئی
تکلیف پر دو وار بھی زخم جگر گئی
اُٹھے بس اب کہ لذت خواب بھر گئی
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی
سوج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
اب آبروئے شیدہ اہل نظر گئی
مستی سے سرنگہ ترے رخ پر بھر گئی
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
شوق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق
وہ بادہ شہانہ کی مستیاں کہاں
اُترتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقش پا
بہر بولہوس نے حسن پرستی شہار کی
نظارے نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا
فر داؤد سے کا تفرقہ یک بار مٹ گیا

مارا زمانے نے اسلہ اللہ تھاں نہیں
وہ دلوے کہاں وہ جوانی کو عمر گئی

سینہ جو یائے زخم کاری ہے
آہِ فصل لالہ کاری ہے
چہرہ ہی پر دو غم کاری ہے
دل خرم اید و ذوق خواری ہے
دہی صد گوشتہ اشکباری ہے

پھر کچھ اک دل کو بیداری ہے
پھر جگر کھودنے کا ناخن
تبدیلِ قصہ نگارِ نسیب
پیشہ و ذوقِ نسیب
دہی صد گوشتہ اشکباری ہے

دل ہوائے خدام نانے پھر
محشرستان بقیاری ہے
جلوہ پھر عرصہ ناز کرتا ہے
روز بازار جاں سپاری ہے
پھر اسی ہیونسا پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہمساری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز
گرم بازار فوجبداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارہ حب کرنے سوال
اشکباری کا حکم جاری ہے
پھر ہوئے ہیں گراہ عشق طلب
آج پھر اس کی روبکاری ہے
دل و مرثا گال کا جو مقدمہ تھا

بیخودی بے سبب ہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ق ۱۸۳۲ گ. ب

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پہناں تھا دامن سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشان عشق کی پرچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہوتا فی؟ کہ دہریں
لکھے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
اللہ ری تیری تندہی خو جسکے ہم سے
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے

اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو داں نہ کھنچ سکے سودہ یاں آگے دم ہوئے

چھوڑی افسانہ ہم نے گدائی میں مل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے

خلعت کسے میں میے شبِ غم کا جوش ہے
نے مرثوۂ وصال نہ نثارِ جمال
نے نے کیا ہے حسنِ خود آما کو بے حجاب
گو ہر کو عقدِ گردنِ خراباں میں دیکھنا
ویرا بادہ جو سد ساقی نگاہ مست
اسے تازہ واردانِ بساطِ ہولنے دل
دیکھو جے جو دیہ و عبرت نگاہ ہو
ساقی بجلوہ و دشمنِ ایمان و آہی
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ سنانِ چنگ
یا ہج و دم جو دیکھنے آکر تو بزم میں
راغِ خزاں بہت شب کی جلی ہوئی

اک شمع ہے دلیلِ سحرِ سو خوش ہے
موت ہوئی کہ آشتی چشمِ و گوش ہے
اے شوقِ یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے
کیا اوج پر ستارہ گو ہر فردش ہے
بزمِ خیال سے کدو بے فروش ہے
نہ ہمارا اگر تمہیں ہوس نئے ووش ہے
میر می سنو جو گوشِ نصیحتِ ہوش ہے
مغرب بہ نغمہ بہزنِ تمکینِ ہوش ہے
دامانِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
نے وہ سرورِ شور و جوش و فروش ہے
اک شمع رہ گئی سودہ بھی خوش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال ہیں
غالب سرورِ خاطر نزلے سرور ہیں

عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے
 کہ اپنے سائے سے سرِ پاؤں سے ہے دو قدم آگے
 قضائے تقابحھے چاہا خراب بادۂ الفت
 فقط "خراب" لکھا، بس نہ چسل سکا قلم آگے
 غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
 وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
 خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
 کہ اُس کے دریہ پہنچتے ہیں نامہ برس ہم آگے
 یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آئیو اے طرہ لائے خم بہ خم آگے
 دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجِ خوں ہے
 ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے
 قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

جس بزم میں تو ناز سے گفتا رہیں آئے
 سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
 جاں کا لبدِ صورت و یار میں آئے
 تو اس قدر نگش سے جو گلزار میں آئے
 جب بختِ بگرویدہ خونبار میں آئے
 تب نازگراں مانگی اشکِ بجا ہے

غالب نامہ

کچھ تھجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے
آب آبلہ پا وادی پر خار میں آئے
آغوش خم حلقہ زنار میں آئے
سیوں شاید گل باغ سے بازار میں آئے
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آئے
اسے وائے اگر حزن انہا میں آئے

وے تھجھ کو شکایت کی اجازت کہ سنگ
اُس چشم فنوں گر کا اگر پاسے اشارہ
کانٹوں کی زباں ہو کہ گئی پیاسے یارب
مر جاؤں نہ کیوں رشک جب وہ تن نازک
غارت گرد ناموس نہو، گر ہر سب زور
تب چاک گریباں کا مزہ ہے ول نالوں
م تشکر ہے سینہ مرا راز نبال سے

مکعبہ معنی کا لکھ اسم کو سمجھئے
جہ لفظ کہ غالب مرے اشار میں آئے

اور پیروہ بھی زبانی میری
دیکھ خوں نابہشت فی میری
مگر آشفستہ بیانی میری
بجول جانا ہے نشانی میری
رکھ گیا دیکھ روانی میری
سخت ارزاں ہے گرائی میری
میرے شوق ہے بانی میری
کھل گئی زچہ انی میری

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
خلش غمزدہ خوں زینہ پر چھ
کیا بیان کر کے مراد میں گئے یار
ہوں زخورد رفتہ بیدائے خیال
مقابل ہے مقابل میری
قدر سنگ مرید رکھتا ہوں
گرد باد رہ بیتابی ہوں
دہن اس کا جو نہ معدوم ہوا

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیسہ سی ہے جوانی میری

ق گ ب
۱۸۳۲

جس زخم کی ہر سکتی ہو تدبیر فوکی
اچھا ہے سراغ گشت حسانی کا تصور
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے خوشگلی سے
دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو حیر کو

لکھ دیجیو یارب اسے قیمت میں عدو کی
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوٹہ لہو کی
یاں تو کوئی سنتا نہیں خسریا دوسو کی
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہر گلو کی

مدد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں ہے ایک بیت غریبہ جو کی۔
ق گ ب
۱۸۳۲

چاہئے کہ اپنا کو بستا چاہئے
صحبہ رندان سے واجبت حذر
چاہئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
چاک مت کر حیب بے ایام گل
دوستی کا پردہ ہے بیکارنگی
رشتہ نے میری کھو یا غیر کو
اپنی رسوائی میں کیا جاتی ہے سہی
منہ مرنے پہ ہو جی کی امید
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے
بارے اب اس کے بھی سمجھا چاہئے
نچھ ادھر کا بھی اسٹلا چاہئے
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے
بس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے
یار ہی ہنگامہ آرا چاہئے
نا امید ہی اس کی دیکھا چاہئے
چاہئے دالا بھی اچھا چاہئے

چاہتے ہیں خوردیوں کو اسلہ
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے
 وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
 دے مجھے تیش دل محال خواب تو دے
 کرے ہے قتل لگاؤٹ میں تیرا رو دینا
 تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آہ تو دے
 دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہسکو
 نہ دے جو برس، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
 پلاوے اوک سے ساقی، جو ہم سے لغت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے
 اسلہ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
 کہا جو اس نے دے امیرے پاؤں داب تو دے
 زیادہ کی کوئی نے نہیں ہے
 کیوں بوتے ہیں باغبان ترے
 ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
 ہاں کھا نیو مت فریب ہستی
 شادی سے گزرا کہ غم نہ ہو دے
 نالہ پابند نے نہیں ہے
 گر باغ گدائے نے نہیں ہے
 پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
 ہر چند کہیں کہ ہے "نہیں ہے"
 اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

غالب نامہ

کیوں رو قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی تے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، ولے اُنکی تمنا نہیں کرتے
درپردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے
یہ باعثِ نو میدیٰ اور بابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

دیکھ کر درپردہ گرم دامن افشانی مجھے کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں مرجا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ رہے التفاتی، اسکی خاطر جمع ہے جانتا ہے محو پریشانی عریانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی لکھ دیا من جملہ اسبابِ ویرانی مجھے
برگماں ہوتا ہے وہ کافرنہ ہوتا کاش کے اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے
وائے وال بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
دعدہ آنے کا وفایکچے، یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچی ہے میسے گھر کی دہلی مجھے
اَلِ نشا طِ ابدِ فصلِ بہاری، واہ! واہ! پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلِ لحرانی مجھے

دمی مے بھائی کر حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

غالب نامہ

چشمِ خواباں خامشی میں بھی زارِ پروا ہے ۲ سرمد تو کہو سے کہ وودِ شعلہ آواز ہے
 پیکرِ لکھنؤ سازِ طالعِ ناسا ہے ۲ نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
 دستِ گاہِ دیدہ خونِ سبایہ بخونِ دیکھنا
 ۲ یک بیاہاں جلوہ گلِ فرشِ پائنا ہے
 کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
 جفا نہیں کر کے اپنی یادِ شرمِ آجائے ہے مجھ سے
 خدا یا جذبہ دل کی مگر تائبی سرائی ہے
 کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے
 وہ بدخوا اور میری داستانِ عشقِ طو لانی !
 عبارتِ مختصر و قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
 اور وہ بدگمانی ہے اور حریہ نافرمانی ہے !
 نہ پرہیزا جائے ہے اُس سے نہ ہوا جائے ہے مجھ سے
 سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا کیا مت ہے
 کروا مانِ خیال یا رہیو تابائے ہے مجھ سے
 صحتِ برونِ نگارگی میں بھی ہو سکتی
 وہ دیکھا جائے کب یہ غم دیکھا جائے ہے مجھ سے
 بھونے میں یا نزل ہی پہلے نیر و عشق میں نہ چلی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
 قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
 وہ کا فر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھے
 لا عزائنا ہوں کہ گر تو بزم میں حبا دے مجھے
 میرا ذمہ دیکھ کر اگر کوئی بتلا دے مجھے
 کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے جسم
 واں تلک، کوئی کسی جیلے سے پہنچا دے مجھے
 منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ انداز عتاب
 کھولکر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلاوے مجھے
 یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
 زلف گر بن جاؤں، تو مشانے میں ابھلاوے مجھے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
 صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ مکنشی
 رسوائے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم
 کہتا ہے کون نالہ بلیل کو بے اثر؟
 پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
 کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم کلمہ
 دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
 تھے یہ ہی دو حساب، سوئوں پاک ہو گئے
 بارے طبیعتوں کے تو جبالاک ہو گئے
 پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے
 آپ اپنی آگ سے خس و خاشاک ہو گئے
 کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اُسے اسدا کی نش
دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہو گئے

ق گ ب
۱۸۲۲

دلت ہوئی ہے یار کو مہاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر نخت نخت کو
پھر وضع احتیاط سے رکنے نکلے دم
پھر گرم ناہائے شہر بار ہے نفس
پھر پیش جراحت دل کو چلائے عشق
پھر بھر رہا ہے خامہ مرگاں، بہ خون دل
باہمہ گر ہوئے ہیں دل دودھ پھر رقیب
دل پھر طواف کر کے ملامت کو جانے ہے
پھر شوق کر رہا ہے خیریدار کی طلب
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل دلالہ خیال
پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
مانگے ہے پھر کسی کو لب لبام پر ہوس
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پشے ہیں

جوش قہج سے بزم چراغاں کئے ہوئے
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مرگاں کئے ہوئے
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے
سامان صد ہزار مسکداں کئے ہوئے
ساز چمن طراز مئی داماں کئے ہوئے
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
پنڈار کا سنم کردہ ویراں کئے ہوئے
عرض متاع عقل و دل دہاں کئے ہوئے
صد گلستاں بنگاہ کا ساماں کئے ہوئے
حماں نذر دغیر مئی عنوان کئے ہوئے
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
سرے سے تیز دشتِ زمیں کئے ہوئے
چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہوئے
سرا زیر بار منتِ درباں کئے ہوئے

دیوان غالب مملو کہ خان بہادر سید ابو محمد

(ص ۹۵)

پر ہرگز نہ ہوں مگر گمانِ سخنِ خدایا
 اے لایزالِ طرزِ علمان ائی ہوئے
 باندہ کسویں میں اے دیدہ بہرِ قریب
 انتظارِ خیال کا سامان کی ہوئے
 دل پر طواف کوئے طاعت کو جانو
 انتظار کا صبر کتن دیران کی ہوئے
 پیرِ شوق کروم ہی ہر یکا کی طلب
 عرضِ شمعِ عقل و دل و جان کی ہوئے
 دوشی ہی ہر یکا کی کل لاؤ خیال
 مددِ کل کی نگاہ کا سامان کی ہوئے
 بہرِ جانتا ہوں نامہ دلا رکھوں
 جانِ نذرِ دلفریبی غرائف کی ہوئے
 ناکی ہی ہر یکا کو لبِ بزمِ بوس
 زلفِ سیاہِ رخ پر بزمِ بزم کی ہوئے
 جاسی ہی ہر کسو کو مستطیل میں آرزو
 سرِ سی تیرے شوقِ نگوں کی ہوئے
 ایک نو بہارِ نازِ کمال کی ہر نگاہ
 چہرہ فرنی ہی ہر یکا کی ہوئے
 ہی نہ ہوتے تھی ہر یکا کی مستحکم
 شہی ہر یکا کی ہوئے
 ہر یکا کی ہر کسو کی ہر یکا کی ہوئے
 سرِ زبیرِ بزمِ بزم کی ہوئے
 غالب ہی ہر یکا کی ہر یکا کی ہوئے
 شہی ہر یکا کی ہوئے
 تمام شد غزلیات

(۱) نسخہ دستخط خان بہادر سید ابو محمد
 (۲) نسخہ دستخط خان بہادر سید ابو محمد
 (۳) نسخہ دستخط خان بہادر سید ابو محمد

جی دھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
 بیٹھے رہیں تصورِ حبا ناں کئے ہوئے
 غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
 بیٹھے ہیں ہم آہستہ طوفان کئے ہوئے

ق گ ب
 ۱۸۳۲

چکنی ڈلی

ہے جو صاحبِ کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
 خامہ انگشت بہ دندان کہ اسے کیا لکھے
 ٹہر مکتوبِ عزیزاں گرامی لکھے
 مسی آلودہ سرا انگشت حیناں لکھے
 خاتم دستِ سیماں کے مشابہ لکھے
 اختر سوختہ قیس سے نسبت دیکھے
 حجر الاسود دیوارِ حرم کیجے عرض
 وضع میں اس کو اگر سمجھے قافِ تریاق
 صومعے میں اے ٹھہرائے گر ٹھہرنا ساز
 کیوں اے قفلِ درِ پہنچِ محبت لکھے
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
 کیوں اسے تلمکے پیرا بہنِ بیلا لکھے
 اپنے حضرت کے کف دست کو دل سیجے زمین

زیب دیتا ہے اُسے جہنمِ راجھا کہئے
 ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے
 حریرِ بازوئے شکرِ ناں خود آرا کہئے
 داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہئے
 سرِ بیتانِ پریزا دسے مانا کہئے
 خالِ مشکیں رخِ دلکش سیلا کہئے
 نافِ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے
 رنگ میں سبزہ نوزخِ مسیحا کہئے
 میکے میں اے خشتِ خمِ صہبا کہئے
 کیوں اسے نقطہ پر کارِ تمنا کہئے
 کیوں اسے مردِ مکب ویدہ عنقا کہئے
 کیوں اسے نقشِ پئے ناتواں سلما کہئے
 اور اس چکنی سپاری کو سودا کہئے

تنہائی کی واہی میں

رہے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
 ہر سخن کوئی غماز اور ہر زبان کوئی نہ ہو
 بے درد دیوار سا اک گھر بنایا گیا ہے
 کوئی ہمسایہ نہ ہے اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑے غریب سار تو کوئی نہ ہو تیار دار
 اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلکتہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہنشیں
 اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ مائے ٹائے
 وہ سبزہ زار مائے مفاہک ہے غضب
 وہ ناز نہیں تھا ان کہ وڈا کہ مائے ٹائے
 صبر آزماء وہ آن کی نگاہیں کہ غف نظر
 جس قسم کہ بادہ ان کا اشارہ کہ مائے ٹائے
 وہ میوہ مائے تازہ دشتیں کہ واہ واہ
 وہ بادہ مائے ناب گوارا کہ مائے ٹائے

قطع

مئے وہ دن نادانستہ غیبتوں کی وفاداری
 کیا کرتے تھے تو تقریباً ہر خاموش رہتے تھے
 بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی بننے دو گیاؤ
 قسم تو ہے گریہ جی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

متفرقات

مذگئیں دکھولتے ہی کھولتے آنکھیں نالاب
لوہم مریضِ عشق کے تیسہ دار ہیں
یار لائے مرے بالیں پر اُسے پر کسوقت
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج
رکھ لی مرے خدا نے مری بکسی کی شرم
رکھ لیجو میرے دعوائے وارستگی کی شرم
وہ حلقہائے زلف تمہیں ہیں میں اے خدا
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور

داں اسکو ہول دل ہے تو یاں میں میں شرمساز
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
یعنی یہ میسری آہ کی تاثیر سے نہو
آئینہ تاکہ دیدہ نہ خجسته نہ ہو

سیا ہی جیسے گرجائے دم تحریر کا غنڈہ
مری قسمت میں یوں تھوڑے شہائے ہجران کی

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو
سُن لیتے ہیں گو ذکرِ ہمارا نہیں کہتے
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کہتے

گھر میں تھا کیا؟ کہ تیرا غم اُسے غارت کرنا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیرِ سوئے

پینس میں گزرتے ہیں جو کہ چھ سے وہ میسے
کنڈھا بھی کہا روں کو بدلنے نہیں دیتے

زندگی اپنی جہاں شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اگے ہا ہے درو دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیا باں میں ہیں اور گھر میں ہا سہی ہے

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحِ دل کا
کہ میں میں ریزہ الماس جزوِ علم ہے
بہت دلوں میں تغافل نے تیسے پیدا کی
وہ اک جگہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہوں میں بھی تماشا فی نیز نگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآئے

رباعیت

آتش بازی ہے جیسے شعلِ اطفال
تھامو جبرِ عشق بھی تباہ مت کوئی
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
رکوں کیسے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل سخت نثر ند ہو گیا ہے گویا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے دل سکتے ہی نہیں غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سو گند ہو گیا ہے غالب

یہ بھی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجہاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہِ پیر دال
یہ شاہِ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم ہے اب کی شبِ قدر و دروالی باہم

لے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ رباعیات اور سرز کی ردیف داؤ کی دوسری غزل کب لکھی گئیں۔ ان میں
یا تو غزل کے والد کے ساتھ کافی کی حرف اشارہ ہے یا تجھ کی طرف۔ سو خاندانِ صورت میں مرزا پر
بادشاہ کی عنایات ۱۸۴۲ء سے پہلے ہی شروع ہو گئی ہوگی۔

—

بیان

- ۱- لاله احمر - ۱۸۳۶ تا ۱۸۳۰
ب- گل رعنا - ۱۸۳۰ تا ۱۸۳۶
ج- بادہ شیراز - ۱۸۳۶ تا ۱۸۳۶

زخمہ بر تارِ گرجاں میزنم کس چہ داند تاجہ دستاں میزنم
 زخمہ بر تارم پریشاں میرود کایں نرا لٹے پریشاں میزنم
 راز دینِ خوئے دھرم کردہ اند
 خندہ بردانا و نادان میسنم

غالب

لالہ صحرا غزلیت

بہ شغل انتظار مہوشاں در خلوت شبہا
 بروئے برگ گل تا قطرہ شبم نہ پنداری
 بخلوتخانہ کام نہنگ لاندوم خود را
 کند گریز تعمیر خرابیہائے مار و دوا
 خوشایرنگی دل دستگاہ شوق را نماند
 نزار حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
 خوشارندی و جوش زندہ رود و مشرب مدبش
 تو خوی پنداری و دانی کہ جاں بروم نمیدانی

سرتارِ نظر شد رشتہ تبلیج کو کہ بہا
 بہار از حسرت فرصت بدندان میگزید بہا
 ستوہ آند دل از ہنگامہ غوغائے مطلبہا
 نیاید خشت مثل استخوان بیرون قالبہا
 نمی بالید بجزیش این قطرہ از طوفانِ مشربہا
 بود تہ بند می خط سبزہ خط در تیر بہا
 بہ لب خشکی چہ میری در سراستانِ مذہبہا
 کہ آتش در نہاد دم آب شد از گرمی تہا

مبادا بچوتار سجد از ہم بگسلد غالب
 نفس با این تعیفی برستا بدشور یار بہا

س

شد نگه زنار تسلیح سلیمانی مرا
 وحشت کو تا بروں آرزو عسیری مرا
 سجده شوقی که می باله به پیشانی مرا
 تا نداند صید پر شهبائے پیشانی مرا
 گر موج افتد گمان چین پیشانی مرا

یا سراج الدین احمد چاره جز تسلیم نیست

ورنه غالب نیست آهنگ غزلخوانی مرا (کلکتہ)

بزن آتش که شنیدن زمیاں برخیزد
 بیجا با شود بنشین که گساں برخیزد
 وود از کار که شیشه گراں برخیزد
 بخود از جاذبه جم خفقاں برخیزد
 رسم بیداد مباد از جہاں برخیزد
 واسے گر پرده ازین راند نہاں برخیزد
 خوش بہار سیت کردیم خزاں برخیزد
 همچو موئے کہبتاں راز میاں برخیزد
 چوں من از دودہ آذر نفساں برخیزد

گر دہم شرح ستمہائے عزیزان غالب

(کلکتہ)

رسم امید ہماں از جہاں برخیزد

بر نمی آید ز چشم از جوش حیرانی مرا
 وامن افشا ندم بکلیب وماندہ در بندم
 وہ کہ پیش از من بیادوں کسی خواہد رسید
 باہمہ خرسندی از دئے شکوہ دارم ہی
 تشنہ لب بر سائل دریا زغیرت جاں دہم

تا کیم دو و شکایت زبیاں برخیزد
 می رمی از من و خلقی بگسانست ز تو
 گر دہم شرح عتابے کہ بد لہا داری
 با قدرت مرد و چو شخصیت کہ ناگہ یکبار
 بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر
 کشتہ و عوی پیدا یے خویشیم ہمہ
 زینہار از تعب دوزخ جاوید ترس
 جزوی از عالم و از ہمہ عالم ہیشم
 عمر لا چرخ بگر دو کہ جب گر سوختہ

شبهای غم که چهره به خوناب شسته ایم
افسون گریه بُرد ز خویت عتاب را
زاد خوشست صحبت از آلودگی مترس
اے در عتاب رفته ز بیرنگی سرشک
پیمان را ز باد بخوں پاک کرده ایم
غرق محیط وحدت صبر فیم و در نظر
بیدست و پا به بحر توکل فتاده ایم
در مسلخ دنا ز حیا آنگشته ایم

غالب رسیده ایم به کلکتہ و بہ
از سینہ داغ دوری اجاب شمنہ ایم



گر ہر دو گریں ہمہ رعنائی و ہم ست
اندیشہ دو صد گل کدہ گل برده بدمن
آں وعظ نقیہانہ ز اہد کہ نزدیک
واں نغمہ مستانہ زنداں کہ نیز زو
آں حسن و دم ناز ز افسوں ادائی
واں عشق و گہ عجز بہ امید نگاہے

شاد آنکہ بہ نیرنگ نگر دید فریبا
اما ہمہ از نقش و نگار پر عنفتا
بر صفحہ دیں نقش رواج غم نریا
دم سردی امروز بسر گرمی نسر دا
جاں باز میدان بہ تن صورت دیبا
از خویش گزشتن سہراہ تمنا

گرویدن هفت اختر و نه چرخ بهر سو
گل کردن صدر رنگ بهار از جگر خاک
هنگامه ابلیس و نشان دادن گندم
دانسته شود هر چه زاسر اقلین
از خامه نقاش برون نمانده هرگز
و حدت همه حدیث معین که خدای زده
طرفی نتوان بست بهر گرمی او نام
آئینه به پیش نظر و جلد و فراوان
پیدا و نهان مشغله حب ظهور است

زین عریه بالیدن آثار بهر جا
به جستن یکدمه شر از زنگ خار
افسانه آوار گشته آدم و حوا
سنجیده شود بهر چه ز آثار من و ما
هر نقش که بینی ز پس پرده هویدا
هستی همه جز نیست حقیقی که مرا و را
هرگز نتوان کرد پیرا گنده براجزا
دل پر یوس و صاحب خلوتکده تنها
چون پرده برافتنه نهانست نه پیدا

تخته دیر

تعالی الله بنارس چشم بد دور
تناخ مشربان چون لب کشانید
که هر کس کا ندران گشتن بمید
چون سرایه امید گردد
زهی آسودگی بخش روانها
شکفته نیست از آب و هواش

بهشت خرم و سر دوس معمر
به کیش خویش کاشی راستانید
و گر پیوند جسمانی نگیرد
مردن زنده جاوید گردد
که داغ چشم می شود ز جانها
که تنها جان شود اندر نفسايش

غالب نامہ

بیا اے غافل از کیفیت ناز
 ہمہ جا نہای سپہ تن کن تہا شا
 نہاد شاں چو بوی گل گران نیست
 خن و خارش گلستانست گوئی
 سوادش پاستے تخت بت پرستان
 عبادتخانه نا تو سیانست
 بتانش را ہیولے شعلہ طور
 میا نہا نازک و دلہا توانا
 تبسم ہسکہ در بہا بیعیست
 ادائے یک گلستان جلوہ مرشار
 بہ بطف از موج گو ہر نرم دوتر
 ز انگیز قد انداز خرامے
 ز رنگیں جلو با غار نگریہش
 ز تاب جبرہ خویش آتش افروز
 ہسانان دو عالم گلستان رنگ
 قیامت قاتل مرثکان ازاں
 بہ تن سرمایہ افزایش دل

ٹکا ہی بر پری زادانش انداز
 نثار د آب و خاک این جلوہ حاشا
 ہمہ جا نہ جسمی در میان نیست
 غبارش جو ہر جہاںست گوئی
 سراپایش زیار نگاہ مستان
 ہما نا کعبہ ہند و ستانست
 سراپا نور امیز چشم بد دور
 ز نادانی بکار خویش دانا
 و بہتہار شک گلہائے بیعیست
 خرامے مسد قیامت فتنہ و بار
 بنا از خون عاشق گرم دوتر
 پیائے کلنے گسترہ دایمے
 بہار بست و نوروز آغوش
 بتان بت پرست و بہ ہمن سوز
 ز تاب رخ چراغان لب گنگ
 ز مرثکان بر صدف دل نیزہ بازاں
 سراپا مشر و آسایش دل

بہستی موج را فرمودہ آرام
ز نغمی آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورشی و رستاخیز
ز ماہی صد دلش در سینه بیتاب
ز بس عرض تمنائے کند گنگ
ز موج آغوشها واسیکند گنگ
ز تاب جلوه بیتاب گشتہ
گہر باد در سد فدا گشتہ

بادِ مخالف

اے تماشائیاں بزم سخن
اے سخن پروران کلکتہ
اسد اللہ بخت برگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہماں شماست
بہ نظلم رسیدہ است اینجا
کار احباب ساختن رسم است
آن رہ و رسم کار سازے کو
کیستم و شکستہ غمزدہ
برق بے طاقتی بحبان زدہ
از گداز نفس بہ تاب دہتے
دے سیجا دماں نادرفن
دے زبان آوران کلکتہ
دو خم و پیچ عجز مرگشتہ
بے سخن ریزہ چین خوان شماست
بامید آرمیدہ است اینجا
میہماں را تواضع رسم است
شیوہ میہماں نوازے کو
بدلے خستہ ستمزدہ
آتش غم بخان دماں زدہ
در بیاباں یاس تشنہ لبے

خس طوفانے محیط بلا
 درد مندے جگر گداختہ
 در آگاہی فنا زده
 چہ بلا کشیدہ ام آخر
 بس یہ روز غریبم بنید
 اندہ دورے وطن نگرید
 نہ ہمیں نالہ و نغناں بلہم
 من کہ دعوایم و ادوی کرین
 با بزرگان نیار نہ دارم
 بندہ ام بندہ مہربانان
 نہ ز آویزش ہیاں ترسم
 کہ پس از من بسا لہائے دراز
 کہ صفیہ رسیدہ بود اینجا
 با بزرگان ستیز و پیش گرفت
 شورش چشمے و زشت خوئے بود
 برگ دنیا نہ ساز خویش بود
 آہ ازاں دم کہ بعد رفتن من

سر بسر گرد کاروان فنا
 از غم و ہرزہ ہواختہ
 ہمہ بر خویش پشت پا زده
 کہ بدینجا رسیدہ ام آخر
 تیرہ شہائے وحشت بنید
 غم حبراں انجمن نگرید
 من و جاں آفدین کہ جاں بلہم
 ساز بزم سخنوری کہ دن
 ہم بدین شیعہ ناز نہ دارم
 رمز قہمان و نکتہ دانان را
 من و ایمان من کزاں ترسم
 بزرباں ماند این حکایت باز
 چند روز آرمیدہ بود اینجا
 زخمے داد و راہ خویش گرفت
 بجیلے و سرزہ گئے بود
 تنگ دہلی دسرد میش بود
 خون دہلی بود گردن من

تاب ہنگامہ ام خدا را نیست مہربانان دلست خارا نیست
دینک در پیشگاه بزم سخن بربانہا فتادہ است زمین
کہ فلاں با قتل نیکن نیست مگس خوان نعمت او نیست
زلہ بردار کس چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم

فریاد

نہ مراد دولت دنیا نہ مرا جبریل نہ چو نرود توانا نہ شکیبا چو خلیل
بار قیباں کف ساقی بے ناب کریم باغریباں لب جیوں بدے آب بخیل
اے یہ سمار قضا و قحط چشم ابیس بدم گرم رواں سوختہ بال جبریل
یا تو ام قزمے خاطر موسے بر طود با خودم خستگی لشکر فرعون نبیل
بر کمال تو در اندازہ کمال تو محیط برو خود تو در اندیشہ وجود تو دلیل
نہ کنی چارہ لب خشک سلمانے را اے تبرسا بچکاں کردہ منے ناب بیل

غالب سوختہ حبال را چہ بفتار آدمی
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قلیل

تشبیب قصیدہ

تو اے شاہ ندانی کہ غم از آزار تو اے سپہرہ نبی کہ ترسم از بیداد

تراغیبست بسرمایہ گرانے کوہ	مراد نیست بنیر وے تیشہ فرود
من و بلائے تو نطح ادیم و تابہیل	من جفاے تو شاگرد و سید استاد
من و ستم دل رنجور و التفات طریب	من خطر رگ مجنوں و نشر فصا
بگوش تاب طبیعت روم معاذ اللہ	ندیدہ ام کہ ادکیست جملہ بست و کشا
ستارہ را ہر فتنہ اتقائے قضا است	چنانکہ جنبش نرداز اناہل نراد
فلک کجائی و طالع چہ دستارہ کرام	کنم شکایت دشمن ز دوست شرم با
غزل سرایم و در مہر پیچیم از اندوہ	ترانہ سخم و بر خیسزم از سر فرود
بیا کہ شوق عسبان سخن بگرداند	ز سدا کلام شکایت بہ مرغزار واد
بیا کہ نیت شبانے بدین نشاط و طلال	بیا کہ نیست دولے بدین بیاض و سواد
بیا کہ زود سراید زمانہ اندوہ	نشود روان گرامی ز بند تن آزاد

بیا کہ دادہ نوید نکوئی سرجام
حسین ابن علی آبروئے دانش و داد

شباب

آں ملجم کہ در چمنستان بشاخسار	بود آشیایاں من شکن طرہ بہار
آں مطرب کہ ساز نوئے خیال من	غیر از گندہ جا ذبہ دل نداشت تار
آں ریشہ نگاہ امیدم کہ و مبہم	بود از تم طراوت دل شو تم آبیار

ہر غنچہ از دم بفضائے شگفتگی
 ہر جلوہ راز من بقاصدائے دلہے
 ہم سینہ از بلائے چنایہ دلبران
 ہم دیدہ از ادائے خاں شویہ شاہان
 شو قم جریدہ رقم آرزوئے ہوس
 فکر مجیب شایہ اندیشہ گلشنال
 از چشم دل نہاد مرا برد تاج و تخت
 بختم مجیب عشرتیاں میفشاند گل
 وقت مرادوائے گوشہ در آستین
 ساقی ز بادہ بر اثر نغمہ عذرا خواہ
 از پردہ لائے ساز نغمہا از فشان
 ہموارہ ذوق مستی و بہر و سر و سو
 با کبیدہ و جھومت و با کاسہ در کجای
 بدستی تہینہ و خواب سحر گہ
 اکنون منم رنگ بر دیم نے رسد

فیض نسیم و جلوہ گل داشت پیشکار
 از غنچہ بود محل ناز سے برگزار
 فرہنگ کار دانی بیداد روزگار
 فہرست روزنامہ اندوہ انتظار
 ذوقم قلم و ہوس مژدہ کنار
 کلکم بطرف گلشن نظر لالہ کار
 دزد رنگ بوساطہ مرا بود پودتار
 سعیم ز پائے محفتیاں میکشید خند
 بزم مرا طراوت فردوس دکنار
 مطرب ز نغمہ در ہوس بارہ تن گوار
 وز جلوہ لائے ناز نظر کار شمشاد
 پیوستہ شعر و شاد و شمع و می و قمار
 رندان پاکباز و شگرفان شاد و خوار
 رنگینے سفینہ و اشعار آبدار
 تارخ بخوں دیدہ بشویم ہزار بار

چشمم کشورہ اندک بردار لائے من
 تہا بندہ نامیسم و از رفتہ شرمنا

گلِ عِنا غزلت

سود میدہ گل درو میدنت محسپ
 مشام را پشیم گلے نوازش کن
 ز خویش حسن طلب بین درد صبر حی کوش
 ستارہ سحری مرثوہ سنج دیدار نیست
 تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم
 نفس ز نالہ پسنبل درو نیست بجز
 نشاط گوش بہ آواز قنقلست بیا
 نشان زندگی دل دروید نیست مایست
 ز دیدہ سود حریفان کشود نیست مہنسہ

جہاں جہاں گل نظارہ چیدنت محسپ
 نسیم غالبہ سادہ زیدنت محسپ
 مئے شبانہ ز لب در چکیدنت محسپ
 بہیں کہ چشم فلک در پردہ نیست محسپ
 بہر پشت و سمت بدندان گزیدنت محسپ
 ز خون دل مرثوہ و دلالہ چیدنت محسپ
 پیالہ چشم براہ کشیدنت محسپ
 جلالت آئینہ چشم دیدنت محسپ
 ز دل مراد عزیزاں پسیدنت محسپ

بزرگ مرگ شہی زندہ داشتن ذوق نیست
 گرت فسانہ غالب شنیدنت محسپ

وگر نہ شرم آگہ در شمار بے ادبیت
ہنوز قصہ علاج حرف زیر لبیت
نہا دین عجبی طبع تو من عریضیت
قدح مباش زیادت قوت بارہ گریضیت
نشاط طر مغسول کیا طلبیت
خوشست گرمی بخشند افش غنیت
عیار بیکے ماضیافت نسبیت
کہ ہو فانی گل در شمار لب العجبت

ظہور بخش حق را ذریعہ بے سببیت
نگیر و دار چہ غم چون بجا لبیکہ منم
رموز میں نشناسم درست و معذوم
نشاط طر طلب از آسمان شوکت جم
بالتفات نیز دم در آرد و چہ نزع
نہ ہم پیا بلکہ ز ابدان ملائے بود
ہر آنچہ در جگر جگر جنس مائل نیست
کیکہ از تو فریب فائز داند

میاں غالب و واعظ ملت شد ساقی

بیاب لایہ کہ ہیجان قوت غنیت

در غنبد سپہر گرد کنیم طرح
بخشیں آہ آب گردش ساغر کنیم طرح
افسانہ بکے غم مکر کنیم طرح
از ما عجب مدار گزارہ مکر کنیم طرح
در راہ عشق جاوہ و گداز کنیم طرح
وز خم رشک روئے در کنیم طرح
وز دود سینہ زلف معنہ کنیم طرح

آب بشتن قاتح خیر کنیم طرح
و فصل وے کر گشتہ جہاں ز جہر براند
آچند نشنوی تو و ما حسب حال نویش
مار از بون گیر گزارہ پا در آدیم
خروا بشاردی بیستیم تمیز کنیم طرح
از داغ شوق پرودہ نشینے نشان کنیم
از مار پرودہ تار تاجہ و تیرہ ساز

برگ خنار شعله و آذر بهیم نهیم
از زخم و داغ لاله و گل در نظر کشیم
از سوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع
پیرایه از شراره و آتش کنیم طرح
از کوه و دشت حجب و منظر کنیم طرح
از غار و غار باله و بستر کنیم طرح

آئین بر همین بهایت رسانده ایم
غالب بیا که شیره آذر کنیم طرح

مژده صبح درین تیره شبانم دادند
رخ کشوند و لب هرزه مرا بپستند
سوخست آتش کده تر آتش فکرم کشیدند
گهر از رایت شایان بپدیدند
افسر از تارک ترکان پشتم بزدند
گوهر از تاج گسستند و بدانش بستند
هر چه در جزیه نگهبران من ناپدیدند
هر چه از دستگه پارس بهیاب زدند
دل زخم مرده و من زنده بهمانین گفتم

هم ناز غار بخوف خطرستم غالب

طالع از قوس و شمار از سر حاتم دارم

عاشق چو گفتیش که بروزد و میرود
ناز من بخوانی غضب استود میرود

از نالہ ام مریخ کہ آخر شد ست کار
شاد م بزم و عطا کہ رامش اگر نیست
فردوس جو عمر پو سو اس دادہ را
ما ہم بہ لاغ و لا بہ تسلی شویم کاش
ریشک و فاکر کہ بدعوئی کہ رضا
فرزند نیر تیغ پدرے نہد گلو

غالب خورشید فرصت موم نکریش

تارے کہ نیست در سرائی پود میرو

چرخیز داز سخن کز درون جہاں نبود
حکیم ساقی و مست دین زہد خوئی
گفتہ ام ستم از جانب خداست وے
ز مام ناقہ بدست تصرف شوست
مرا کہ لب بطلب آشنائو است
بالتفات نگارم چہ جلے بہت است

عجب بود میر جمخو ابے کے غالب

مرا کہ بالمش و بستر ز پر نیاں نبود

یار سب ز جنوں طبع غمے و نظم ریز
سعد باد یہ درقالب پور و دم ریز

غالب نامہ

از مہر جہا تباب میفکدم نیست
دل راز غم گریہ بے رنگ بجوش آر
ہر برق کہ نظارہ گدازست نہادش
سر مست سے لذت در دم بخوام آر
ہر خون کہ عبت گرم شود در دم افکن
ہر جانم آہیت برترگان ترم بخش
از شیشہ گر آئیں فتواں بت شہما
حیرم کہ بافتادن الساس نیزم
ایں سوز طبعی فلک از نفسم را
مسکین خستہ از لذت آزاد ندارد
دجہی کہ بہ پای مزد توں داد و ندارم

ایں تشت پراز آتش سوزاں بہرم ریز
اجزائے جگر حل کن و در چشم ترم ریز
بگزار و بہ پیسانہ ذوق نظرم ریز
وین شیشہ دل بشکن و در رگم ترم ریز
ہر برق کہ بیصرفہ جہد بر اٹوم ریز
از قلم و جیہوں کف خاکے بہرم ریز
باری گل پیسانہ بجیب سحرم ریز
مشتی نمک سودہ بزخم جگر ترم ریز
صد شعلہ جیفشار و بہ مغز شرم ریز
خادم کن و دورہ گزر چارہ گرم ریز
آہم کن و اندر قدم نامہ برم ریز

وادم سر بہ طرعی غالب چہ جزو ست

یارب ز جزو طرعی غنی در نظم ریز

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ
خوشمت کو شرد پاکست بارہ کہ در دست
چمن پراز گل و نسیم و در بانی نے
چنین کہ نخل بلند ست و سنگ نا پیدا

ترا کہ بہت و نیا شامی از بہار چہ حظ
ازاں حقیق مقدس دین خمار چہ حظ
بدشت نقشہ ازین گردی سوار چہ حظ
ز سیرہ تا لغتہ خود ز شاخار چہ حظ

غالب نامہ

نہ ہر کہ خوبی در بہزن بپایہ منصورست
بدین حنیض طبعی ز اوج دار چہ حظ
بہ بند رحمت فرزند وزن چہ می کشیم
ازین نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ
بعض غصہ نظیری وکیل غالب بس
اگر تو نشنوی از نالہ ہائے زار چہ حظ

<p>رفتم کہ کنگی ز تاشا بر افکنم در دجلہ اہل صومعہ ذوق نظارہ نیست معشوقہ را ز نالہ بد انسان کم حزین ہنگامہ را چیم جنوں بر جگر زخم نغم کہ ہم بجای رطب طوطی آدم با غازیان ز شرح غم کار ز انفس یا دیریاں ز شکوہ بیداد اہل دیں ضعفم بہ کعبہ مرتبہ قرب خاص داد تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر رلبہ ز کنج دیر بہ بیند کثودہ ام منصور فرقہ علی اللہیاں منم از زندہ گوہرے چو من اندر زانیت</p>	<p>در بزم رنگ و بو نطے دیگر افکنم ناہید را بزم زمہ از منظر افکنم کز لاغری ز ساعد او زیور افکنم اندیشہ را ہوائے فنون در سر افکنم اہرم کہ ہم بر دے زمیں گوہر افکنم شمشیر را بر عشہ زتن جوہر افکنم مہرے ز خویش تن بدل کافر افکنم سجادہ گستری تو دمن بہتر افکنم بگدا ز م آہ بلیغہ و در ساغر افکنم از خشم شہ پیالہ در کرثر افکنم آوازہ انا اللہ در افکنم خود را بنجاک رہ گز حیدر افکنم</p>
---	---

غالب بہ شرح منقبت عاشقانہ
رفتم کہ کنگی ز تاشا بر افکنم

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
 ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم
 بگوشه نشینیم و در فراز کنیم
 اگر ز شعله بود گیر و دار نشدیم
 اگر کلمیم شود سہزبان سخن نہ کنیم
 گل افکنیم و گلایے برہ ز پاشیم
 ندیم و مطرب و ساقی ترا خیم را نیم
 گچے بہ لایہ سخن با ادبیا میزیم
 ہیم شرم بیک سُو دبا ہم آویزیم
 ز جوش سینہ سحر و نفس فرو بندیم
 بوم شب ہمہ را در غلط بیندازیم
 بجنگ باج ستاناں شاخساری
 بہ صلح بال فشاں صبح گاہی ما
 زید ریم من و تو ز ما عجب بنود

قضایہ گردش طلس گراں بگردانیم
 ز جان تن بسد از دیاں بگردانیم
 بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
 و گرز شاہ رسد از مغاں بگردانیم
 و گریل شود میہساں بگردانیم
 مے آدیم و قدح در میاں بگردانیم
 بکار و بار زنے کار داں بگردانیم
 گچہ بیوسہ زباں درد داں بگردانیم
 بشوخی کہ رخ اختراں بگردانیم
 بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم
 ز نیمہ رہ رہ را با شباں بگردانیم
 تہی سہ زد و گلستاں بگردانیم
 ز شاخسار سوئے آشاں بگردانیم
 گر آفتاب سوئے غاواراں بگردانیم

ہمن وصال تر باور می کند غالب

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم

ایمانی از قحط خریداری کنی خواہ شدن

نازدیرانم کہ سرمست سخن خواہ شدن

غالب نامہ

<p>کو کیم را در عدم اوج قبولی بوده است حرف حرم در مذاق فتنه با خواهد گرفت نشاد با پیش ایدل درین محفل که ہر جانور است ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواهد گزید از تب و تاب فنا یکبارہ چون شتہ سپند حسن را از جلوتہ نازش نفس خواہد کراخت و ہر یکے پروا عیار شیوہ را خواہد گرفت پردہ را از روی کار بہد گر خواہد فساد گر دیندار وجود از نہ گزر خواہد نشست</p>	<p>شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن دستگاہ نازیشخ و برہمن خواہد شدن شیون یخ خراق جان و تن خواہد شدن ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن ہر یکے گرم دواعی خویشتن خواہد شدن نغمہ را از پردہ سازش کفن خواہد شدن وادری خول در نہاد ما و من خواہد شدن خلوت گیر و سلسل انجمن خواہد شدن بحر توحید عیبانی موجزن خواہد شدن</p>
--	---

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخاند

تا نہ دیوانم کہ مرست سخن خواہد شدن

<p>حق کہ حقت ہمست غالبی بشنو من ترانی بچو اب ارانی چہند و چرا سوے خود خواس و بخلوت گر ہم نام باد پردہ چند بہ آہنگ عیسایم برائے تختے تیند برار نہ و صورت ہنر ہر چہ بنجم بتوزاندیشہ پیری پزیر</p>	<p>بشنو گر تو خداوند جہانی بشنو من نہ انیم بشناس تو نہ آئی بشنو انچہ دانی بہ شمار انچہ ندانی بشنو غزل چند بہ پنجبار فغانی بشنو یارہ گوش بہ من داد معانی بشنو ہر چہ گریم بتواز عیش جوانی بشنو</p>
---	--

غالب

داستان من بیداری شہبائے فراق
چارہ جو یستم و نیز فصولی بکنم
تا نہ خسی و بسپایم نقشانی بشنو
من و اندوہ تو چند آنکھ توانی بشنو
سنخے جند ز غمہائے نہانی بشنو
نامہ در نیمہ رہ بود کہ غالب جاں داد

ورق از ہم وروایں مژدہ زبانی بشنو

دولت بہ غلہ نمود از سسی پشیمان شو
از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتوان گشتن
کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو
جونی بخیا باں رو سیلی بہ بیاباں شو
در کعبہ اقامت کن در بنگہ مہماں شو
ہنگامہ صورت را باز بچہ طفلان شو
ہر گوی زین باشی وقف تخم چو کھاں شو
اے داغ بدل و درود ز جہیبہ نمایاں شو
بر خرمن ماہرتے بر مژدہ باران شو

جاں داد غم غالب خستودی روحش را

در بزم عزای گشت در غم غزل خوان شو

ہل ز عہدہ جانے نہ داشتی داری
تو کے ز جویشیاں شدی پیہ پیہی
شمار عمدہ وفاے کہ داشتی داری
ورغ دست نکلے کہ داشتی داری
نکادہ مہر ہنسندے داشتی داری
بہینہ چوں دل و دروایں جان بقیہ

عقابِ مہر تراز ہم شناختن نتوان
خراب بادہ دوشینہ سرت گروم
خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
بد کردگار نگر دیدی وہماں بنفوس
ادائے لغزش پائے کہ داشتی داری
کرتشمہ بار نہالے کہ بودہ هستی
حدیث روز جزائے کہ داشتی داری
بسر ز فتنہ ہوائے کہ داشتی داری

جہانیاں ز تو برگشتہ اندگر غالب
ترا چہ پاک خدائے کہ داشتی داری

صبح میکہ

صبحی کہ در ہوائ پرستار بجاوشن
خیزند دستہ دستہ مغان شستہ بی
آرد و برون گداختہ شمع از لگن
از شود ویریاں گجاں خروش صور
جنبہ کلید بستکہ در دست برہمن
رخشد ستارہ از رخ ناشستہ ہنم
آرد و برون گداختہ شمع از لگن
بروے خاک بظہ کند سایہ دفر
در اہتمام چیدن رسم نماز دن
خواب چراغ کشتہ چرخ بریدہ سر
اموات را زرقص بتی بر در کفن
غوغائے روز پر وہ کشاید خوب زشت
بالہ بنفشہ از قد خم گشتہ دشمن
خیزد گل شکفتہ چور بخور خستہ تن
آہائے کوس خواب را بید زمر و دن

داری مہر فریب ز ازی ہے نشاط
غالب ندیدہ کہ غریبست در وطن

گر بہ غالب

کز بال پر یزاد بود موج ریم او
از خاک و مدغنیچہ ز نقش قدم او
آید بنظر سچہ آواز شکم او
دارد سہر در یوزہ غوغاش زدم او
از پاکی طینت نغور غیسر غم او
در پرورش از نغور حبز قسم او
بر کبک و تذرت اگر خود ستم او
کوئی بہ اثر آب سہیل ست نم او
دوم لایہ کنس آمدن دمبہم او
رزد شکن طرہ خواباں زخم او
باد کف دست من و پشت شکم او

دارم بچہاں گر بہ پاکیزہ نہادے
سرست ادا چوں بزمیں باز خواہ
چوں صورت آئینہ ز افراط لطافت
ہر شیر زبانی کہ بہ بینی بنیستاں
گر جانورے مردہ بہ بنید سر را بہ
ہر بچہ کہ کج شک بے باز سپارد
آرے بود از غیرت انداز خراش
رخشندہ ادیم تمش از لطف زبانش
جوش گل و بالیدگی موج زنگست
در عربدہ چوں بند زوم باز کشاید
تا مہر کش صفو افلاک بود مہر

قطع

بہر مرانیست دم و راہ مصاف
میکشتم نغیر زبان ز طلاف

چوں مرانیست دستگاہ ستیز
میکشایم بے بسایا مانے

در شکایت، نشایدم اسراف	لیک در ہجو بایدم امساک
دست مزد ثنقت اسلاف	بندہ را پرودہ است از سرکار
وجہ شائبستہ بقدر کفاف	در سالانہ برائے دوام
حق من خوردہ اندہیں بگزاف	ملزہ مم کردہ اندھاں بدروغ
داد از حاکمان نا انصاف	آہ از اسرہائے بے آزر

قطعہ

مخلص صادق الوائے تو من	اے کہ خواہی کہ بعد ازین ہاشم
کرے جان و دل فدائے تو من	گر ترا شیوہ شاہی بودے
سوے تپتم و سر بیائے تو من	ور ترا پیشہ شاعری بودے
سفتمے گوہر شنائے تو من	ور ترا پا خسروی بودے
کہ شوم ہرزہ مبتلائے تو من	چوں ازینہانہ مرا چہ ضرور
ناصح مشفقم برائے تو من	راست گویم بہانہ چنہ آرام
نیستم خوش ازین ادا سے تو من	بسکہ بر مال و جہا مغروری
دائے من گر بوم بحبائے تو من	چہ کنی این فساد سیم در دست
خواجہ گر بودے خدائے تو من	بتو ہرگز ندائے ز رو سیم

قطعه ہجویہ

ایا بے ہنر و دشمن و پارسا
چہ نازی بہنگامہ زرد و زر
زما باش فارس کہ ما فاعلیہ
نداریم پرداے ایں شور و شر
تراستیوہ از روی دما بینوا
تو بد روی و بد گوئی و ما کو در

نوائے سروش

غالب افسردہ دل و جان بیا
بے سرو پا و بے نعل و نعل بیا
بخیال را خبیرے بازوہ
ز دل سے ویرین قدرے بازوہ
آں اثر پردہ سازت چہ شد
نرمز و نثار و نگار و نگار
آں نفس نال و گشت کجاست
دل نگاہ و پندت کجاست
در ہر جا جادہ و زنت
زیف تہ و در پیا و زو رفتہ
راہ غلط کردہ با فسون دیو
نہ سچ ہی مرید و رنگ دیو
بندہ زرد و دن از دہشت
مرد خدا وین پند و شنیدت
آہ از دنیا علیہاے تو
وین ہمہ برام و قاضاے تو
گرے نونت کہ ازین پیش بود
عفت بر انداختن نوشی بود

آتش ہنگامہ حباں داشتی	داغ مغال شہوہ ہٹاں داشتی
آل ہمہ دیوانگی و حب اہلی	وایں ہمہ ناکامی و بیجاہلی
آل ہمہ بیراہہ روی ہائے تو	وایں ہمہ بیصرفہ دیوہائے تو
آل ز جہول برق بخورن دن	وایں تخم دایم ہوس تن دن
نیمہ شب از عمر تو در خواب رفت	نیمہ بد پیسودن منتاب رفت
ہیں کہ دریں کار گہ پیچ پیچ	ماحصل سعی تو ایچ است پیچ
اے ہمہ تن دوسرہ شود تو کو	دہر مراب است جود تو کو
خلق کہ از دم نمودیش ہست	وہم تو دانست کہ بودیش ہست
پیروی و ہم مکن زینہار	سر زگرہ بیان حقیقت بر آر
خیر و چہ منصور نوائے زن	ہستی خود را سر پائے زن
ساقی ہمت کہ صلا میدہد	بادہ ز مخخانہ کلام میدہد
ہمت اگر بال کشائی کند	صحوہ تواند کہ ہمائی کند
نیر تو فسیق اگر بردہد	لالہ عجب نیس کہ اخگر دہد
ہمت مانیز شہود حق است	ہر چہ بسنجیم وجود حق است
ہمت ما غیر حق است دہر	کثرت ما وحدت حق است پس

اذا اثر سطوت حق در کلام

حرف ز لب میردم و اسلم

زندگی

ترنالی از غلہ خانہ زندگی کہ سپہر
 سرحدیں علیٰ پرستان بگر وادند
 پرویشاوی وادند و دل منہ کہ قفسا
 چو تیرہ پرندہ استخوان بگر وادند
 یزید را بہ بساط نعیم بنشانند
 گھیم را بہ بساط شبنم بگر وادند

— — — — —

بان شیراز غزلیت

چوں بہ قاصد بسیرم پیغام را	رشتک نزار دکن گویم نام را
آن نمیم باید کہ چوں ریزم حجام	زور سے در گردش آرد حجام را
بیگناہم پیروزیراز من رنج	من بستی بسته ام احرام را
از دل تست آنچہ بر من میدو	می شناسم سخته ایام را
تا نیفتد کہ تن پرور بود	خوش بود گردانہ نبود دام را
ما کجا او کوچہ سودا در مرست	وزرہ ٹائے آفتاب آشام را

دستان رخشم غالب بوسہ جو

شوق نشناسد ہے ہنگام

برادریے کہ درال خضر اعصاب خفتست	ببینہ می سیرم راہ رچہ پا خفتست
---------------------------------	--------------------------------

بدین نیاز که با توست ناز میرسم
به صبح حشر چنین خسته و سیر خیزد
خردش حلقه زندان نازنین پرست
هوا مخافت و شب تار و بجز طوفان خیزد
غممت بشهر شیخون زان پس بکشد غل
دلم به بچه و حبابه و دروازه لرزد
درازای شب بیداری من یکنه نیست
بهین زود و در محراب شده که غفلت را
براه غفلت من هر که بنگرد و ند
و گزاینده راه و در بکعبه چه غفلت

گلو بسایه دیوار پادشاه خفتست
که در شکایت در غم و در خفتست
که سر برانوی زاهد بود یا خفتست
نسته نگر نشستی و نماند خفتست
عس نماند و شمر در حرم مر خفتست
که دزد مر حله بیدار و پار خفتست
ز بخت من خبر آید تا کجا خفتست
در یکجه باز و بد روانده از خفتست
که می یقانه و در کار و در خفتست
مرا که ناکه زرقار مانده یا خفتست

بغراب چون خودم آسوده و در این غالب
نه نشسته غرقه بجز خفت است تا خفتست

پادشاه تنگ دیدم بهنگر
زمن بگرم قیدین کن روی کردی
شکیده ام که نه منی و نه امیدم
دیده دانه و بالید و آشیان شد
نیاز من به سر بت شای نیکی

چو شکست ز سریر کان حلیه نم بنگر
بیا فکاک من و آرمیده و بنگر
ندوین تو شنیده و شنیده ز بنگر
و در انتهای ربه و امیدم بنگر
نگار من شود و زوید و زوید بنگر

بداد من ز سیدی زور و جان و ادم بداد و طر ز تن فلفل رسیدم بنگر

تواضعی نکند بے تواضع غالب

بسایہ خم تیش خمیدم بنگر

بمگر بن کہ پس از من بمگر من یاد آر
من آن نیم کہ زمرگم جہاں بہم خورد
بیام و در نہ ہجوم جواں دسیر بگو
بساز نہالہ گرد ہے ز اہل دل دریاب
بخوشمار و فالہ کے من ز مردم پرس
چہ دید جان من از چشم پر خمار بگو
بسج تاز تو بر من براں محل چہ گزشت
ہزار خستہ و رنجور در جہاں آدمی

یکے ز غالب رنجور خستہ تن یاد آر

دیدم آری نگامہ بجا خواند بشر داشت
طول روز حشر و تاب ہر ذوقی بودہ بس
تا چہ بنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز این چنین
دوش بر من عرض کردند آنچه در کونین بود
از خرابی شد فنا حاصل خوشم زین اتفاق
خود ہماں شورست کا ندر نیست و
جلوہ برقی در ابرو دامن ترا داشت
آتش در سینہ و آہی بسا غداش
زال ہمد کالائے رنگارنگ دل برداشت
بود مقصودم محیط و وسیل ہر داشت

فائل نام

کور بودم که حرم را اندر فرستہ ہوئے دیر
 از جمال بت سخن میرفت باورداشتم
 سوزم از حرامی نے با آنکہ آیم و دیو بست
 تا چو می کردم اگر بخت سکندر داشتم

ایست میدان که غالب چوں بر بردم بد
 مشکب مع بسبیل و شغل مندر داشتم

دارم و لے رقصہ گرانبہ بودہ
 دل زان بلا کرد نفسے برق تابانہ
 از ہر خوش نغمہ دارم و ز بخت پسند
 گنام و زہد تیشہ و خواہرین رسد
 خواہم خواب برت سینے اشک شمس
 خواہم شود ہر شکوہ و پینہ و زمان
 باریں دوانے پڑنے تا جہان پسند
 بادستان مباحہ دارم و ز سہاوی
 فحلت نگر کہ در حسنا نہ نیافتہ
 بر خورشید ز آید چیسرے فرودہ
 بخت آیینان کرد و از تر مرگ دودہ
 خود را در آب و آئینہ رخ نامورہ
 در وقت شرب شاہ پیستی غنودہ
 پستہ نغمہ پیوہ محمول شودہ
 در گوناگون و سبب با نیا ستودہ
 سجاور و عمامہ ز صنعاں بودہ
 در باب آشنائی نا آرمودہ
 جز در زو است بعصب آشودہ

در بزم غالب آئی و شعر و سخن کرد

خواہی کہ بشنوی سخن من شنودہ

نا ابریزم چشمن چو شاہین شرب خواہ
 زت بہشت و باور صلاست و دیانت
 نہ بیجا بخاب بخش و قحاح بی حساب خواہ
 کہ در بزم من و در بزم من خواہ

تر پادشاہ عہدی بخت تو نو جوان
 در روز مائے فرخ و شہائے دلفروز
 گل بوے و شعر گوئی و گہ پاش و شاد باش
 خون سیاہ نافہ آہو چہ بود صد
 خواہش ازیں گردہ پر یکبرہ ننگ نیست
 اندر از ماحکایت ذوق نگاہ گوئے
 ہر چند خواستن نہ سزاوار شان تست
 در برگ و سادہ گوئے نشاط از بہار بہر
 از شمع طور خلوت خود در اچہ راغ نہ
 از آسمان نشین خود را بساط ساز
 بر خور ز عمر و باج نشاط از شباب خواہ
 صہبا بروز ابر و شب ماہتاب خواہ
 مستی ز بانگ برہط و جنگ رباب خواہ
 از حلقہائے زلف بتاں مشکاب خواہ
 از چشم غمزہ و ز شکن طرہ تاب خواہ
 از کارما کشائش بند نقاب خواہ
 قوت ز طالع و نظر از آفتاب خواہ
 در بزل وجود بیعت خویش از سحاب خواہ
 از زلف حور خمیرہ خود را طناب خواہ
 از ماہ نوجبیت خود را رکاب خواہ

غالب قصیدہ را بشمار غزل در آرد

وزن شہ بریں غزل رقم انتخاب خواہ

گستاخ گشتہ ایم غرور جمال کو
 تا کے فریب حلم حذا را خدانہ
 برگشتہ ام ز ہر دمنے گیریم بہ قہر
 یامی گشت صحبت یا می فرو در ربط
 خواہی کہ ہر فروزی و سونہی در نگاہیت
 پیچیدہ ایم سر زونا کو شمال کو
 آن خوئے خشک لیں داد اے ملال کو
 دارم دو صد جواب دے نہ تنزل کو
 لیکن مرا ملال و ترا انفعال کو
 خواہم کہ تیز سوئے تو بنیم مجال کو

غالب نامہ

گر گفتہ ایم کشتن و بستن بسا مخمذ
 مارا تدار کے بسزا اور خیال کو
 دل نقتہ جوئے و فرصت تکلیف عشق نیست
 ہنگامہ ساز ہی ہر سب زد و بال کو
 در بادۂ طہور غم محسب کجا
 در پیشان خصل لذت ہم زوال کو
 غالب بشعر کہ نہ ظہور می نیم وے
 مادل شہ سخن رسد وریا نوال کو

ہدست و پائے بند گرانے نہادہ
 نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ
 ایمن نیم زمرگ اگر مستہ ام زبند
 ولع و زنا و کسے بکسانے نہادہ
 تادرا میہ طمع بہ پندار بگزرد
 از عطف و رحیات نشانے نہادہ
 تاختہ بلا بنود بے گریز کاو
 در مرگ اتمال امانے نہادہ
 لازمست گردے بچکانے شکستہ
 داد ستہ و سرے بنائے نہادہ
 لا زلہ باغ میدہ کہ نیست بختستہ
 کوز و جیشم اشک نشانے نہادہ
 بر ہر دے فسوں نشانے و میدہ
 بر ہر دے فسوں نشانے و میدہ
 ہر دیوہ را دست بچیانے نشودہ
 ہر دیوہ را دست بچیانے نشودہ

غالب ز قصیدہ بہانہ مجریہ داشت

کاخ و خرابہ گنج نیلے نہادہ

یوں آنگہ تا نہد دل بشار و دلیق
 در دل شگ بفرود تھیں بت ساق زری
 اسے تو کہ پہنچ زور و جزو تو نیست
 در جہت تو ان وقت باد و بارغیب ہی

غالب نامہ

مہر کہ دلست در پریش داغ تو رویدش ز دل
تا چو بد گیرے و ہد باز بر بد اور می
ریشک ملک چہ و چرا چوں بتورہ نمی برد
بیہدہ در ہوائے قومی پرواز سبکسری
حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بگری
کوثر اگر بن رسد خاک خورم نہ بے نمی
طوبے اگر زمین شود ہمہ شتم ز بے بری

بنیم از گداز دل در جگر آتشی چو سیل

غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

ترانہ شوق

زمن گرت نبود باور انتظار بیا
بہانہ جوئے مباحث و ستیزہ کار بیا
بیک ووشیوہ ستم دل نمیشود خرسند
برگ من کہ بسا مان رد نگار بیا
بہانہ جوست در الزام ملی ثوقت
یکے بر غم دل نا امید وار بیا
ہلاک شیوہ تمکین محو استاں را
عنائ گسستہ تراز باؤ بہا ر بیا
زما گستی و باد گیراں گرو بستی
بیا کہ عہد و فانیت استوار بیا
وداع و وصل جدا گانہ لذتی دار
تو طفل سادہ دل و منشین حق امر زست
فریب خور دہ نازم چہا نمی خواہم
ز خورے تست نہاد شکیب نازک تر
بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا

رواج صومہ ہستیت زینہار مرد
متاع میکہ مستیت ہوشیار بیا
حصار عافیتی گر ہوس گئی غالب
چو مایہ حلقہ زندان خاکسار بیا

واسوخت

رفت آنکہ کسب بومی تو از باد کردی
رفت آنکہ گریہ تو جان دارے ز ذوق
رفت آنکہ گریہ لبست نہ بنویں خواستی
رفت آنکہ قیاس را بستر گئی ستردی
رفت آنکہ جانبش وقت گرفتے
رفت آنکہ در اداسے سپاسی آرد
اکثر خود از غفلت تو آزار کی کشے
بنم نہ ز طره کہ تا ہم نہ اندوشت
آز باد گاہ دگر او رفت و گاہ

گل دیدی در دے ترایا و کردی
از موج گردہ آنس احباب کردی
رنجیدے و عمر پرہ بنیب کردی
در چاہی ستائش فریاد کردی
در سبیلہ بحث بالکل و شمشاد کردی
بر گوشت مرغ سہ قفس آزاد کردی
رفت آنکہ از جفا کے تر فریاد کردی
رفت آنکہ خورشید را بدل شاد کردی
رفت آنکہ از تو شکوہ بید او کردی

غالب ہرے کعبہ سر جا گرفتہ است
رفت آنکہ در غفلت و اندیشہ کردی

قصیدہ

اے زوہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
 دیدہ بیرون دروں از خوشنشین پردانگہ
 نقش بر خاتم ز حرف بے صدا انگیزتہ
 چرخ را در قالب ابداع در دایرہ بختہ
 عاشقان در موقف دار و رسن واداشتہ
 غم جو گیر و سخت نتوان شکوہ از دلدار کرد
 گل چو ماند ویر گرد و بدیش بازار مرد
 آتش از روئے گلہائے بہار افروختہ
 جز بدیں آب آتش زردشت نتوان مرکب کرد
 جز بدیں الماس نتوان بخنیں روانہ سفت
 تا دریں صورت ز چشم دشمنان نہان بود
 تا علاج خستگی آسائش دیگر دہد

گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
 پردہ رسم پرستش در میاں انداختہ
 شور و رعالم ز حسن بے نشان انداختہ
 خاک را بر نطع پیدائی ستاں انداختہ
 غازیای در معرض تیغ و سناں انداختہ
 بہر آسانی آسائش آسماں انداختہ
 بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ
 شعلہ در جہاں مرغ صبح خزاں انداختہ
 کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ
 رختہ از اسلام در کشیش معناں انداختہ
 دوست را اندر طلسم امتحال انداختہ
 خار را در درہ گزارد میہماں انداختہ

میسر ایم نغمہ توحید و شربائے نوا
 چوں نیم سوراخہا در استخوان انداختہ

ترکیب بند

شب نشیناں را دریں گزنده ایوان دیدم
زہر را اندر دوائے نوحہ سیریاں دیدم
بولے را در دو عشرت گہ دو مہماں دیدم
ماہ را در شور و گیسواں را بہ میہاں دیدم
سر بہم خواب زیر بال پنہاں دیدم
نامہ فیض سحر پوشہ عنوان دیدم
حرہ سخیل بہا لیں بر پریشاں دیدم
خنجیر را در رخت خواب آلودہ دہان دیدم
صبح ثنائی را بریں جنگ مرختہاں دیدم
مہر را ز غمان روزگار ہم کردہ اند

آن سحر خیزم کہ مرہ را در شبستاں دیدم
اینت خلوتخانہ روحانیان کاخباں دیدم
ہر یکے نادر غزیرہ ہر یکے نازاں بخوش
ہرگز اسے ناداں بر سواں نہ بندی ال کہ من
رفتہ ام ز اں پس سیر باغ و مہماں زہاں
گلک ہرج و مرجت گل دم ز گردش نازد
شاہ باد سحر گاہی چہ نبش نامہ
با درستانہ کی جنید و شہنم چہ سیکہ
صبح اول گوہر کے کس نب و درازیا

مہر را ز غمان روزگار ہم کردہ اند
تا بخورند کوش تہہ نفس نور ہم کردہ اند

غروبشہ روزان دور از دانش منز
رشتہ تبس و طویراتے خطا نش منز
شومس و شمشیر چہیں و کیرا نش منز
رختہ سستہ ز نیر و کیرا نش منز

روشنای چرخ در صبح سیر نش منز
ثابت دیدار گردون دارمہ بہتہ بعد
نزدان کایاب و کس بہنتی خلک ل
در نمی شہر و در نہ تہیہ ستیزت مرغ

زہرہ نازو گر بہ بقیسی سیما نش منم
وزادب شرمندہ خار مغیلا نش منم
خورده ام از شست غم تیریکہ پیکان نش منم
نیش چوں مغز دلم کا و دزبان نش منم
خانہ دارم کہ پندارند و ربان نش منم

تیر نازو گر بہ اور سی بنجاک انداز مش
کعبہ بامن از مروت عذر خواہ پایے ریش
در غریبہ غیش را از غصہ در دل میخلم
نوش چوں راہ ہم گیر دوا فہش نیم
ماندہ ام تنہا بکج از دور باش پاس وضع

پایہ من جز بچشم من نیاید و نظر
از بلندی اختدم روشن نیاید نظر

ہم ز خود رنجم گرم از دشمن آزارے رسد
خول فتہ در دل ز زخمے کز سر خارے رسد
میرود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد
بت پرستان را سلام از نقش دیوارے رسد
نئے گمان باطلے کزو ہم ویندارے رسد
ہر کس افروز چرخے چون ثباتے رسد
جاں فزاتر باشد آں کز یا سمن آئے رسد
گرچہ از ہر در نصیب ہر طلبگارے رسد
تازہ گردوم از دروائے خواجہ گزائے رسد

مرد نبود کہ ستم بہ خاطرش بارے رسد
در رہ یارم ز رشک پایے رہ پیائے خود
سیخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سوت
راحت مار از بیرنگی برات آدوہ اند
وانش آں باشد کہ چشم دل بخت بینا شود
طور و نخل طور نبود گرچہ در فراگاہ خویش
از دم باد سحر گاہی دل آساید وے
خوش بود دریندہ فیض آہی از علی
کہنہ دالم گرد ہندم طلیساں مشتری

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و با علی دیوانہ ام

نوحہ

وقت کہ دیدیچ و خیم نوحہ سرانی
وقت کہ در سینه زنی آل عساری
وقت کہ جبریل ز ہمیسالگی درد
وقت کہ آن پردگیان کز زخم غم
از خیمہ آتش زده عریان برآئند
جانہا ہر افسردہ تشویش سیری
سوز و نفیس نوحہ گراز تلخ نوحہ
سر پنچہ حسانی شود رنگ برانی
غم را ز دل فائسہ خواہر بگدائی
بر درگم شان کردہ فلک نصیب سالی
چون شعلہ و غماں بر سر شان کردہ زانی
و ہا بر خون گشتہ اندوہ دہانی

اے چرخ چو آن شد و گراندہ ہر چہ گوی
اے غاک چو این شد و گرا آسودہ چسپانی
خون گرد و فندہ ریز اگر صاحب بیری
بر فیروز و بخوں غلہ گرازان و فانی

تہات حسین ابن عسل و عسل
تویع شفاعت کہ پیروز زندہ او داشت
زیادہ ازل عامل شتر با امت
زیادہ ازل زاری رنہ تا بہ وقت فی
زیادہ بیماری رختہ و رونی
البتہ تو کبہ رفتی و عباس کجائی
از توی حسین ابن علی یا نہت یوانی
زیادہ ازل خنودہ اسیر حسدانی
زیادہ ازل خنودی و بہ بڑت فونی
زیادہ ازل و رگی و بہ سہ یوانی

غالب جگرے خوں کُن واز دیدہ فرو بار
گر روئے شناس غم شاہ شہدائی!

قصیدہ

کہ از نیست برابر دے شہر بارگرہ	ردیف شعر ازال کردم افتبارگرہ
کہ پیش ناخن تدبیر اوست خوارگرہ	گرہ کشائے رموز خرد بہا و شاہ
ز بندہ در خصم ابرو رواہ دارگرہ	ایا شہنشاہ کشور کشائے دشمن بند
بہ پیچ و تاب و لم راود فشارگرہ	کہ چوں بدین صفت اندر ضمیر من گذری
شود ز تنگی جا و در دم فگارگرہ	ولست تنگ زان رو مشو شتم کہ مہاد
مزن بر شتہ امید زینہا رگرہ	بد لکشتائی گفتار من کہ غالبدا
کہ در دولت ز صفا نیست پایدارگرہ	ازین گرہ کہ بر ابرو زدی چرا رسم

نشاط سال نو و جشن این ہمایوں سال
بروز ناصیہ شاہ نامدارگرہ

خطاب بہ ذوق

کے ہر گوئی فلاں در شعر ہستنگ نیست	اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ
کاں دوشم بر گئے ز نخلستان فرہنگ نیست	نیست نقصان یکدوجہ زبوت ارمواد ریختہ

فارسی ہیں تابہ بینی نقشہ ہائے رنگ رنگ
فارسی ہیں تابہانی کا اندر اقلیم خیمال
کے درخشد جو ہر آئینہ آبا قیست رنگ
ہاں من و یزدان بنائے شکوہ بر بند و ناست
دوست بدوی شکوہ بر بکرم ہضم نیریت
بخت من ناساز و نعمت دوست زبان ناساز
دشمنی را معنی شرط مست و آں دانی زمینیت
در بن چل ہمز باں و ہمنوائے من نہ
راست میگوم من داز راست من تو کی کشید
میفرستم تا نظر کہ و جہاندار این دوق
دیوہ و سلطان سراج عدین جہاندار شدہ
حرم ختم شاہی کہ در جنگ من و من سپید
آزادی و غرانی و نسا قانی سلطنت نام
شاد میدان کہ من خراج شہر بک فریت
از ادب و درم ز خاقان و دزد و خباہت

بگذر از مجموعہ اردو کہ ہر رنگ نیست
مانی و از رنگم و آں نسخہ از رنگ نیست
بسیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں رنگ نیست
تانا پندار می ہر خاش تو آہنگ نیست
کایہم سید و بد من اندل تنگ نیست
تا چہ پیش آید کنوں با بخت خود جنگ نیست
از تو بند و فخر و رسا نہ کہ در جنگ نیست
چوں دست را بچہ و تاب نہ شک جنگ نیست
ہر چہ در گفتار و فرست آں شک نیست
نامہ بر باد اگر خود طاس کہ رنگ نیست
آں شرر بیند کہ چہاں در رنگ نیست
میرا نہ گفت و دانا کہ سر رنگ نیست
پادشاہ عدوت و ہمشیرہ سر رنگ نیست
مگر تو بدیشی کہ زین دستاں نیز رنگ نیست
خطوہ و دغا تو کوئی میں را شک نیست

مقطع این قصیدہ ازین صریح معنیہ باد و من
ہر چہ و طاعت و خراج شہر بک فریت

مرثیہ شاہزادہ

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو
اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو
اے خوں بدیدہ دروگداز جگر زست
اے خوں بدیدہ دروگداز جگر زست
اے لب بنوحہ نالہ جانکاہ سازدہ
اے لب بنوحہ نالہ جانکاہ سازدہ
اے خاک چرخ گرتوان روز جا آئے
اے خاک چرخ گرتوان روز جا آئے
اے نور بہار چوں تن سہل بخوں بخلط
اے نور بہار چوں تن سہل بخوں بخلط
اے ماہ تاب روی پیملی کمبود کن
اے ماہ تاب روی پیملی کمبود کن
اے فتنہ باد صبح وزید انقدر محسب
اے فتنہ باد صبح وزید انقدر محسب

آہ ایں چہ سیل بود کہ مار از سرگذشت

تنہا ز سرنگو کہ ز دیوار و درگذشت

بایا و شاہ عمر چہا کرد روزگار
بایا و شاہ عمر چہا کرد روزگار
در بزم عیش نوحہ مرا کرد روزگار
در بزم عیش نوحہ مرا کرد روزگار
از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار
از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار
کام اجل بہریدہ روا کرد روزگار
کام اجل بہریدہ روا کرد روزگار
شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار
شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار
آغوش گویہر چہ داکر و درگار
آغوش گویہر چہ داکر و درگار

اے آنکسوں کہ خاک رہ شہریار را
تو جیسہ آبروئے شما کرد روزگار

ہر چند بے اہل نتوان بھوگاہ مُرد
آتش بخود زیند کہ فرخندہ شاہ مُرد

اے قوم خویش را بشکب متحان کیند
ظلمت شاہزادہ و در رہ خطریست
از میرہ و گل آنچہ دلش خواہد آن دمید
ہر حرف و لکین کہ بگوئید و نشنو
در خود ز نقش نتوانید بازداشت
گیرید دشمن در کف دہم بر بگرزیند
ز بہار پیش شاہ گم کیند و تیر
اے اہل شہر و قریں این دو ماں کجاست
حاکم بفرق نوا یکہ خسرواں کجاست

اے رہ نور و صاف باہا بکون
از سایہ دلم تو بہ پیش شد سما
زال ہیں کہ با تو آہوئے جہاں نیست
با گرغان و مرد و فغانے نہ مستی
با بخودان بکھنڈ نام نہشتی
ما بے تو در جہیم تو بے ما بکون
اے غمت و در شیمین غمت چکون
در روندہ جہاں بتاں بکون
با خودیات آئینہ سیں بکون
ز خویشتن جو سہ نہ تنہا بکون

بے مطرب و ندیم و غلامان خروال بے باغ و قلعه و لب دریا چگونہ
 بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت اینجا عزیز بودہ آنجا چگونہ
 اسے بعد مرگ رات بہ خوار تو عالمے
 پروانہ چرخ مزار تو عالمے

قصیدہ

داد کو تاستم بہ اندازد	طرح نہ چرخ دیگر اندازد
در رگ ساز من نوائے بہت	کہ بہر غولہ آخگر اندازد
زین نوائے شرر فشاں ترسم	کاش اندر نوا گم اندازد
سرگزشتیت بر زبان کہ زبان	بر من از خویش خجبر اندازد
بامداداں کہ آسمان خوابد	کاہر من راز پادرا اندازد
لمعہ مہر در رگ جانیش	خلعہ نوک تشر اندازد
تا ز چستی بہ مبحث کشتن	نون مصدر ز مصدر اندازد
ز نگہبار می زنی بہ ساقم دیو	از رخ زشت چادر اندازد
وانگہ از زیر گوشہ چادر	گوہر آموہ مجید اندازد
گوہر آما پرند در پیچید	از برد و ووش گوہر اندازد
کچہ و بارہ گہ فسر فلکند	گاہ خلفال و پرگر اندازد

دہرواں کو امیج محمدی
 برہا بنید و ناپید کنشہ
 ناگزشت آن بساط برپیشہ
 چوں عرق نرگس پیکہ درسی
 ہر کہ بیتی ہی بروئے عذاب
 رخت نناک خویشی گراں
 تابش مہر جنبش ذرات
 در چوٹے کہ ترسد از غوغا
 سایہ را پایہ نمودار سے
 باد گزبانے بادوست شد
 ساقی انجمن یکہ خیزست
 مطرب بزم زخراش ترست
 لک من ہیں کہ بر نفس جانے
 رسیدستی و میرا اندازی
 بایک انعام نہ پیش
 ازینک اثر شود بمراد
 با منہ رنہ بود و مساز

ہر چہ خاتون نرگس اندازد
 خود فلک لسیج دیگر اندازد
 ناگزیر آں ہنس بر اندازد
 جہہ چرخ آشتہ اندازد
 جامہ را کہ شد تر اندازد
 می برد تا بہ محور اندازد
 شور و ہفت کشور اندازد
 خویشی را در منظر اندازد
 باد چنبرہ در سر اندازد
 پردہ اندازد سے گل بر اندازد
 بادہ در کاسہ در اندازد
 کاب در زلف مرزا اندازد
 در گاہ تازہ مسطور اندازد
 بر آبی سر پہ در خود اندازد
 در دھوہ سحر اندازد
 حوت و مرغ مصور اندازد
 ہوا تش پختہ اندازد

از نولے کہ در عزل سنجید
حلقہ درگوش را در اندازد
از طرازے کہ درد عا باشد
بر ورق مشک از فر اندازد
آں قدر زنی کہ در زمانہ تو
چرخ را کہنگی بر اندازد
تا قصنا بہر آستانہ تو
طرح نہ چرخ دیگر اندازد

سالکانِ طریقت

رہرواں چوں گہر آبلہ پابینند
پائے را پایہ فدا تر ز شریابینند
ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند
ہر چہ در سینہ نہانت ز سیما بینند
راستی از رقم صفحہ ہستی خوانند
نقش کج بر ورق شہب عناق بینند
راز زین دیدہ و راں جوتے کہ از دیدوی
نقطہ گرد نظر آرند سودا بینند
راہ زین دید و راں پرس کہ در گرم روی
جاوہ چون نبض تیاں در تن صحرابینند
شررے را کہ بنا گاہ بد خواہد جست
زخمہ کردا بتارِ رگ خارابینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورت آبلہ بر چہرہ دریابینند
شام در کوکبہ صبح نمایاں نگرند
روز در منظر خفاش ہویدا بینند
دشت تفرقہ در کاخ مصور بچند
مجمع انس بنے بست زینجا بینند
ہر چہ گوید عجم از خسر و شیریں شنند
ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

نستوہند اگر ہمسدہ مجنوں گردند
قشقہ رارونق ہنگامہ ہند و خوانند
برسم و زمزمہ و قشقہ و زمار و علب
دل نہ بند نہ بہ نیزنگ و دیو یزد رنگ
ہرچہ درسون تو ان یافت پیر سو یا بند
نخروشنند اگر محل لیلایا بینند
بادہ را شمع طرب خانہ ترسا بینند
خرقہ و سجد و مسواک و مصلایا بینند
ہرچہ بینند بعنوان تماشا بینند
ہرچہ درجا تو ان دید ہر جا بینند

بروز از یاد کہ دنیا ست فرود
ایں دل از دزد نمودے کہ دنیا بیند

راز و نیاز

بروزے کہ مردم شوند نجسین
روان را بہ نیکی نوازند کس
گہر مانے شہور پیش آوردند
زلف سے کہ میندہ دختر من کشند
پیشکار با این جگر گوشگان
زحمت بدل برود و دغان فرود
دآن عقد من با شمع و سیت
در آب و در آتش میرود و
شود تازہ پیوند حساب با بہمن
بسر مایہ نویش نماند کمان
قد و مید و کرد و پیش آوردند
جہاں را بخود جہنم روشن کشند
در آئینہ شستہ جگر تو تشنگان
ز غفلت مر اندر ریباں فرود
ز غم ماسہ ایام الفیضینہ
نہ شود سیتہ زیستن مردود

بہ بخشائے برنا کیہائے من
 بدوش ترا ز دمنہ بار من
 بگردار سنجی میفزائے رنج
 اگر دیگران را بود گفت و کرد
 و گر ہمچنین ست فرجام کار
 مرا نیز یارائے گفتار دہ
 درین خستگی پوزش از من مجو
 دل از غصہ خول شد نہفتن چہ سود
 زباں گر چہ من دارم اما ز تست
 بہانا تو دانی کہ کافر نیم
 نکشتم کسے را با ہر یمنی
 لگرمے کہ آتش بگردم از دوست
 من اندو گہیں دے اندہ ربا
 حساب مے درامش درنگ بے
 کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
 نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ
 نہ بستاں مراے نہ میخانہ

تہید ست و در ماندہ ام ولے من
 لشجیدہ بگزارد کردار من
 اگر انباریے درد غم رسم بچ
 مرا مایہ عمر رنجست و درد
 کہ می باید از کردہ راندن شمار
 چو گویم بر آں گفتہ ز نہار دہ
 بود بندہ خستہ گستاخ گو
 چونا گفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
 بہ تست ارچہ گفتا م اما ز تست
 پرستار خورشید و آذر نیم
 نبرد م ز کس مایہ در رہزنی
 بہنگامہ پرداز مرم از دوست
 چہ میگردم اسے بندہ پرور خدا
 ز جہشید و بہرام و پردیز جوے
 دل دشمن و چشم بد سوختند
 بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
 نہ دستاں مراے نہ جانانانہ

نہ رقص پر ہی سپکراں بر بساط
 شبانگہ بے رنج و غم شدے
 تمنائے معشوقہ یادہ نوش
 چہ گویم چو ہنگام گفتن گزشت
 بسا روز کاں را بہ لدا دگی
 بسا روز باران و شبہائے ماہ
 انقباض پر از ابرہیں مہی
 بہاراں و سن در غم برگ و ساز
 جہاں از گل و لاله پر بورش
 دم پیش جز رقص بسمل بود
 اگر تا نغمہ شد تو بہ شکست
 مراد منت نامساں نہ خاک
 بگیتی درم جینا و استی
 نہ بخشند و شات کہ بہر دم
 کہ چوں پس از غبار ہنگین
 نہ نازک نگاہے نہ از حق
 چو زان فرزندیتے بہر دم

نہ غوغائے رامشگراں در رباط
 سحر کہ طلبگار خو غم شدے
 آقا ضائے بیہودہ میفرودش
 ز عمر گرانسا یہ بر من گزشت
 بسا تو بہاراں بہ بی بادگی
 کہ بود مست بی بے بچشم سیاہ
 سفاہینہ جام سن از می تہی
 در خانہ از جینا و سن ساز
 من و جبرہ و دوائے نیرنگ
 باندا زانہ خواہش دل بود
 اگر یافتہ بادہ ساز شکست
 لب از نایبوس خنک پاک
 دم را سیہ ہوا داشتی
 چو زانہ پس از بوم و ہر
 نہ پیش بر کایان فرزند
 بہر دم نہایت و بچشم
 کہ بہر دم نہایت و بچشم

چو آن نامرادی بیا دآیدم بفر دوس ہم دل نیا سایدم

بہشت

صبحی خورم گر شراب طہور
دم شبر و پہلے متانہ کو
درال پاک میخانہ و بیخروش
سیہ مستی ابر و بارال کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناس نگار
گر یزدوم بودہ انیش کجا
برو حکم و بود لبش تلخ گو
نظر بازی و ذوق دیدار کو
نہ چشم آرزو مند دلالت
ازینہا کہ پیوستہ میخواستل

کجا نہ ہرہ صبح و جام بدور
بہنگامہ غوغائے متانہ کو
چہ گنجائش شورش نائے و زوش
خزال چوں نباشد بہارال کجا
غم ہجرت و ذوق وصالش کہ چہ
چہ لذت و ہوسل بے انتظار
فرید بسوگند و نیش کجا
دہر کام و نبود دلش کامجو
بفر دوس روزن بدیوار کو
نہ دل تشنہ ماہ پر کالہ
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

معراج

قدم نہ در ہای کہ رفتن نہ داشت نگہبان و ہمراہ و راہزن نہ داشت

در آنجا که از ره فرہنگ ملای
 جہت را دم خود نمائی نساند
 غبار نظر شد زہ ناپدید
 در آورد بے کلفت سمت و سہ
 تا شاہلاک جمال بسط
 شنیدن شہید کلام شگوف
 کلامی بہ بیرنگی ذات علم
 تختیں دراز کاشود آں رواق
 ہر آسید و زلا در گزشت
 دہان خلوت آباد راز و نیاز
 مانند اندر احمد زہمیش اثر
 احد جلوہ گر با شنیدن صفات
 دو عالم خروش زانائے راز
 ورق و ورق نکتہ و پسندیر
 زلفن شنیدن بدائی نہداشت
 جوانانہ ہر نفسش گرفت
 لکم تا مانے حب ظہور

بجا باشد از خود گویند جائے
 زمان مکان را روائی نہاند
 سراپائے ہینندہ شد جسد دید
 بنور السموات والارضی رخسے
 فروغ نظر موجبہ زان محیط
 منزہ و آمیزش معنوت محرف
 شنیدن بعقل اندر اثبات علم
 زالا بصدرا اندرش مہشاق
 رسیدن نہ یونہی باور گزشت
 بروے دوی بود چوں در فراز
 کہ آں حلقہ بود بیرون در
 نبی محرق چوں صفت عین ذات
 ولیکن ہماں در غم بند ساز
 ولیکن ہماں در خیال و ہیر
 نمودن زوہد جسدانی نہداشت
 زودعت بگشت گراشش گرفت
 منزل در اندیشہ تاورد زور

احد کسوت احمدی یافتہ دم دولت سردی یافتہ

محفل شراب

ہوائے انجمن آرائیم نسا دہر
کہ مے خورد چو از بادہ رخ برافسند
تو اسے ندیم و تو اسے ساقی و تو اسے طلب
کجائی اسے مہ خورد شید جلوہ ہیں ساغر
معاشران کو نام و نسا رخ فرجام
بزم نگاہ بیارید یک دو گلشن گل
بنام خویش بگیتی زیند نقشر مراد
بنجاک راہ زمستی مے آں قدر ریزید
دہید بادہ گلفام و چوں سلام کنم
بیفکنید قساویل آہگینہ ز کف
زینہ چشمک آشام مے سیکہ یگر
و و جام بادہ شیریں بہن دہید کہ من
یکے بشاد دئی تسخیر صوبہ لاہور
جہاں ستان و جہاں بخش مارونگ کہ بہت

شراب خوارہ تے چند خواہم از اجاب
بسوز رشک دل حاسداں کنند کباب
بسوز خود و بہ پیامے و بساز رباب
کجائی اے بت ناہید نغمہ ہاں مضراب
پس از ادائے سپاس مفتح الابواب
بنجاک راہ بیاشید یک دو دجلہ گلاب
بزم عیش بساغر کنید محل مذاہب
کہ تا ابد و مدد از خاک لالہ شاداب
ہماں بہ بادہ سلام مراد ہید جواب
بہ سقف حجرہ بہ بندید زہرہ دہنتاب
و مے کہ پر مدد از بادہ در پیالہ حباب
نہ خوش بود کہ بوم تلخی کام زہر عتاب
دوم بفرخنے عسمر و دولت نواب
شہاب رخ و فلک تو سن ہلال رکاب

غالب کا اسیریہ

خواہم از بند بہ زندان سخن آغاز کنم
 بہ نوائے کہ ز مضارب چکاند خوناب
 در خرابی بہ جہاں میسکہ بنیاد ہم
 بے مشقت نبود تیسرہ بہ شعر آویزم
 چوں مرا سخن انصاف ز مجرم خواہم
 تاچہ افسوس بہ خود از ہیبت میا دہم
 یاد دیرینہ قدم بخیم مگر ما کا غیب
 اسے تا سازنی طالع کہ بہ من گوہر باز
 اہل زغال بسر چشم خودم جاوداند
 ہر روز و ان گرفتار و غایت شہر
 من گرفتارم و این ایزد خوش ترن
 غم دل پرده دری کرد و فغان ساز کنم
 خستہ شدن را بہ سخن زمر میر و از کنم
 در اسیری بہ سخن دعوئے اعجاب کنم
 روز کے چند رسن تابی آواز کنم
 چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم
 تاچہ خوں در جگر از حسرت پرواز کنم
 آن گلچند کہ تو در کوی دمن باز کنم
 با خرد و شکوہ گراز طالع تا ساز کنم
 تا بدین صد شینی چو تہر نماز کنم
 خوشی سخن را بہ شاہم دم و ہر از کنم
 در سخن پرورنی شیرہ ایجا ز کنم

گرچہ توفیق گرفتاری باویدم نیست

لیکن از دہر و گر خوشہ لی و میم نیست

شمع چہ چند بیزاد یہ آسں سوزد
 خودی ہر ذہ مسوزید و گر خوشی ست
 خوشتر آنست کہ بفتح و ایدان سوزد
 جزا یہ کہ در غیب لطف سوزد

خانہ ام زائش بیدار سوخت ریخ	سوقن داشت ز شمعیکہ شبستان سوزد
منم آن خستہ کہ گر زخم جگر نبسایم	بر من از مهر دل گبر مسلمان سوزد
منم آن سوخته خرم کہ ز فسانہ من	نفس ہر دور ہزن دہقان سوزد
منم آن قیس کہ گر سوسے من آید سیلی	محمل از شعلہ آواز حدی خواں سوزد
تا چسبم گزرد روز بہ شبہا دریاب	از چراغ کہ عس بر در زندان سوزد
تنم از بند در تبوہ رقیباں رزد	دل از درد براندوہ اسیراں سوزد
از نم دیدہ من فتنہ طوفان خیزد	از لطف تالہ من جوہر کیواں سوزد
آہ ازین خانہ کہ روشن نشود و رشید تار	جز بدای خواب کہ در چشم نگہباں سوزد
آہ ازین خانہ کہ درد سے متواں یانت ہر	جز ہموئے کہ خس و خابریاں سوزد

اسے کہ در زاویہ شبہا بچہ غم شمری

دل از سینہ بردن آہ کہ داغ غم شمری

پاسبانان ہم آئید کہ من می آیم	در زندان بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بد خویش سپاسم گفتے	خیر مقدم بسر آئید کہ من می آیم
جادہ نشناسم دژانہوہ شما می رسم	راہم از دور نمائید کہ من می آیم
رہر جادہ تسلیم و رشتی نہ کشد	سخت گیرند چرا آئید کہ من می آیم
خست تن در رہ و تغذیہ پندراست اینجا	نمک آید و بسائید کہ من می آیم
عارض خاک پاشیدن چون تازہ کنید	رونق خانہ قزائید کہ من می آیم

چوں من آیم بشما شکرہ کردوش روست
 لای عزیزان کہ درین کعبه قامت آید
 تا بد روا زه ز غداں پیے آوردن من
 چوں سخن سنجی و فرزاگی آئین من است
 بخود از شوق بیاید کہ خود باز درید
 بسک خویشتان شدہ بیگانه ز دنیا گئی من
 غیر شکفت خور و غرضم کالائی من

آنچه فرداست ہم مرقد آه گونی
 دل و دشتیکرا بود فراماند نہ کار
 سرگوشتم بر درنج و اہم آرد لغتی
 پیرا اہل جہان چوں جہان رسد کرا
 عشق و یقین من میسر نیست ہوا
 ہرزم را توان کرد چستین صنایع
 ہم دل داشتہ ایستیم با نوا و نوا
 چہا یکدگر اندازہ بزندان خواہ
 در شب شبکیا اینچہا خوابت و در
 خوابت و درین شبہا در پیش من

زین پس ترا میخامد کہ من می آیم
 بخت خود را بستاند کہ من می آیم
 قدمہ رنج نمائید کہ من می آیم
 بہر از من ہر بانیسد کہ من می آیم
 بہر از من ہر بانیسد کہ من می آیم
 آفتاب از جہت تہد بر آہ گونی
 شب و روز یکہ مرا بود و مرا آہ گونی
 سرگوشتم ہر خوف و حسد آہ گونی
 بہر از من ز جہان بیشتر آہ گونی
 بہر از من ز جہان بیشتر آہ گونی
 زخم زخم زخم زخم زخم زخم زخم
 یوسف از تہیہ و تہیہ بہر آہ گونی
 این چنین گرم زخم بیشتر آہ گونی
 چہا یوسف بیشتر زخم بیشتر آہ گونی

مصطفی خاں که دین و اقامه غمخوارین است

گر بمیرم چه غم از مرگ عزادارین است

خواجہ دانم کہ بے روز نامم در بند	لیک دانی کہ شباز روز ندانم در بند
نہ پسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم	جانب در بد چه حسرت نگوانم در بند
خستہ ام خستہ ام و دعوی تلکین حسنا	بند سخت ست پتیدن نتوانم در بند
شادم از بند کہ از بند معاشل زادم	از کف شحمہ رسد جامہ و نامم در بند
آمہ و خامہ بیارید و بکل نبویسید	خواب از بخت ہی دام ستانم در بند
یار بایں گوہر معنی کہ نشانم ز کجاست	بند بدل بود نیست ز بانم در بند
ہر کس از بند گر ان نالد و نا کس نہ نم	نالم از خویش کہ بخویش گرانم در بند
خوبے خوش بہر مصیبت زدہ نیچہ و گراست	رنجہ از دیدن نیچہ و گرانم در بند
رفتہ و بارہ من حکم کہ با و دو درین	شش مہ از طہر گرامی گزانم در بند
اگر این است خود آنست کہ عید الفی	گزرہ نیز چو عید رمضانم در بند
مدت قید اگر در نظم من نیست چرا	خون دل از مرہ بے صرہ چکانم در بند

نہستم طقل کہ در بند رہانی باشم

ہم ز ذوق ست کہ در سلسلہ خالی باشم

من نہ آنم کہ ازین سلسلہ تنگم نبود	چکم چون بقضائے ہرہ جنگم نبود
زین دور تنگ مدد تنگ خالی بظہر	گلہ نیست کہ از بخت دور نگم نبود

راز دانا، غم رسوائی جاوید بلاست
 لرزه از خوف دین مجر که از غیث گل است
 منم آئینه داین عار شده زنگ ست دئی
 عهد ما دارم امید بر نالی و بد بند
 جورا عدل رود اذل بر نالی و لیکن
 به شگاف قلم از سینه بروی می ریزم
 حاش لشکر دین سلسله باشم خوشنود

بهر آزار غم از قید فرنگم نبود
 در نه در دل خط از کام نهنگم نبود
 تاب بدنامی آلایش زنگم نبود
 دامن از بدبر نالی تر شنگم نبود
 طعن احباب کم از خم خدنگم نبود
 بسکه تنجائی غم در دل تنگم نبود
 چکنه چون مرای رسته بختنگم نبود

بصری تسلیم خویش بودستی من

اندریس بندگراں ہیں و بکدستی من

همدان در دلم از دین نهانیدم
 لفظ الحمد که در عیش و نشاطیدم
 هم دما این نظر سحرانیدم
 چشم نبود که فرخنده نقاشیدم
 سود بینید و فایده دلاریدم
 من بخون فخر دینم به بنییدم
 در میان ضابطه مهر و فلک بودم
 دوزخ از نه گنجینه فلات چونم

غالب غمزه را روح در فانییدم
 لفظ الشکر که با شوکت دشانیدم
 هم در اقلیم خن شاه نشانیدم
 شاد باشد که گفت گهر انیدم
 نه فایده انید جفا قاتل و جانیدم
 من جگر خسته و دمانم به دانییدم
 من بر نیم که مرا نیند بر آیدم
 بار سزا ز عطف گویند چنانیدم

گر نباشتم بجهان غار و خنہ کم گیرید
ایکے سرو و سمن باغ جہانیں ہمہ
پیارہ گر تھوڑا کرود دعائے کافی ست
دل اگر نیست خداوند ز بانیں ہمہ
ہفت بند است کہ در ہند رقم ساختہ ام
بنویسید و مینید و بخوانید ہمہ
آں نباشم کہ ہر بزم زمیں یاد آید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آید

سحر حلال

زخمہ بر تار رگ حباں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں میزد
کایں نواہے پریشاں میزنم
چوں ندیدم کز نوازش خوں چسک
طعنہ بر مرغ سحر خواں میزنم
خامہ ہر از دم گرم نفست
آتش از نے در نیستاں میزنم
جوئے شیر از سنگ راندن ادبیست
بہر گو ہر تیشہ بر کاں میزنم
دیگر اں گر تیشہ بر کاں میزنند
نہ یہ را در دل نشاط دیگر بست
من شیعخوں بر بخشاں میزنم
گر یہ را در دل نشاط دیگر بست
خندہ بر بہائے خنداں میزنم
باندہ شو قم در خروش آورده است
بانہ ہوئے همچو مستاں میزنم
راز داناں خوئے دہرم کردہ اند
خندہ برداناں ناداں میزنم
بادہ پسنداری کہ پنہاں میزنم
در خراباں ہم ندیدستی خراب

غالب نامہ

خونے آدم دارم آدم زادہ ام
 بادہ درابر بہاراں میزوم
 طعنہ بردن سے آلودم مزان
 غالب اڑنے پرستی نگزوم
 تو درخشاہی دمن خود ہنوز
 در ترقی مے نگنجد گفتگو
 می ستیز با قضا از دیر باز
 لعب باش شیر و خنجر سے کنم
 برخوام زہرہ و رفتار تیر
 گم گم کن پایہ می آیم نسود
 می برد از من قصہ چنداں کہن

آشکارا دم ز عصیاں میزنم
 حالیا در تیسر بار اں میزنم
 نیست ساغرے بہ نیگاں میزنم
 غوطہ در گرداب طوقاں میزنم
 جام مے در بزم اعیان میزنم
 در تنزل دم ز عرفاں میزنم
 خویش را بر تیغ عسریاں میزنم
 بوسہ بر سا طور و پیکان میزنم
 چشمکے دارم کہ نہاں میزنم
 حرف با جلیس و کیمیاں میزنم
 گوئے گردوں نہ بہ چرگاں میزنم

ارزو

از کونی نشاں نے خواہم
 دست بے ذوق مرگ خوش بود
 باغبانم گرفت دست و داشت
 کس نیستا لدا دنا نہ من

خویش را بدگساں نمیخواہم
 دل اگر رفت حباں نمیخواہم
 جز بیباغ آشتیاں نمیخواہم
 درد دل را بسیاں نمیخواہم

سچکس سر دمن نمیخواهد
 هر یک و شهنیست دوست نما
 آرزو عیب نیست خسرو دیگر
 رنج صاحب دلان روا نبود
 دو شهر افکار نپسندم
 مور را مار گیسو نیز برم
 ماں دمانیستم محال طلب
 گهر افتادم و بهی طلبم
 نتوان کرد با فلک پر خاش
 خسته چشم زخم خویشتم
 خوبه بیدار کرده ام غالب
 خواسته چندم کنم لیکن
 پایے فرسود در رکاب و هنوز
 سخن از عالم دگر دارم
 گرد خود سر دوش دمی مرائے
 سینه صافم قلندر مستم
 پایہ در نظر نماند دگر

سچکس رازیاں نمیخواهم
 یاری از آختداں نمیخواهم
 خواهم اما چناناں نمیخواهم
 بند ایل زبان نمیخواهم
 بارها را گراں نمیخواهم
 پشه را پیلان نمیخواهم
 نوبهار از خندان نمیخواهم
 سیم دزد را یگان نمیخواهم
 خرو خسرو دال نمیخواهم
 نادر کے بر نشان نمیخواهم
 عید نوشیر دال نمیخواهم
 کارها را رادال نمیخواهم
 دست خود بر عنان نمیخواهم
 همدم و راز دال نمیخواهم
 با خودش هم زبان نمیخواهم
 راز خود را نهان نمیخواهم
 خویشتن را شبان نمیخواهم

یوسف از مهر گشته خوشدل من
به زلفش شایب بخشیدند
بر رخ حکمت موجب حق
عین من هر چه اکتفا می کرد
چون حکایت بجائے خویش رسید
به تلافی جنس نمیخواهم
بخت خود را جواں نمیخواهم
غازه استخوان نمیخواهم
خواستم غیسد آن نمیخواهم
تن زدم داستان نمیخواهم

جواهرات پریشال

آواره غریب نتوان دیدم من
نازیم به منمنای که شادان جلال جز
چون فاش شد آخر که هم از خلق گرفته
رواست شور تشید و ترانه مستان ما
گیر خورده کزان فرقه ام که پندارند
منم که بدل و دین خود را اعتماد نیست
گراسته ترک نرا دم ز دروه سلجوق
شود روان طبع من ز سختی و بر
پایان محبت یاد می آیم زمانه را
خواهم کرد و گردن بکده سازند حرم را
هم بود بر آن خانه گزارند چشم ما
بیفاده از خلق نبغند ارم ما
بشرط آنکه نگیند از پیشانی را
مواد خال رخ دوست داغ عیال را
چشم غمزه هم این بار بایست و هم آن را
ز داغ تا بود خواں نمی خورم ناں را
بسنگ تیز توان کرد تیغ بر آن ما
که دل عبودیتا نایست و ادم دستلے را

نذارم کتاب ضبط راز دی ترسم ز روحائی مگر جویم ز بہر ہمزبانی ہیزبانے را

گفتش ذرہ بہ غور شید رسد گفت محال
گفتش کوشش من در طلبش گفت رست

کہ عمرے سپری گشت و ہماں بر سر چو رانت	گویند بہاں برا کہ وفایت چاہیست
کہ جنت نکتہ چارہ افرونگی دل	تعمیر باندازہ دیرانی مانیت
کہ انتظار جلوہ ساقی کباب می کنند	مے بساغر آب حیاں و بہینا آشت
کہ بے تکلف در بلا بودن بہ اندہیم بلا	قبر دریا سبیل وردے دریا آشت
کہ ناچار با تقافل صیاد ساختم	پنداشتم کہ حلقہ دام آشیانہ است
کہ پابستہ نوز و خیالی چو واری	ہر عالمے دہ عالم دیگر فانیست
کہ غالب و گردنشاہ آوارگی پس	گفتم کہ جہد را ہوس آستانہ است
کہ امشب آتشیں رونے گرم ترند خوابہاست	کز لبش نواہردم در شرف نشانیست
کہ کشتہ دل خویشم کز سنگراں یکسر	دیدد لفریبیا گفت مہربانیست
کہ بیخوبی رسیای طوبی غنودہ اند	شبگیر ہر دان تمنای بلند نیست
کہ ہم وعدہ و ہم منع ز بخشش چہ حساب است	جان نیست مکر نتوان داد شرابست
کہ در شردہ ز جوئے غسل و کاخ نرود	چیزے کہ بدستگی از زوئے ناب است
کہ از جلوہ بدنگامہ شکیب نتوان شد	لب تشنہ دیدار ترا خلد مرابست
کہ شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از بکد گراند	روز روشن بود ابر شب تا زود رفت

خود پر مرا بختِ حیراں میبایست	آخرے خوشتر از نیم بجایاں میبایست
خاکِ گلبدے و ہوا شکرِ فشانِ میبایست	ہر چہ کہ بہ آہنگِ غزلِ تنہیںم
خانہٴ منِ بے کوسے مہالِ میبایست	ہر تابِ بسبو بادہ ز دور آردن
یا خردا سید گئے در غورِ آنِ میبایست	یا تنائے من از خلو بریں نگزشتے
خود بخود پیمانہ میگردید گردینِ نہ داشت	گلِ فراوانِ دے پر زور و شتمِ برساٹ
ویرہ داغم کرد دوسے دوستانِ نہ داشت	گر منافق وصلِ ناخوش و موافقِ بجز تلخ
دینت مے بر خاک چون جامِ گنجیدنِ نہ داشت	بد آدم از امانت ہر چہ گردوں برناخت
شکر ایزد کہ نالہ بے اثر است	مست از دل نمیتوان برداشت
ہر نعمت در نہادِ ہال و پراست	قص و دامِ راغنا ہے نیست
ہم خزاں ہم بہار و در گزراشت	ہیفاں برگِ دایں گل افشاں
جشنِ جامِ برد و قلندر کدو گرفت	از یک ہواست بادہ و قسمتِ جداست
بچارہ باز داد و نیے مشکبہ گرفت	رضواں چو شہد و شیر بہ غابِ حواہ گرفت
میانِ سن و آد شوقِ عاملِ افتاد است	دریں روشن بچہ امید دل توان بستن
رازت نشود ازین خستیاں ہیچ	در پردہٴ رسوائی سحرِ نو آیت
بسنگِ ہر کہ وہ دل بفرہ چون ندہ	ہم گرانے و دغاہر کہ سادہ ہر ہنس
آنا کہ گفت اندہ نگویاں نگو کنند	خونِ ہزار سادہ بگردن گرفت اندہ
من نہ سبدا رہتی اشیا فکر کنند	لباشد جوئے آبِ شادہ مراب را

پیدا است بے نیازی عشق از فنائے ما	گر زور حق شکست زور یا چه می
با ما که محو لذت بیدار گشته ایم	دیگر سخن ز مهر و مدار چه می
هفت آسمان بگردش دما در میان ایم	غالب و گر پرس که بر یا چه می
دوست دارم گرچه را که بکارم زده اند	کاین بهمانست که پیوسته در ابرو
اگر بدل نه خلد هر چه از نظر گزرد	ز به روانی عمری که در سف
بوصل لطف ماند از دست محصل کن	که مرگ تشنه بود آب چون
غالب ترا بدید بر سداں شمرده اند	آری دروغ مصلحت آمیز گفته ا
من سر از پائش نام بر سخی و سپهر	هر دم انجم مرا جلوه آغا
اندر آن روز که پیش رو از هر چه گزشت	کاش با ما سخن از حسرت مانیز که
از درختان خزاں دیدم بنام کاینها	ناز بر تازم کنی برگ و درانیز کنه
گفته باشی که ز ما خرابش دید از ضلالت	ایں خطا نیست که در روز جزانیز
تکین بر من ولم از کفر بگرداند	بتخانه سپته خانه بر انداز ندان
کے با من چه در صورت پستی حرف دیں گوید	ز آذر گفت دلم گرز صورت آفرید
ولم در کعبه از تنگی گرفت آواره خوام	که با من وسعت بتخانه ٹکے بند
بخشتم نام سرا میگوید و از لطف گفتارش	گماں دارم که حرف دیشینه بعد از
چرا راندند غالب را از ازل در برهمن باید	که راز خلوت شه باگدائے ره
گرفته ام ز کسے تو آسماں زرفته ام	ایں قصه از زبان عزیزان ش

ذوقیت ہمدی بفعال بگزرم زرد شک
بغرض شہرت خویش احتیاج ما دارد
زیاس گشتہ سب نفس در تلاشش دلیر
مرا بہ غیر ذیک جنس در شمار آورد
خوشم کہ دوست خود آئنا یہ بی وفا باشد
بہ خلد از سردی ہنگامہ خواہم
خنک شو تیکہ در دوزخ بنظر
دلے دارم کہ در ہنگامہ شوق
ہسان موج میبالم بہ طوفان
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتیم
بر امید شیوہ صبرا زلمنے زیستم
زمرہ رہائے عزیزان فرو گزار
ملکہ بعبہ زبان تو غلط بود غلط
غنیچہ رانیک نظر کردم او اے ولہد
این سلم کہ لب بیجی نحو سہ واری
رنگ دہد و ترا برکت دہد و مسدا
گیرم امروز ہی کام دل آت من کجا

خا بہ بہت بہ پائے عزیزان خلیہ باد
چو شعلہ کہ نیاز او فند نجار خوش
مگر ز رشتہ لہول اہل کنم مرشش
فغان کہ نیست ز پروانہ فرق تا گشتش
کہ در گمان ننگا لم امید گاہ گشتش
برافر وزم جگر دگر آتش
می آتش شیش آتش ساغر آتش
سرشتش دوزخ است گاہ آتش
برنگب شعلہ می قصم دتا آتش
کعب دیدم نقش پائے رہرواں نامیش
تو بریدی از من دمن استحال نامیش
در سورہ فوج خوان بزم ورا برقص
کامین خود از طرز بیان تو غلط بود غلط
دیں کہ مانہ بدمان تو غلط بود غلط
ناحر از جہد این تو غلط بود غلط
رنگ و بخت گشت بین برکت تو گشت تلف
دیر تا طاعتی سی سالہ ما گشت تلف

کاش پائے فلک زیرِ ماندے غالب	رد زگارے کہ تلف گشت چرا گشت نہ
از عشق و حسن ما تو با ہمد گرد گفتگو	عصر و بجزوں یک طرف شیریں بیلے کیل
دریچہ نسخہ معنی لفظ امید نیست	فرہنگنا مہ مانے قلمت از شتہ ایم
میر با ہم ہوسہ و عرضِ ندامت میکنم	اختر اے چہند در آواہ صحبت میکنم
سنگِ درخت از مسجد ویرانہ می بہر	خانہ دور کسے ترسایاں عمارت میکنم
کردہ ام ایمان خود را دستمزد خلیفتن	می تراشم پیکر از سنگ عبادت میکنم
آتش از دختہ و خلق بحیرت نگراں	رخسہ وہ کہ بیگامہ ہر بنباہیم
حسرتِ روئے ترا حورِ تملانی نکلند	از تو آخر بچہ امید شکیب ہاشم
سرا ز حجابِ تعین اگر بردل آید	چہ جلوہ نامہ ہر کیش عیواں کرداں
مائیم و ذوقِ سجدہ سجدہ چہ بتکدہ	در عشق نیست کفر زایاں شافقم
سرشک افشانی چہ ترشش ہیں	شہِ خوباں و خنجِ گوہر شش ہیں
ادائے دستانی رفتہ از یاد	ہو اے جانفشانی در سرشش ہیں
بجا ماندہ عتاب و غمزدہ دناز	متاع ناروائے کشورشش ہیں
گزشت آں کہ غم ما بخیبر بود	بخویش از خویش بے پڑا ترشش ہیں

ہر سہم چارہ جوئی پیش غالب
شکایتِ سنج چرخ و اخترش ہیں

رباعیت

راہبست ز عجب تا حضور اللہ	خواہی تو دراز گیر و خواهی کوتاه
این کوثر و طوبی کہ نشانی دارد	سر چشمه و سایہ ایست درینہ راہ
ز آنجا کہ دلم بوسہم در بند نبود	باز بچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ آہنگ سفر	جز ترک دیار دین و فرزند نبود
درینم نشاط خستگان را چہ نشاط	از عہدہ پائے بستگان را چہ نشاط
گر ابر شراب ناب بارد غالب	ما جامہ و سپہ شکستگان را چہ نشاط
لکشتی از موج سوسے ساحل برود	دہر از حب و تاب منزل برود
خود شکوہ دلیل رفیع آزار بست	آید بزبان بر آنچہ از دل برود
اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش	آنروز کہ وقت باز پرس آمدیش
بگذار مرا کہ من خسیاے دارم	با حسرت عیش شہائے ناکوہ خویش
لہ گردین ز اہاں بہت مستان	دین دست و زرمی بہر شلخ و پشان
چون نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ	ماند بہ بہایم و ملت زار و سرائ
در عالم بے زری کہ تخلص نیات	طاعت نتوان کرد بامیہ غبات
لے کاش ز حق اشارت موم و صلوٰۃ	بروے بوجہ مال چوں حج و زکوات
بر قول و اعتقاد نتوان کردن	خود را بجزاف شہادت نتوان کردن

اکثریت وعدہ مانے پے درپے تو یک وعدہ درست یاد نتواں کردن
 گر در طلب دوست بود پائے تو سست غمگین مغز
 در خود باشی چہ بتو تو چہ باک چیست مغرور مشو
 اخلاص بہ نسبت است و نسبت اریست چون ششم دہر
 گر جلد بہ قومی فتا و پیوند درست بہنودمی رد

ہر چند توانی بے سرو سامان بودن باز بچہ خوی ز رشت نتواں بودن
 بالشد کہ زوشن جگر سخت تر است از کردہ خوشن یشیماں بودن
 اے تیرہ زمین کہ بودہ بستر من ہر خاک کہ پائست ہمہ بر سر من
 ز بہر کسالت دہر من داند و دام اے مادر و گراں و مادر من
 یارب تو کجائی کہ بہ ما زرنہ دہی بیدر و خدائی کہ بہ ما زرنہ دہی
 نے نے تو نہ غائبی دے نہ ہر جمی بے مایہ چو مائی کہ بہ ما زرنہ دہی
 باید کہ چہ سائے و گر آباد شود تا کلبہ ویران من آباد شود
 در عالم انبساط از من خوشتر مطرب کہ بہ سوز و گراں شاد شود
 اوراق زمانہ در نوشقیم و گزشت در فن سخن یگانہ نشیتیم و گزشت
 مے بود ووائے مایہ پیری غالب زان نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت
 فرصت اگر ت دست دہد مفتنم انگار ساقی و مفتی و شرابے و سرودے
 ز نہار ازاں قوم مباحثی کہ فریبند حق را بھجودے و نہی را بہ دروے

اردو معرکے

- ۱۔ نوائے ظفر ۱۸۴۴ء تا ۱۸۵۵ء
ب۔ چراغ سحری ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۶ء

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یا راہِ نکتہ واں کے لئے

غالب

نوائے ظفر

غزلیت

رکھو یا رب یہ درمخنیفہ گوہر کھلا
اس تحف سے کہ گویا جنگدہ کا در کھلا
آستین میں شہ پنہاں اٹھ میں خجہ کھلا
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری منہ کھلا
خندہ لا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ کھلا
بتے غم میں مرا اپنا ہوا بستر کھلا
آج ادھری کو رہیگا دیدہ آفتاب کھلا
نار لا تا ہے وطن سے نامہ براکشہ کھلا

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دست کھلا
شب ہوئی پیرا نگم رشتہ کا منظر کھلا
گرج ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں زہ
گڑ بھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا جید
ہے خیال میں حسن نمل کا سا خیال
نزد کھلے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
دور رہنے کو کہا اور کجے کیسا پھر گیا
کیوں اندھیری ہے شبنم ہے بلاؤں کا نڈل
کیا میں غربت میں خوش ہے حوادث کا حال

اُس کی اُمت میں نہیں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شے کے غالب گنبد بے در کھلا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
تیرے دھڑے پر جے ہم تو یہ جان بھوٹ جاتا
تری ناز کی سے جانا کہ بندہ عاتقا عہد بودا
کوئی میرے دل سے پوچھے، تمہے تیر نیم کش کو
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لبو کہ پھر نہ تھمتا
غم اگرچہ جاگل ہے، یہ کہاں کہیں کہ دل ہے
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بُری بلا ہے
ہوئے مر کے ہم جو رہوا، ہوئے کیوں غرق دریلا
اُسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کہ خوشی سے مرنے جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو بگر کے پار ہوتا
کوئی چارہ سانس نہ ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
جسے غم سمجھ ہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
مجھے کیا برا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
جو دوتی کی بولبی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوف! یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

در غور قہر و غضب جب کوئی ہم سانس نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں کہ ہم
سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا

پھر غلط کیا ہے؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہوا
اُنے پھر آئے دیر کعبہ، اگر وادہ ہوا
رد و برو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

تیرا ہمارا برا کیا ہے؟ اگر اچھا نہ ہوا
 خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا
 کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ یریا نہ ہوا
 حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
 کھیل رکھوں گا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

کم نہیں نازش ہم نامی چشم خروباں
 سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تکٹ گیا
 نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
 برین ٹوٹے دم ذکر نہ پئے خوشاب
 قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے او جزو میں لا

تھی خبر گرم کر غالب کے اڑیں گے پرنے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
 اک تماشا ہوا لگا نہ ہوا
 تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا
 گالیاں کھا کے پے مرانا ہوا
 آج ہی گھر میں جو ریا نہ ہوا
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 کام گر رک گیا، روانہ ہوا
 لے کے دل دستاں روا نہ ہوا

✓ درد منت کشی روا نہ ہوا
 ✓ جمع کرتے ہو کیوں رقیوں کو
 ہم کہاں قسمت آنے جانے جائیں
 کتنے شیریں ہیں تیرے ب کہ رقیب
 ✓ بے خبر گرم آنے کے آنے کی
 ✓ کیا وہ نرود کی نسائی تھی؟
 ✓ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
 زخم گردب لب لبو نہ تھا
 نہ ہوتی ہے کہ دل ستانی ہے!

کچھ تو پڑھئے کر وگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سدا نہ ہوا

میں اور بیمے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دنوں بھدے پئے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر حبدا تھا
ورماندگی میں غالب کچھ بن پئے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بجز گرجہ نہ ہوتا، تو بیباں ہوتا
تنگی دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے
کاش رھنواں ہی دربار کا درباں ہوتا
نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا

دوبو یا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہو احب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سرے کٹنے کا
نہ ہوتا اگر حبدات سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے

وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ "یوں ہوتا کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عیناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبی، تقیر بھی تھا
تو مجھے بھولی گیا ہو، تو پتہ بہت ملا دول
کبھی فزاک میں تیرے کوئی بخیر بھی تھا
قید میں ہے تیرے جی کو وہی زلف کی یاد
ہاں، کچھ اک رنج گرا تباری زنجیر بھی تھا

بجلی اک گوندگی آنکھوں کے آگے تو کیا
 یوسف اسکو کس اور کچھ نہ کہے! خیر ہوئی
 دیکھ کر غیر کہ ہر کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا،
 پیشہ میں عیب نہیں رکھنے نہ فسار کو نام
 ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھسے ریاضی
 دیکھتے کے نہیں ہستاد نہیں ہو غالب
 کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا

ذکر اس پریوش کا اور پھر سیاں اپنا
 مے وہ کیوں بہت پیچے بزمِ غیر میں یارب
 منظر اک بندی پر اور ہم بہت سکتے
 دے وہ جہت ذات ہم ہنسی میں یارب
 بد دل کھوں کہنگ! ہا دن گمود کھنڈن
 گھٹے گھٹے مت جاتا اپنے بہت بدلا
 تار کے زخمنازی کر سیاں دشمن کو
 ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں گینا تھے
 بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا
یار اپنے خط کو ہم پیچ پائیں کیا
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
مرگئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

سنا پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

کوئی بتلاؤ، کہ ہم بتلائیں کیا

جانے گا اب بھی نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
یوں نہ کوئی نام ستگر کہے بغیر
سر جائے یار ہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑے خالق کو مجھے کافر کہے بغیر
چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کہے بغیر
بنتی نہیں ہے باد و ساعر کہے بغیر
سنتا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

جور سے باز آئے پر باز آئیں، کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ، ہم
چھوڑ دینگا میں نہ اس بت کافر کو جو جانا
مقصد ہے ناز و غمزہ، وئے گفتگو میں کام
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہوا التفات

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے کساں اور
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو نہ ہاں اور
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کساں اور
لے آئی گئے بازار سے جا کر دل دجاں اور
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
ہوتے جو کئی دیدہ طول تاہر فشاں اور
جلاؤ کو لیکن وہ کب جائیں گے تباں اور
ہر روز دکھا تاہوں میں اک داغ نہاں اور
کرتا، جو نہ کرتا، کوئی دن آہ و نغناں اور
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رداں اور

ہے بسکہ ہر اک انکے اشارے میں نکل اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
ابو سے ہے کیا اس نگہ تاز کو پیوند !
تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم، جب بائیں گے
ہر چند سبکدست بنے، بہت ششکنی میں
ہے خون جگر جوش میں، دل کھولکے دتا
مرا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
یتا، ناگر دل تمہیں دیتا کوئی دم پین
پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے

ہیں اور جی دنیا میں سمنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

کیونکہ اس بُت سے رکھوں جان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
کیا نہیں ہے مجھے دسان عزیز
سے ترے تیر کا پیکان عزیز

تا اب مانے ہیں غیب کی غالب

واقعہ محنت ہے اور جانی عزیز

کی دنیا ہم سے تو غیر اس کو جانتے ہیں
ہوتی آئی سے کہ چوں کو بیاکتے ہیں

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھے کیا کہتے ہیں
جوئے و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
قبلے کو اہل نظر قبلہ نہا کہتے ہیں
خدا راہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

وحشت و شیعہ اب مرثیہ کہیں شاید

مر گیا غالب آشفستہ نہا کہتے ہیں

اک چھیر ہے وگرنہ مراد امتحان نہیں
پُرسش ہے اور پلے سخن درمیان نہیں
تا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گرداں نہیں
ہر چند پشت گرمی تاب تو ان نہیں
لب پر وہ سنج زمزمہ الا مال نہیں
دل میں چھری چھو، مژہ گر خونچکان نہیں
ہے عابد دل نفس اگر آذر نشان نہیں

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
ہے پرے سرحد اراک سے اپنا مسجود
پائے انگار پہ جب سے بچھے رحم آیا ہے
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرا گیا کیا
دیکھے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گمان نہیں
کس منہ سے شکر کیجے اس لطف خاص کا
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
بوسہ نہیں نہ دیکھے دشنام ہی سہی
ہر چند جانگدازی قہر و عتاب ہے
جاں مطرب ترانہ بل بن مزید ہے
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دینم
ہے تنگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو

نقصاں نہیں جنوں میں تلے ہو گھراب
 کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں
 سو گز میں کے بدے بیاباں میں نہیں
 گویا جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں
 پاتا ہوں اس سے وار کچھ اپنے سخن کی ہیں
 ریح القدس اگرچہ مرا ہزبان نہیں

جاں ہے بہائے بوسے کیوں کہے ابھی

غالب کو بتاتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ق ۱۸۴۴

مٹی ہے خوں سے یار سے نار التہاب میں
 کب سے ہوں کیا باتوں جہان خراب میں
 کا فر سرور گزرتی ہو راحت عذاب میں
 شب بٹے سحر کو بھی رکھوں گرجاب میں
 نا پھر نہ انتشار میں خند آئے مسرور
 آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 قاصد کے آتے آتے خدا اک لکھ رکھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 بچ تک کب اگلی بنم میں آتا قاصد بجا
 ساتی نے کچھ طائر دیا ہر شراب میں
 جو ملکر وفا ہو فریب اس یہ کیسے چلے
 کیوں جگہاں میں دوست کے دشمن کے باب میں
 میں مضرب ہوں بل میں خوف رقیب سے
 ڈالا ہے تم کو وہم نے کس بیچ و تاب میں
 میں اور جلد وصل خدا ساز بات سے
 ہاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 ہے نیوری چرمی بولی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
 لاکھوں لگاؤ ایک چہرہ نا نگاہ کا
 لاکھوں بناؤ ایک جڑ نا عتاب میں
 وہ نالہ دل میں خس کے برابر بید نہ پائے
 جس سے تھکتے رہیں وہاں ہو سراب میں
 جس سے تھکتے رہیں وہاں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ مابین میں
قیثہ آثارِ الصنادید

کل کیلئے کہ آج نہ خست شراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
ہاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟
برو میں ہے خوشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
اصلِ شہوہ و شاد و مشہود ایک ہے
ہے مشتمل نمودِ مود پر وجودِ بحر
شرم، اک اداۓ نانہ اپنے ہی سے سہی
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

غالب ندیم دوست سے آتی ہر نئے دوست

مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بو تراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پٹیوں بگر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام لوں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہر گر کو میں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
اے کاش جانست نہ ترے رہنڈر کو میں
جانا پڑا رقیب کے دور پر ہزار بار

ہے کیا جو کس کے باندھے میری بلاؤں سے
 لودہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے سنگ نام ہے
 چلتا ہوں تھوڑی ہر ایک تیز رو کے ساتھ
 خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
 پھر بخود ہی میں بھول گیا راہ کوئے یار
 اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس میں ہل دہر کا
 کیا جانتا نہیں ہوں تہاری مکر کو میں
 یہ جانتا اگر تو کتنا تہ گھس کو میں
 پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہا ہوں کدو میں
 کیا پوچھا ہوں اس بُت بے وا دگر کو میں
 جاتا دگر نا ایک دن اپنی خس کو میں
 سمجھا ہوں دلپسندیر متاع ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوار ہمسند ناز

دیکھوں علی بیسا در عالی گہر کو میں

دو جہاں نے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
 لشک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رو گئے
 کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
 ہر غم ہی جائے دار تو غمخوار کیا کریں
 یاں آپڑی یہ شرم کہ ٹکڑا کر کیا کریں
 تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

نہیں کہ بھگو قیامت کا اعتقاد نہیں
 کوئی کہے کہ شب مر میں کیا برائی ہے!
 جو آؤں سامنے اُنکے تو مرجھانے کہیں
 کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
 علامہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی تراب
 شب فراق سے روز جزا نہ یاد نہیں
 بلا سے آج اردن کو ابرو باد نہیں
 جو جاؤں واں سے نہیں کوئی تاخیر یاد نہیں
 کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
 کہ انے کو چہ یہ سخا نہ نامسدا نہیں

جہاں میں ہو غم شادی ہم آہیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم انکے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں "کہ یاد نہیں"

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
کیوں گردش دام سے گھبرانے جاؤں دل
یارب ازمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟
حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھ؟
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں کیوں دریغ؟
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے؟
خاک ایسی زندگی یہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
انسان ہوں پیالہ سا غر نہیں ہوں میں
لوح جہاں پہ حرفِ مکر نہیں ہوں میں
آؤ گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں
لال و زمر و زرد و گوہر نہیں ہوں میں
رستے میں ماہ و جہر سے کمتر نہیں ہوں میں
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب و ظیفہ خوار ہوؤ شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمسیاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہو گئیں کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

نہ تھیں بناتِ انعش گروں دن کو پرے میں نہاں

شب کو ان کے جی میں کیسا آئی کہ غریاں ہوئیں
 قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
 لیکن آنکھیں روزانہ دیوار زنداں ہوئیں
 سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زان مصر سے
 ہے زینحسا خوش کہ عجماء کنفساں ہوئیں
 جوئے خوں آنکھوں سے بنے دو کہ ہے شام فراق
 میں یہ سمجھو لگا کہ شمعیں دوسرے دزاں ہوئیں
 ان پر زادوں سے لیں گے غم میں ہم ہتھام
 قدرت حق سے یہی حواریں اگر داں ہوئیں
 خندانوں کی سے دماغ اس کا ہے راتیں اہلی میں
 تیری زنجیں میں کے بازو پر پریشاں ہوئیں
 میں چین میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
 بیلین شکر مرے تالے غز محواں ہوئیں
 وہ لگا ہیں کیوں سوتی جاتی ہیں یا رب دل کے یاد
 جو مری کوتاہی قسمت سے مرزاں ہوئیں
 بیکار و کامیوں نے اور سینہ میں جبریں پے پے
 میری آہیں تجسے چاک گریباں ہوئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گائیوں کا کیا جواب؟
 یاد تھیں جتنی دعائیں صرف دریاں ہو گئیں
 جانفزا ہے بادہ جس کے لہجہ میں جسام آ گیا
 سب لکیریں لہجہ کی گو یا رنگ حباں ہو گئیں
 ہم موجود ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ موم
 بلتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایساں ہو گئیں
 رنج سے خورگہ ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
 یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اسے اہل جہاں؟
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ دیراں ہو گئیں
 دل ہی تو ہے نہ سنگِ خشت و نہ پتھر نہ گئے کیوں
 روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
 دیر نہیں، حرم نہیں، دُور نہیں، آستان نہیں
 بیٹھے ہیں رہ گزر یہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟
 جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
 آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پردے میں منہ چھپائے کیوں؟
 دشنہ غمزہ جانستیاں، ناوکِ ناز بے پناہ

غالب مر

تیرا ہی عکس رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
 قسیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دو نو ایک ہیں ✓
 موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں؟
 حُسن اور اس چُسنِ نغم، رنگینی بوالہوس کی شرم
 اپنے پہ اکتسا رہے غیسر کو آزمائے کیوں؟
 واں وہ غرورِ عز و نماز، یاں یہ تہابِ پاس و ضلع
 راہ میں ہم طلیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟
 ماں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی ✓
 جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں؟
 غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں،
 روئے زار زار کیا، کیجئے آئے آئے کیوں؟

کعبہ میں جاؤ، تو نہ وہ جلتا کیا کہیں
 طاعت میں مارے نہ وہ انگلیں کی ٹانگ
 ہوں مُخوف نہ کیوں وہ وہ ہمِ ثواب سے
 آئی اگر جلا تو جسک سے گئے نہیں
 بھولا ہوں حقِ صحبت اہلِ کنشت کو
 دوزخ میں ڈال دو کوئی نیکرِ بہشت کو
 نیز حاکماتِ قسطِ قسم مرزومت کو
 ایرا ہی دیکھ ہم نے بجایا بے کشت کو

غالب کچھ اپنی سی سے کہتا نہیں ہے
 خرمین سے نہ دیکھ کر کشت کو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو
جیا ہے اور یہی گو نگو، تو کیوں کر ہو
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی ہو تو کیوں کر ہو
جو تم سے شہر میں ہوں ایک در تو کیوں کر ہو
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو
نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیوں کر ہو
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
تمہیں کہو کہ گزار صنم پستوں کا
اچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
ہمیں پھر اُسے امید اور انہیں ہماری قدر
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گساں تسلی کا
بتاؤ اس مژدہ کو دیکھ کر ہو مچھو قرار

مجھے جنوں نہیں غالب، وے بقول حضور

فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

مرا ہونا برا کیا ہے نوا سخبان گلشن کو
نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو
کیا سینے میں جسے خرچہ کہاں، مژگانِ سوزن کو
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دہن کو
نہیں دیکھا شتا اور جئے خوں میں تیرے تو سن کو
کیا بیتاب کاں میں جنبش جو ہرے آہن کو

قفس میں ہوں اگر اچھا بھی نہ جانیں میسے شبن کو
نہیں گر ہمدی آساں نہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ نکلا اسمکھ سے تیری اک نسو، اس جواحت پر
خدا، شرمائے لاہقوں کو، کہ دیکھتے ہیں کشاکش میں
ابھی ہم قتل کہ کا دیکھنا آساں سمکھ ہیں
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی جنبش بننے کا

غالب نامہ

خوشی کیا کھیت پر میے اگر سو بار بار آدے
وفا داری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
سہتا ہوں کہ ڈھونڈنے ہے ابھی سو بقی خوں کو
شہادت تھی مری قسمت میں جوری تھی یہ خوشک
مرے بھٹانے میں تو کبہ میں گاڑو برہمن کو
زلفا دن کر، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
جہاں تلوار کو دیکھا اٹھکا دیتا تھا گروں کو
رہا کھٹکانہ چوری کا، دعا دیتا ہوں ہزن کو
سفن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویاں ہوں جو ہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھو دیں جا کے معدن کو

مرے شاہ سلیمان جاہ ت نسبت نہیں غالب

فریدون و جم و کخسرو و داراب دیہن کو

تم جاؤ تم کو غیر سے جو رسم در راہ ہو
بچتے نہیں موافقہ روزِ محشر سے
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گستاہ ہو
کیا وہ بھی بلکہ کش و حق ناشدیں
قاتل اگر قیبت ہے تو تم گواہ ہو
آجرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار
مانا کہ تم بشر نہیں نور شید و ماہ ہو
جس میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
مرتزا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب یکہ چھنا تو چرب کیا بلکہ کی تید
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خالق ہوا
تھے ہیں جو بہشت کی آرزیت سب سے
میں خدا کرے وہ تری جسلوہ گاہ ہو

غالب بھی گرد نہ ہو، تو کچھ ایسا مزہ نہیں

دنیا ہو یا سب، اور مرزا بادشاہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سچ غنساں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں نہ باں کیوں ہو

✓ وہ اپنی خونہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سبک سربن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
 کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
 ✓ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو
 ✓ نفس میں مجھ سے رواد چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
 گرمی ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشتیاں کیوں ہو
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں یہ یہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں تھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
 غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
 نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
 یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے ؟
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آستان کیوں ہو
 ✓ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں ؟
 عدد کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
 کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو پھر کہیوں کہ ماں کیوں ہو
 نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس بزم میں مجھے نہیں جتنی حسیب کہنے
 دل ہی تو ہے سب سے دریاں سے دریا
 رکھتا پھر دل میں رت و خباہت و بدینے
 بے صرفہ ہی گزرتی ہے سو کوئی غصہ نہ
 مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ادا ہوں
 کس روز ہستی میں تراشے گئے عہد و
 محبت میں غیہ کی نہ پڑی ہو کہیں یہ غم
 ضد کی ہے اور بات مگر خوشی نہیں

غالب تمہیں کہو کہ تیرا جواب کیا
 مانا کہ تم کہا گئے دروہ مند گئے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب پہ
 تسکین کو ہم نہ دیں وہ ذوقِ غصہ ہے
 اپنی گلی میں جھلکنا کر خونِ جسدِ قتل
 ساقی گری کی شرمِ نود و تنہا دور نہ ہو
 دل نیچے گھر سے ارماں نکال کے
 ہو ان طلعہ میں تری صورت اُڑے
 یہ سے یہ سے غنم کو کیوں تیرا غم ہے
 مہرباں پہاڑی کرتے ہیں نے جھگڑے

تم سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم
 تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
 میرا سلام کہتو اگر نامہ بر ملے
 فرصت کشاکش غم نہیاں سے گر ملے
 لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
 جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
 اے ساکنانِ کوحیہ و لہار دیکھنا!
 تم کو کہیں جو غالب آشفۃ سر ملے

کوئی دن گزرتی آ رہی ہے!
 آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
 اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
 سوزِ غم بے نہانی اور ہے
 بار بار دیکھی ہیں ان کی بخششیں
 دے کے خطا منہ دیکھتا ہے نامہ بر
 کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
 وہ بلائے آسمانی اور ہے
 قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
 ہو چکیں غالبِ بلائیں سب تمام
 ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
 موت کا ایک دن معین ہے
 کوئی صورت نظر نہیں آتی
 نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
 آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
 اب کسی بات پر نہیں آتی
 جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہ
 پر طبیعت ادھر نہیں آتی
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ میں
 دندنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ بیچوں؟ گمراہ کرتے ہیں
 داغ دل گر نظر نہیں آتا
 میری آواز گر نہیں آتی
 بُر بھی اسے چارہ گر نہیں آتی
 کچھ ہمدانی جس نہ نہیں آتی
 موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے باز گئے غالب

مشرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیسے بتا
 ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
 آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
 یا اسی یہ ماجرا کیا ہے؟
 کاش پر چھو کہ تدعا کیا ہے؟
 چریہ جنگ مر اسے خدا کیا ہے؟
 غمزدہ و عشورہ داد کیا ہے؟
 نگہ چشم سر مر سا کیا ہے؟
 ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
 جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
 اور درویش کی مدد کیا ہے؟
 میں نہیں جانتا دھسا کیا ہے؟
 دلِ ناداں تجھے ہوا کیسے بتا
 ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
 میں بھی منہ میں زبانِ قصا ہوں
 جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
 یہ پری چہرہ لگ کیسے ہیں؟
 تلخ زلفِ غمیری کیوں ہے؟
 سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
 ہم کو اُن سے وفا کی ہے ایسہ
 اُل جھڑک ترا بسلا مرگا
 جان تم پر نشان کرتا ہوں

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفتِ دُعا آپ تو جانتے تھے

اک مرتبہ گھبرا کے ہو کوئی کہ "وہ آئے"
کچھ کہہ نہ سکوں، پردہ مئے پر چھنے کو آئے
آنا ہی، سمجھ میں مری آتا نہیں، گواہ آئے
ہاں، منہ سے مگر بادہ دو شینہ کی بواہ آئے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
دیکھا کہ وہ تھا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہوا آئے
اچھے رہے آپ اس سے مگر جھکو ڈبو آئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب

ہم بھی گئے وال، اور تری تقدیر کو رو آئے

یہ بھی مت کہہ کہ جو کہنے تو گلا ہوتا ہے،
اک ذرا چھیرے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
شکوہ جو رے سرگرم جفا ہوتا ہے
ست رو، جیسے کوئی آبلہ یا ہوتا ہے
آپ اٹھا لاتے ہیں گریہ خطا ہوتا ہے
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

کہتے تو ہر دم سب کہ بتِ غالبہ ہو آئے
ہوں کشمکش نزع میں، ہاں جذبِ محبت
ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھکرتے
ہاں اہل طلب، کون سننے طعنہ نہ یافت
ایسا نہیں وہ شیدہ کہ آرام سے بیٹھیں
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقدیر

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں اگلے جیسے بلجا
گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
عشق کی راہ میں ہے چرخِ مہرِ کب کی وہ چال
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ تاوکِ بیداد کہ ہم
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب

خامہ میرا کہ وہ ہے بار بار بزم سخن
اے شہنشاہ کراکب سپہ دہر مسلم
سات اقلیم کا حاصل جو سندرا ہم کیجے
ہر جہیز میں جو یہ بدست ہوتا ہے ہلال
میں جو گستاخ ہوتا ہے غز نوالی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فضا ہوتا ہے
بکھیر غالب مجھے اس تلخ نوالی میں صاف

آج کچھ درد مے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ جتنے ہر دم "کہ تو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
چمک رہا ہے ہوتے بدن پہ پیرا بن
غلابے جسم جیوں دل بھی ہل گیا ہر گاہ
رنگ میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں تاق
وہ چیر جس کیلئے ہلکو ہو بیشع عزیز
یہی شراب اگر خم بھی دیکھ مول پیدا
وہ نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی

تہیں کہو کہ یہ انداز گفت گو کیا ہے
کولی بناؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے
وگرنہ خوف بدآموزی عدد کیا ہے
ہماری جیب کو اب حاجت تو کیا ہے
کریہ تے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
جب آنکھوں سے نہ پکا تو پھر ہو کیا ہے
سوانے بادۂ گھلام مشہور کیا ہے
یہ شیشہ وقار و کوزہ دسبھو کیا ہے
تو کس عیب پہ لکے کہ آرزو کیا ہے

ہو اب شہ کا مصائب پہرے پتہ تو آتا

وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میں انہیں پھیر دوں اور وہ کچھ نہ کہیں
 قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو،
 مہری قسمت میں غم گر اتنا تھا
 دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
 چل نکلتے جوئے پیے ہوتے
 کاشکے، تم مرے پیے ہوتے
 آہی جاتا وہ راہ پر غالب
 کوئی دن اور بھی جیسے ہوتے

حسنِ مہ اگرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
 بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
 اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
 بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
 آنکے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
 دیکھے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
 ہم سخنِ تیشے نے فساد کو شیریں کیا
 قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
 حضورِ سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
 اس سے میرا مہِ غور شدید جمال اچھا ہے
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
 ساعِ حرم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
 وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
 وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں رکا حال اچھا ہے
 ایک برہمن نے کہہ ہے کہ یہ سال اچھا ہے
 جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے
 شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
 دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
 غیر میں محفل میں بوسے جام کے
 ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ، کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہنے اور صبح دم دھوئے دھتے جامہٴ حرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا؟ مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھتے کب دن پھر جی حرام کے
عشق نے غالب نگما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہا را آئی کہ ہوئے مہر و متسا شافی
دیکھو اے ساکنانِ خطہٴ خاک اس کو کہتے ہیں عالمِ آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر رُکوشِ سطحِ چرخِ مدینائی
سبزہ کو جب ہمیں جبکہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہٴ گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ میسائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب

شاہِ دیندار نے شفا پائی

دیا ہے دل اگر اُسکو، بشر ہے کیا کہیے ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آتے بن نہ ہے قصا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہیں گہرے گہرے کہ کوئے دوست کیاب
 نہ ہے کہ شمع کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
 سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرستش حال
 تمہیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال
 انہیں سوال یہ نہ عم جنوں ہے کیوں لڑیے
 حسدِ سودائے کمال سخن ہے کیا کیجے

اگر نہ کہنے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
 کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے، کیا کہیے
 کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے
 ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا، کہیے
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے، کیا کہیے
 ستم، بہائے مستلِ ہنر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن

سوائے اسکے کہ آشفۃ سر ہے، کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
 قدو گیسویں، قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
 کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحان آخر
 شیم مصر کو کیا پیر کینساں کی ہوا خواہی
 وہ آیا برم میں دیکھو! نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
 ہے دل ہی میں تیرا چھا جگر کے پاس، بہتر
 نہیں کچھ سمجھو زنا کے پھندے میں گیرائی
 پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل
 رنگِ دپے میں جباتے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو

چمن میں خوش نوا یانِ چمن کی آزمائش ہے
 جہاں ہم ہیں دلاں دار و رسن کی آزمائش ہے
 ہنوز اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہے
 اُسے یوسف کی بے پیرہن کی آزمائش ہے
 شکیبِ صبرِ اہلِ انجن کی آزمائش ہے
 غرض شستِ بتِ ناوکِ فلن کی آزمائش ہے
 وفاداری میں شیخ و برہن کی آزمائش ہے
 مگر پھر تابِ لعفِ پرشکن کی آزمائش ہے
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا، دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب سپدِ سخن کی آزمائش ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُسکو سنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اُسکو، نگرے جذبہِ دل
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا؟
کہہ سکے کون؟ کہ جیسوہ گری کس کی ہے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ ہے
بوجھ وہ مرے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے
ماٹھ آئیں، تو انہیں ماٹھ لگائے نہ بنے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُسے کہ اٹھائے نہ بنے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتشِ غالب

کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ✓
اک کھیل ہے اور نگِ سلیمان مرے نزدیک ✓
جز نام نہیں صورتِ عالم، مجھے منظور
ہوتا ہے نہاں گردیں صحرا، مرے ہوتے
مست پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

ہوتا ہے شبِ روزِ تساؤ مرے آ
اک بات ہے اعجازِ میاں مرے آ
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آ
گھستا ہے جہیں خاک پہ دریا مرے آ
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آ

بیٹھا ہے بت آئینہ سیمارے آگے
رکھ دے کوئی پیمانہ صہبائے آگے
کیونکر کہوں۔ "کو نام نہ ان کا مرے آگے"
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
مجنوں کو بُرا کہنتی ہے سیلے مرے آگے
آئی شب بھراں کی تمنا مرے آگے
آتا ہے ابھی دیکھے کیا کیا مرے آگے
رہنے دوا ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود ہیں خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؛
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانی گفتار
نفرت کا گماں گزروے ہے میں شکست گزرا
ایساں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
ہے مریض اک قلزمِ خون کا شہی ہو
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
مجھے تو خوف ہے کہ جو کچھ کہو "بجائے" کہیے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہہ دو لکٹا کہیے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں مصیبتِ ناساز تھی دوا کہیے
کہیں حکایتِ صبرِ گرینہ پائے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستگر ہیں"
وہ بیشتر سہی پر دل میں جیبا تر جاوے
نہیں ذریعہِ راحت، جراحتِ پیکاں
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے،
کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض لکھیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے
کئے زبان تو خنجر کو مرجھا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہو نگار تو ہے
روانی روش دستی ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے
سفینہ جبکہ کنارے پہ آگیا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

✓ ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
✓ شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
✓ چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
✓ بات پرواں زبان کشتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
✓ بکٹ ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
✓ نہ سنو اگر بُرا کہے کوئی
نہ کہو اگر بُرا کرے کوئی
✓ روک لو اگر غلط چلے کوئی
بخش دو اگر خطا کرے کوئی
✓ کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کیا کیا خضر نے سکندر سے
کس کی حاجت رد کرے کوئی
اب کسے رہنما کرے کوئی

✓ جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

✓ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کو شرابوں، مجھ کو غم کیا ہے

تہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں اکاٹے تو سانپ کھلائے
لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
وہ داد و دید گرا نمایہ شرط ہے ہمدم!

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی

یقین ہے ہنکو بھی لیکن اب اس میں تم کیا

روندی ہوئی ہے کو کبہ شہر یار کی
جب اُسکے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ
اترائے کیوں نہ خاک سدرِ بگزار کی
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہولا زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے مہرے

کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں اسی کہ سرخوش پر دم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا ہو گیا اسکی گردن پر
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی دلائی کا
مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آسمانی
بیت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
وہ خوں جو چشم تیرے عمر بھریں دمدم نکلے
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے
اگر اس طرۃ پر بیچ و خم کا بیچ و خم نکلے
ہوئی بیع اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں غلط

پراتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

منظور تھی یہ شکل تجسّی کو نور کی
اک خرچہ کماں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلاسکو
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا
آدھ بہا رکی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
گر می سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر

غالب۔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ سیاد کمیں میں

کیا نہ بد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
نرمزم ہی پہ چھوڑ دیجھے، کیا طوفِ حرم سے
ہے قہر اگر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
خوں ہو کے جگر آ نکھ سے ٹپکا نہیں لے مرگ

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے

غزل مشاعرہ

نزدِ امن ہے بیدارِ دوست جاں کے لئے
ہلائے گر مرثیہ یا رہ تشنہ خوں ہے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلقِ لے خضر
زہلا بلا میں بھی مبتلائے آفتِ رشک
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ ہیر
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری شامت آئی
بعدِ شوق نہیں طرفِ تنگنائے غزل

سہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
رکھوں کچھ اپنی بھی مثرگانِ خونِ فشاں کیلئے
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ حبا وداں کے لئے
ہلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے
دراز وستی قاتل کے امتحاں کیلئے
کہے نفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کیلئے
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
زمانہ عہد میں اس کے ہے محورِ آرایش
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
بنایا ہے عیشِ تجسسِ حسینِ خاں کے لئے
کہ میرے لطف نے بوسے مری زباں کے لئے
بنایا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لئے
بنیائے اور ستارے اب آسماں کے لئے
سفینہ چاہئے اس بھرِ سیراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ وال کے لئے
(۱۸۴۵ء)

مرثیہ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مزارِ ستہ کوئی دن اور
مٹ جائیگا سرِ گرترا پتھر نہ بگھسے گا
آئے ہو گل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "حباؤں"
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو میں گے
ہاں لے فلکِ پیرِ جواں تھا ابھی عارف
تم ماہِ شبِ چارِ دہم تھے سرے گھر کے
تم کون سے تھے ایسے گھرے وادوست کے
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
ہوں ور پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیز سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش ناخوش؟
کرنا تھا جو امرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو، کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سہرا

خوش ہوئے بخت کہ ہے آج ترے سر پہ
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
سر پہ چڑھنا مجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
ناؤ بھر کر ہی پر وئے گئے ہونگے موتی
سات دریل کے فراہم کئے ہونگے موتی
رُخ پہ دو لہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
جی میں اترا ایش نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
جبکہ اپنے میں سما دیں نہ خوشی کے ماے
رُخ روشن کی دیک، اگر ہر غلطاں کی چمک
تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ایر بہار
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا
ہے ترے حسن دل افزود کا زیور سہرا
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترانہ سہرا
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لٹکا کر سہرا
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
ہے رگِ ایر گیسر بار سرِ امر سہرا
رہ گیا آن کے دامن کے برا بوسہرا
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مکر سہرا
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
لائیکا تاپ گراں باری گوتہ سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں !
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

معذرت

منظور ہے گزارش احوال واقعی
سوسپت سے بے پیشہ آباسپہ گری
آزاد و رہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
استادشہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال
جام جہاں ٹلے شہنشاہ کا ضمیر
میں کون اور بختہ مال اس سے مدعا
سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر
مقطع میں آپڑی بے سخن گسترانبات
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاء
قسمت بُری سہی یہ طبیعت بُری نہیں

اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
سو گندہ اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
جز انبساطِ خاطر حضرت نہیں مجھے
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
بے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نوحہ

ہاں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو اے دجلہ و خوں چشمِ طائغ سے رواں ہو
اے زمزمہ تم لبِ علیؑ پہ فشاں ہو اے ماتیانِ شہرِ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی

اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہسکو ماتم میں شہرِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر بھونکنے میں اپنے محاسبان نہیں ہم کو گر چرخِ مہی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگرنہ پایا جو مدت سے بچا ہے

کیا خیمہ شہر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے

گرتا نہیں اس رُوسے کہو برق نہیں ہے

قصیدہ

ہاں امیرِ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو توجھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
اڑ کے جاتا کہاں، کہ تاروں کا
مرجا اے سرورِ خاص خواص
عذر میں تین دن نہ آنے کے
اُس کو بھولانے چاہئے کہنا
ایک ہیں کیا کہ سب نے جان لیا
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
مہرتا ہاں کو ہو تو ہو، اے ماہ
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جانتا ہوں کہ اُسکے فیض سے تو
ماہِ بن، ماہِ تاب بن، میں کون
میرا اپنا حُبِ اعلیٰ ہے
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص

یہی انداز اور یہی اندام
بندہ عاجز ہے گردشِ آیام
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
جہذا اے نشا طِ عمامِ عوام
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
صبح جو جائے اور آئے شام
تیرا آغاز اور ترا انجام
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام
ایک ہی ہے امید گاہِ اتمام
غالب اس کا نگر نہیں ہے غلام
تب کہا ہے بہ طرزیہ استغنام
قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
اور کے لین دین سے کیا کام
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بجٹے گا تجھ کو زرفروغ
جیکہ چودہ من زلِ فلکی
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
دیکھنا میرے ہاتھوں میں لبریز
پھر غزل کی روش پر چل نکلا
کیا نہ دے گا مجھے مئے کلفام
کہ چکی قطع تیری تیزی گام
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
تو سن صبح چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کہ چکا تھا میرا کام
نئے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے
کعبے میں جا بجا میں گئے ناقوس
اُس قدح کا ہے دورِ مجھ کو نقد
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
غم سے جب ہو گئی ہو زینتِ حرام
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
اب تو باندھا ہے دیر میں اجرام
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ ام
دل کے سینے میں جن کو تھا ابرام

چھپیرا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے

کیوں رکھوں ورتہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
اے پری چہرہ بیک تیز خرام
ہیں مہ و مہر و ہرہ و ہبہ نام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
 قبلہ چشم و دل بہادر شاہ
 شہسوار طریقتہ انصاف
 جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
 بزم میں میزبانِ فیض و رحیم
 اے ترا لطف زندگی انسا
 چشم بدو و خسروانہ شکوہ
 جاں نثاروں میں تیرے قیصر دم
 وارث ملک جانتے ہیں تجھے
 زور بازو میں مانتے ہیں تجھے
 مرحبا موشگافی ناوک
 تیر کو تیرے تیر غیبر ہدف
 وعدہ کا کر رہی ہے کیا دم بند
 تیرے فیصل گراں جسد کی صدا
 فن صورت گری میں سیرا گرز
 اسکے مضروب کے سرو تن سے
 جب اذل میں رقم پزیر ہوئے

نام شاہنشاہ بلند مقام
 منظر ذوالجلال والاکرام
 نو بہارِ حدیقہ اسلام
 جس کا ہر قول معنی الہام
 رزم میں اوستا و رستم و سام
 اے ترا عہدِ فرخی فرجام
 لوحِ اللہ عارفانہ کلام
 جہ عہ خواروں میں تیرے مرشد جام
 ایرج و تور و خسرو و بہرام
 گیو و گودرز و بیزن و تمام
 آفریں آمداری صمصام
 تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
 برق کو دے رہا ہے کیا الزام
 تیرے رخسِ سبک عنان کا خرام
 گرنہ کھتا ہو دستگاہ تمام
 کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
 صفحہ ہائے لیالی و آیام

اور اُن اور اقی میں بہ کلبِ قضا
لکھد یا شاہدوں کو عاشقِ کش
آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
آتش و آب و باد و خاک نے لی
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
تیری تویقِ سلطنت کو بھی
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم

مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھد یا عاشقوں کو دشمنِ کام
گنبدِ تیز گردِ نیلی خام
خال کو دانہ اور زلف کو دام
وضعِ سوز و غم و رم و آرام
ماوِ تاباں کا نام شمعِ شام
دی بدستور صورتِ ارقام
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیِ آغاز
ہوا بد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازہٴ خاں کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
وہ بھی تھی ایک سیمیا کی سی نمود
میں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو

مہرِ عالمِ تاب کا منظر کھلا
شب کو تھا گنجینہٴ گوہر کھلا
صبح کو رازِ مہ و اخت کھلا
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
موتیوں کا ہر طرف زبور کھلا

صبح آیا حسانِ مشرق نظر
تھی نظر بند ہی کیا جب روضہ
لا کے ساتی نے صبوحی کے لئے
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
تاجِ زرین، مہر تاباں سے سوا
شاہِ روشنِ دل بہادر شہ، کہ ہے
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
روشناسوں کی جہاں فہرست
توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ق
نقشِ پاکی صورتیں وہ دلغزب
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ایک
تھا دل وابستہ قفلِ بے کلید
باغِ معنی کی دکھاؤں کا بہار
ہو جہاں گرمِ غزلِ خوانی نفس

اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا
بادِ گلرنگ کا سا غر کھلا
رکھ دیا ہے ایک حجامِ زکھلا
کعبہ امن و امان کا در کھلا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
راژِ ہستی اُس پہ سرتاسر کھلا
مقصد نہ چرخ و مہفت اختر کھلا
عقدِ احکامِ مغیب کھلا
اُس کے سرنگوں کا جب دُور کھلا
وال لکھا ہے چہرہِ قیصر کھلا
تھان سے وہ غیبتِ مرم کھلا
تو بکے تجھ سے آؤر کھلا
منصبِ مہر و مہد و محور کھلا
میری حدِ وسیع سے باہر کھلا
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
لوگ جانیں طبلِ غنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پرکھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
ہاتھ سے رکھ دی کب برونے کمان
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

کاشکے ہوتا قفس کا دھڑلا
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
دوست کا ہے حال دشمن پر کھلا
زخمِ لیکن داغ سے بہت کھلا
کب کر سے غمِ غم کی خنجر کھلا
رہروی میں پرودہ رہب کھلا
آگ بھڑکی منہ اگر دم بھر کھلا
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو، غالب سے گرا بھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کا فر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
خامے نے پائی طبیعت سے مدد
مدح سے مدوح کی دیکھی شکوہ
مہر کا نیا، چرخ چکر کھا گیا
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
عرض سے یاں رتبہ جو ہر کھلا
بادشہ کا رایتِ شکر کھلا
اب غلو پایہ منبر کھلا

سکتہ شہ کا ہوا ہے روشناس
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
ہو سکے کیا مدح اہاں اک نام ہے
فکر اچھی پرستائش ناتمام
جانتا ہوں ہے خط لوح ازل
اب عیار آبروئے زر کھلا
اب آہل سعی اسکن در کھلا
اب فریب طغرل و بخت کھلا
دفتر مدح جہاں داوڑ کھلا
عجز اعجاز ستائش گر کھلا
تم یہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب ملک
ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

صفتِ انبہ

ہاں دل درو مند زمزمہ ساز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھے
بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے
آم کا کون مرد میدان ہے
تاک کے جی ہیں کیوں ہے ارماں
آم کے آگے پیش جائے خاک
کیوں نہ کھولے درخیزینہ راز
شاخ گل کا ہے گلستاں ہونا
نکتہ لائے خروفسزا لکھے
خامہ نخل رطب نشاں ہو جائے
ثمر و شاخ گوئے چو گال ہے
آئے یہ گوئے اور یہ میدان
پھوڑتا ہے جلے پھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدر
 یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
 مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
 نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ بار
 اور دوڑائیے قیاس کہاں
 جان میں ہوتی گریہ شیرینی
 جان دینے میں اس کو کیتا جان
 نظر آتا ہے یوں مجھے قیاس
 آتش گل پہ قند کا ہے قوام
 یا یہ ہو گا کہ فسر طرافت سے
 انگلیں کے، بہ حکم رب الناس
 یا لگا کر خضر نے شاخ نبات
 تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
 تھا ترنج زر، ایک خمر و پاس
 آم کو دیکھتا اگر اک بار
 رونق کار گاہِ برگ و لہا
 رہو راہ خلد کا توشہ
 بادۂ ناب بن گیا انگور
 شرم سے پانی پانی ہوتا ہے
 آم کے آگے نیشکر کیا ہے
 جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
 جان شیریں میں یہ منہاس کہاں
 کو کہن، باوجود غم گینی
 پر، وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
 کہ دوا خانہ ازل میں مگر
 شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
 باغبانوں نے باغِ جنت سے
 بھر کے بھیجے ہیں سر پہ مہر گلاس
 مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
 ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
 رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
 پھینک دیتا طلحائے دست افشاں
 نازش دو دہان آب و ہوا
 طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحب شاخ و برگ بار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
وہ کہ ہے والی ولایت عہد
فخر دین عز شان و جاہ جلال
کار فرمائے دین و دولت و بخت
سایہ اس کا ہوا کا سایہ ہے
لے مفیض وجود سایہ و نور
اس خداوندی بندہ پرور کو
ناز پروردہ بہار ہے آم
نور بخش بارغ سلطان ہو
عدل سے اس کے ہے حمایت عہد
زینت طینت و جمال کمال
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
جب تلک ہے نمود سایہ و نور
وارث گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شاد ماں رکھیو

اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قلمت

اے شہنشاہ فلک منظر ہے مثل و نظیر
پاؤں سے تیرے ملے فرق اراوت اور نگ
تیرا انداز سخن، شاہ زلف ابہام
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطہ قرب کلیم
بہ سخن ادج وہ مرتبہ معنی و لفظ
اے جہاندار کرم شیوہ ہے شبہ و عدیل
فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل
تیری رفتار قلم جنبش بال جب عدیل
تجھ سے دنیا میں بچھا مابدہ بذل خلیل
بکرم داغ نہ ناصیہ قلم و نیل

تا تو سے عہد میں ہو رنج و الم کی تفصیل
 زہر مرنے ترک کیا حوت سے کرنا تجویز
 تیرے بخشش مری انجام مقاصد کی کفیل
 تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل
 چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
 پہلے ٹھوکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل
 کشش دم نہیں بے ضابطہ جبرِ ثقیل
 غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنجیل
 کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل
 میرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل
 جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تجھیل
 کعبہ امن و اماں عقدہ کشائی میں ڈھیل

تا ترے وقت میں ہر عیش و طرب کی توقیر
 ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے حسابا باہر
 تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی بین
 تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
 بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
 پیچھے والی ہے سرِ رشتہ اوقات میں گانٹھ
 تپشِ دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم
 دُرِ معنی سے مرا صفحہِ لقا کی وارڈھی
 فکر میری گہرا ندوز اشاراتِ کثیر
 میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدقِ توضیح
 نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
 قبیلہ کون و مکان خستہ نوازی میں یہ دیر

گزارش بحضرت شہنشاہ

اے جہا ندارِ آفتابِ آمار
 تھا میں اک درد مندِ سینہ فگار
 ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

اے شہنشاہِ آسماں اور نگ
 تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین
 تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی

کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیسہ
 گرچہ اذر و سے ننگ بے ہیزی
 کہ گر اپنے کو نہیں کہوں خساکی
 شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
 خانہ زاد اور مرید اور مداح
 بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
 نہ کہوں آپ سے تو کس کہوں
 پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
 کچھ تو جاڑے میں چسپا ہے آخر
 کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
 کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ
 آگ تاپے کہاں تلک انساں
 دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
 میری تنخواہ جو مقدر ہے
 رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
 مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات

روشناس ثوابت و ستیاری
 ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خواہ
 جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
 یادشہ کا غلام کار گزار
 تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
 نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
 مدعائے ضروری الاظہار
 ذوق آرائش سر و دستار
 تانہ سے یاد زہریہ آزار
 جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
 کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
 بھار میں جائیں ایسے لیل و نہار
 دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
 وقنا ربنا عذاب النار
 اس کے مٹنے کا ہے عجب ہنجار
 خلق کا ہے اسی چلن پر مدار
 اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
میری تنخواہ میں تہائی کا
آج مجھ سے نہیں زمانے میں
رزم کی داستان اگر سنیے
بزم کا التزام کر کیجے ،
ظلم ہے گرد و دو سخن کی داد
آپ کا بندہ اور پھروں تنگا
میری تنخواہ کیجے ماہ بسا
ختم کرتا ہوں اب دعا یہ کلام

اور رہتی ہے سود کی تکرار
ہو گیا ہے شریک سا ہو کار
شاعر نغز گوئے خوش گفتار
ہے زباں میری تیغ جو ہر دار
ہے سلم میری ابر گوہر بار
قہر ہے گرد و نہ مجھ کو پیار
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں نچاس ہزار

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والانے
نہ کھاتے گیہوں ، تکتے نہ غلہ سے باہر

مجھے جو نہ بھی ہے بین کی روغنی روٹی
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو تہی ارادت ہے تو کس بات ہے

غالب نامہ

گر چہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
خستگی کا ہر بھلا جس کے سبب سے ہر دست
ہاتھ میں تیرے لیے تو سن دولت کی عنایاں
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
گرد شرف خضر کی بھی بھکھو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو وریا کا زہار
غالب خاک نشین اہل خرابات سے ہے

قطعہ

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
بٹے ہیں سونے بوپے کے چھلے حضور میں
یوں سمجھے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند

قطعہ

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

تو وا کرے اس عقدہ کو، سو بھی بشارت
گر لب کو نہ دے چہنہ جیواں سے طہارت
ہے فخر، سیماں جو کرے تیری وزارت
ہے داغ غلامی ترا تو قیغ امارت
تو آگ سے گدغ کرے تاب شرارت
باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
تا صر ہے شکایت میں تری میری عبارت
نظار کی صنعت حق، اہل بصارت
غالب کو ترے عتبہ عالی کی زیارت

جو عقدہ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
مکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
آصف کو سیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے نقش مریدی تر انسران الہی
تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں
ڈھونڈے نہ ملے موجہ دریا میں رانی
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توئسل
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
نور روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک

رباعیت

اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
جس پاس روزہ کھو کے کھانے کو کچھ نہ ہو

جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
ہو نہ غلبہ غلبہ کسی پہ مجھے

مجھ پہ کیا گزے گی اتنے روزِ حاضرین ہوئے
تین مہل تین تبریدیں یہ سب کچھ دن ہوئے

سہل تھا سہل دے یہ سخت مشکل آ پڑی
تین دن سہل سے پہلے تین دن سہل کے بعد

کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی محفوظ
۱۸۵۴ء

نختہ انجمن طوئے میرزا جعفر
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب

ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
تو بولا "انتِ شراحِ جہنِ جمشید"
۱۲۶۰ھ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے

دربارِ دارِ لوگ بہم آشنا نہیں
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
کانوں پہ لاکھ دھرتے ہیں کرتے مجھے سلام

تا شاہِ شیوع دانش و داد کرے
ہے جعفر کہ افزائشِ اعدا کرے

حق شہ کی بقاے خلق کو شاد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ

اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ ہوا
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ ہوا

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں، بلکہ ہوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ، فرعن کریں

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پریش سے اسے عار نہیں
جرأت کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکہ مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
وہ آپ ہیں صبح و شام کرتے والے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے، غالب لیکن
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
خس خانہ و برنس اب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
بھیجے ہیں جوار مغساں، شبہ دالانے
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

نعت

حق جلوہ گر طرز بیان محمد ست
آئینہ دار پرتو مہرست ماہتاب
آرے کلام حق بزبان محمد ست
شان حق آشکارہ شان محمد ست
تیر قضاہر آئینہ در ترکش حق ست
اکشاد آں ز کسان محمد ست

دانی اگر به معنی لولاک واری
 هر کس قسم بد آنچه عزیزست می خورده
 و اعط حدیث سایه طوبی فروگذار
 بگر و نیمه گشتن ماه تمام را
 در خود ز نقش مهر نبوت سخن رود
 خود هر چه از حقست از آن محمدست
 سو گند کردگار بجان محمدست
 کاینجا سخن ز سرور دین محمدست
 کان نیمه جنبسته ز بنان محمدست
 آل نیز نامور ز نشان محمدست

غالب ثنائے خواجہ بہزداں گزاشتم
 کان ذات پاک مرتبہ دین محمدست

حسن تغزل

دل برد حق آنست کہ دلبر نتوان گفت
 در دزم گیش نایب ز خجسته نتوان برد
 ز خشنده کی ساعد و گردن نتوان جست
 پیوستہ و بد بادہ و ساقی نتوان خواند
 از حوصلہ یاری مطلب صاعقه تیز است
 ہنگامہ ستراد چہ زنی دم زلف سلم
 در گرم روی سایہ دمہ چشمہ نجوم
 آن را کہ در سینہ نہا نیست نہ وعظ است
 بیدار توان دید و ستیگر نتوان گفت
 در بزم گیش بادہ و ساغر نتوان گفت
 نہ بندگی یارہ و پرگر نتوان گفت
 ہموارہ ترا شد بت و آذر نتوان گفت
 پروانہ شواہین باز سمن در نتوان گفت
 گر خود ستی رفت بمحشر نتوان گفت
 با ما سخن از طوبی و کوتر نتوان گفت
 بردار توان گفت بمنبر نتوان گفت

کار سے عجب افتاد بدین شیفۃ مارا
مومن بنور غالب و کافر تو ان گشت

روز ازل

گویند کہ در روز است از رہ گستی
آں از نعم آوازه انکار در افگند
آں آب کہ از خاک بھی ببرزه ماند
در دشت یکے آبله زد دانه تسبیح
زاگونه در آ میخت یکے باہم خویش
ز اں رنگ جگر خست یکے راستم حجر
را ندید یکے را کہ چو لب تشنه رفت
خواندند بک مہر کہ از کعبہ یکے را
آں ردفت در میکہ و خرده زریا
شوریدہ اداسے بدیم تیشہ دال
آسودہ بفر دوس بریں آدم و آگاہ
آں یک کہ بر آمد چہ قدر نام برآورد
ایں دائرہ کزد ورنیا سودا مانے

حرفے ز لب کافرو دیندار برآمد
ایں راز بے معنی افسار برآمد
و طینت آہن ہمہ زنگار برآمد
بر دوش یکے رشتہ ز زنگار برآمد
کش نقش و و یکہ بہ نمودار برآمد
کش تخت دل از دیدہ خونبار برآمد
ہم تشنہ لب از خانہ خمار برآمد
آواز بیا از دور و دیوار برآمد
ایں کوفت در صومعہ و مار برآمد
آشفۃ نواسے بسر دار برآمد
از دم مسہ دیو تبہ کار برآمد
دیں یک کہ بر آمد و چسائی برآمد
بے واسطہ گردش پر کاد برآمد

آئین مغرب

شیدہ و انداز ایشاں را نگر	صاحبان انگلستان را نگر
آنچه ہرگز کس ندید آورہ اند	تاجہ آئینہا پیدا آورہ اند
سعی ہر پیشینیاں پیشی گرفت	زین ہنرمنداں ہنر پیشی گرفت
کس نیاں و ملک ہر زین داشتن	حق این قومست آئین داشتن
ہند را صدگونہ آئین بستہ اند	داود دانش را ہم پیوستہ اند
این ہنرمنداں ز خص چون آوردند	آتشے کز سنگ بیرون آوردند
دود کشتی را ہمیر اند در آب	تاجہ افسوں خواندہ اند ایناں کاب
کہ دخال گردوں بہا مولی	کہ دخال کشتی بہ چیموں می برد
نرہ گا و اسب را ماند و مال	غلطک زردوں بگرداند دخال
باد و موج این ہر دو یکا را آمدہ	از دخال زور قی پرستار آمدہ
حرف چون طائر ہر دوازا آوردند	نغمہ لایے زخمہ از ساز آوردند
در دودم آرند حرف از صد گزہ	ہیں فی بینی کہ این دانا گزہ
می درخشہ باد چون اخگر ہے	می زنند آتش بسا و اندر ہے
در ہر آئین صد نو آئین کار ہیں	کار و بار مردم ہر شیا ہیں
گشتہ آئین و گر تقویم پارا	پیش این آئین کہ دارد روزگار

چراغِ سحری

۱۸۵۷ تا ۱۸۶۷

قندپاری

ہم انا اللہ خواں درختے را بگفتار آورد
ایکہ بنداری کہ ناچار است گردوں در روشن
نکتہ داریم و بایاران میگوئیم فاش
آں کند قطع بیاباں این شکافند مغز کوہ
جذب شوقش ہیں کہ در ہنگام گشتن زویر
وانہا چوں ریزد از تبیع تاکے پیش نیست
نزد و با حیف است گزند زینجا میل باش
ہر انارے را کہ افشایم از دے خون چکد

ہم انا الحق گوئے مرے را سوار آورد
نیست ناچار آں کہ گردوں ابرفتار آورد
طایب دیدار باید تاب دیدار آورد
عشق ہر یک را بطرز خاص کار آورد
ورقائے خوشتن بت را برفتار آورد
این مشہد دہر گاہ از سبجہ زنا ر آورد
جذبہ کنز چاہ یوسف را بہار آورد
ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد

نیست چوں در منطقش جز ذکر شاید حرف و صوت

(۱۸۶۵)

شاہرے باید کہ غالب را بگفتار آورد

اے ذوقِ نوا سنجی باز من بخر دیش آور
 گر خود بچید از سر از دیدہ فرو بارش
 ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہ ویرانہ
 شور ابہ این وادی تلخ است اگر ادای
 دامن کہ ز رے داری ہر جاگز رے داری
 گر مرغ بکد درینہ دبر کف بند واپسی شود
 ریحاں و مدانہینار امش چکد از قفل
 گاہے بسبکستی زان بادہ ز خوشیم بر

غالب کہ بقائش باد ہم پائے اگر ناید
 بارے غزلے فروے زان موئید پوش آور

قصیدہ

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
 حق داد داد حق کہ ہرگز قصہ اریافت
 ہر کس ہر آنچہ جست ہر رگزار یافت
 بر روئے خاک بیج و خم زلف اریافت
 پاداش جاگد از می شہبائے تار یافت
 اجر جگر خاشے پیکان خسار یافت

در روزگار نماند شمار یافت
 پر کار تیز گرد فلک در میان مبین
 در لائے آسماں بن میں باز کردہ اند
 آمد اگر بغرض ز بالا بلا فرود
 چون حسن ماہ یک شبہ بینی ہواں کہ ماہ
 چون رنگ دینے گل ٹری شاد شو کہ گل

ابن پدوش کہ خلق زبردگار یافت
 در دہر ہر چہ صورت ازین ہر چہ یافت
 ہر شے بہ حسن جو ہر خویش اشتہار یافت
 ہم بر سر اسے خودش بندہ واریافت
 تو قیغ خوشدلی ز خدا وندگار یافت
 لیل و نہار صورت یل و نہار یافت
 ناہید ذوق و زہش مغرب تار یافت
 اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت
 ہر کس نشاط تازہ ز ہر گز کار یافت
 ذوق صبح عابد شب زندہ واریافت

در خاک باد و آتش و آب آشتی فرود
 ناچار جز بداد گریش نمی کند
 ہر کس بقدر فطرت خویش ارجمند گشت
 گر خواہ بندہ را خط آزادگی بنشت
 در بندہ خود ز خشم خط بندگی درید
 مہ روشنی و مہر فردش ز سر گرفت
 بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد
 نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد
 بہیم ز دند قاعدہ ہائے کہن بدہر
 فیض سحر بہ غالب پیمانہ کش رسید

غزلیات اردو

میں مشتِ غم میں آہوئے صیا و دیدہ ہوں
 گہ نالہ کشیدہ گہ اشکِ چکپیدہ ہوں
 از بسکہ تلخیِ غم ہجرالِ چشیدہ ہوں
 میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
 نے دانہ فسادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

ممكن نہیں ہے ہول کے بھی آرمیدہ ہوں
 ہوں و موند جبر ہو یا اختیار ہو
 جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
 نے سچے سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
 ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ

شب وصال میں مونس گیت بن تکیہ
خارج باوشہیں کیوں نہ مانگوں آج؟
ہوا ہے موجب آرام جان دقن تکیہ
کہ بن گیا ہے خم جعد پر شکن تکیہ
ہوا ہے دستہ شہرین و شترن تکیہ
بنابہ تختہ گداہے یا سہیں بستر

مگر ہے۔ مرزا ان میں سے بعض کی اشاعت کو اپنی شاعرانہ شہرت کے لئے مفید نہ سمجھتے ہیں۔ ایک شاعر و مقلد کی خوشنودی کیلئے یا کسی مورخ یا تنقید کاغذی ایسے اشعار لکھتا ہے۔ جو ان کے دیوان میں شائع ہونے کے قابل نہیں ہونگے۔ مثلاً غالبؔ مرزا شباب الدین صاحب کے متعلق مرزا صاحب اربعین کے خدو میں جو دو اُمید و بے ایمان لکھیں ہیں۔ یا لا و نہ جانے کے متعلق جو قلم لکھا ہے۔ وہ شہداء و شہیت سے جیتنا اس قابل نہیں کہ انہیں مرزا کے باقی کلام کے ساتھ محفوظ رکھا جائے۔ یہی غیر متداول کلام کیلئے کرتے وقت ان اشعار کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور روایت ٹھیکہ دہلی غزل کے دو شعر جو سو قیاد یا شاعرانہ فن سے جاری تھے حذف کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ غالب کے مست فیر متعدد اہل کلام کا مکمل ترین مجموعہ و شہداء صاحبؔ نامہ میں ہے۔

مگر یہ قلم چاہا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ غالبؔ مرزا کے دیوان و مقلدوں کی غزلیات کو کلام غالب نہیں سمجھتے۔

فروغِ حسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام
اگرچہ تھایا ارادہ مگر خدا کا شکر
بضرِ بے تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
ردار کھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکلیف کلام"
اسمِ ادا تم فلک پر جس کو کہتے ہیں
آپنے سنی الضرب کہا ہے تو سہی
رنجِ طاقت سے سوا ہر تو نہ پیوں کیوں کر
ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
دوست ہی کوئی نہیں جو کرے چارہ گری
غیر سے دیکھے کیا خوب بنائی اس نے
نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں نہیں

جو رختِ خواب ہے پردیں توبے پر نیکہ
اٹھا سکانہ نزاکت سے گلبدنِ نیکہ
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہنِ نیکہ
رکھو نہ شمع پر اسے اہلِ انجمنِ نیکہ
انھائے کیونکہ یہ رنجِ خستہ تنِ نیکہ
ہوئی ہے اس کو مریٰ نعش بے کفنِ نیکہ
کہ سانپِ فرش ہے اور سانپِ کپڑنِ نیکہ
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخنِ نیکہ"
فقیرِ غالب سکیں کا ہے سہنِ نیکہ
یہ بھی اسے حضرتِ ایوبؑ بگلا ہے تو سہی
ذہن میں خوبیِ تسلیم درضابے تو سہی
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
نہ سہی نیک تمنائے دوا ہے تو سہی
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں نلے تو سہی
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائگی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی

کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہے ؟ تکلف بہر طرف تجھ سے تری بصیر بہتر ہے
 ذرا کر زور سینہ پر کہ تیر پرستم نکلے ؟ جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
 خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ ؟ کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کا فرض نہ نکلے
 جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں کپڑوں میں جو یئیں بچنے کے ٹانگوں سے گواہیں

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی
 تم ہو بہت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
 کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں باریب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
 غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرت ماہ میں ہوں پیشہ بہت ادہ نہ ہوا اور سہی
 حسن میں حر سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی آپکا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
 تیرے کو چے کا ہے مائل دل مضطر میرا کعبہ اک اور سہی قبضہ نما اور سہی
 کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
 مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں زہر کچھ اور سہی آب بقت اور سہی

مجھ سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی

۱۲۸۲ء

ایک بیداد گر نے رنج فساد اور سہی

لطف نظارہ قاتل دم بسمل آنے جان چلے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے

آن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو لے شیخ
آئیں جس بنم میں وہ لوگ پکاراٹھتے ہیں
ویدہ خوں بارہے مدت وے آج ندیم
سامنا حوروں پر نے نکلیا ہے نہ کریں ،
اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالت

دوست جو ساتھ مرے تالاب ساحل آئے
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
لودہ برہم زین ہنگامہ محفل آئے
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

سختگیر بیجا

بسکہ فعال مایہ دید ہے آج
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
گاہ رو کر کہا کئے باہم
اس طرح کے وصال سے یارب

ہر محسوس انگستاں کا
نہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
تشنہ خوں ہے ہر مسلمان کا
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
سوزش داغہائے پنہاں کا
ماجرا ویدہ لائے گریاں کا
کیا مٹے دل سے داغ ہجران کا (۱۸۵۷)

فرد

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے
روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

قصیدہ

ملاؤ کشور و لشکر پناہ شہر و سپاہ
بلند رتبہ و حاکم وہ سہ فرازا میر
وہ محض رحمت و رافت کہ ہر اہل جاں
وہ عین عدل کہ دہشت سے جسکی پیش کے
زمین سے سودہ گوہر اٹھے بجائے غبار
وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں آہی شکر
یہ اسکے عدل سے اصداد کو ہے آمیزش
ہر برہنچے سے لیتا ہے کام شانے کا
نہ آفتاب نہ آفتاب کا ہم حشم
خدا نے اسکو دیا ایک خوب و فرزند
نہ ہے ستارہ روشن کہ جو اسے دیکھے
خدا سے یہ ہے توقع کہ عہد طفلی میں
جوان ہو کے کریگا یہ وہ جہاں بانی
کہے گی خلق اسے داویر سپہر شکوہ
عطا کرے گا خداوند کار ساز اسے
ملے گی اس کو وہ عقل نہفتہ وال کہ اسے

جناب عالی امین برون والا جاہ
کہ باج تاج سے لیتا ہے جسکا طوق
نیا بت دم عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
بنے ہے شعلہ آتش انیس پرہ کماہ
جہاں ہو تو حسن چہشت کا اسکے جولاں گاہ
وہ خشمگین ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سراہ
کبھی جو ہوتی ہے ابھی ہوئی دم روباہ
نہ بادشاہ و نہ مرتبہ میں ہمسر شاہ
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ
شعاع مہر و خشاں ہو اس کا تارنگاہ
بنے کما شرق سے تا غرب اس کا بازنگاہ
کہ تابع اسکے ہوں روز شب سپید سیا
لکھیں گے لوگ اسے خسرو ستارہ سپاہ
ردان روشن و خیرے خوش و دل آگاہ
پڑے نہ قطع خصومت میں آتیج گواہ

یہ ترک تاز سے پریم کرے گا کشورِ دوس
 سنیں عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھادون
 یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہر جائیں
 یہ لیجا بادشہ ہیں سے چھین تخت و کلاہ
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و بچا
 دراز اس کی ہو مگر اس قدر سخن کوتاہ

۱۲۶۶ھ

اس کتاب طرب نصاب نے جب
 فکر تاریخ سال میں مجھ کو
 ہند سے پہلے سات سات کے دو
 اور پھر ہند سے تھسا بارہ کا
 سال ہجری تو ہو گیا معلوم
 مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
 سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
 عرض اس سے ہیں چارہ معصوم
 اور بارہ امام ہیں بارہ
 ان کو غالب یہ سال اچھا ہے
 آب و تاب انطباع کی پائی
 ایک صورت نئی نظر آئی
 دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
 با ہزاراں ہزار زیبائی
 بے شمول عبارت آرائی
 ہے جداگانہ کار فرمائی
 بہ امیر سعادت افزائی
 جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
 جن سے ایساں کو ہے توانائی
 جو ایمہ کے ہیں تولائی

سہرا

ہم نشین تارے ہیں اور چاند شہاب اللہ میں
 آن کو لڑیاں نہ کہو جس کی مویں سمجھو
 بزم شادی ہے فلک کا ہکشاں ہے
 ہے تو کشتی میں وے بحر رواں ہے

قصیدہ

مرحبا! سالِ فخرِ خجائی
 شب و روز افتخارِ لیل و نہار
 گرچہ ہے بعدِ عید کے فروز
 سو اس اکیس دن میں ہولی کی
 شہر میں کو بہ کو عبید و گللال
 شہر گویا نمونہ گلزار
 تین تیدار اور ایسے خوب
 پھر ہوئی ہے اسی پہننے میں
 محفلِ غسلِ صحتِ نواب
 بزمِ گہ میں ہمیشہ شاہِ نشان
 پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ
 جن کی سند کا آسماں گوشہ
 جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
 وہ ہیں اس طرح کی بزمِ سرور
 انجمِ چرخ گوہر آگین فرش
 راجہ اندر کا جو اکھاڑہ ہے
 عیدِ شوال و ماہِ فروز
 مہ و سالِ اشرفِ شہور و سنیں
 لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
 جا بجا مجلسیں ہوں رنگیں
 باغ میں سو بسوگل و نسریں
 باغ گویا مکار خانہ چیں
 جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
 منعقد محفلِ نشاط و قدیں
 رونقِ افزائے مسندِ تکیں
 رزم گہ میں حریفِ شیر مکیں
 خیر خواہ جنابِ دولت و دیں
 جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
 آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
 نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
 نور ہے ماہِ ساغرِ سیمیں
 ہے وہ بالائے سطحِ چرخ بریں

وہ نظر گاہِ اہل دہم و خیال
وال کہاں یہ عطا و بذل و کرم
یاں زمیں پر نظر جہان تک چلے
نغمہ مطربانِ زہرہ نوا
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے نظرون
سرورِ مہرِ ہند ہوا جو سواد
سب نے جانا کہ ہے پری تو سن
نقشِ تمہیں سمند سے یک سر
فوج کی گردِ راہِ مشکِ فشان
بس کہ بخشی ہے فوج کو عزت
موجبِ خاص یوں زمین پر تھا
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
اور داغِ آپ کی اسلامی کا
بندہ پرورِ شینا طرازِ سی سے
آپ کی مدح اور میسرانہ
اور پیراب کے ضعفِ پیری سے
پیری و نیستی! خدا کی پناہ

یہ ضیا بخش چشمِ اہل یقین
کہ جہاں گد یہ گر کا نام نہیں
مثالہ آسانچے ہیں در شہیں
جلوہٴ لولیانِ ماہِ حبس
یاں وہ دیکھا یہ چشمِ صررت ہیں
بہ کمالِ تجمل و تزیین
اور بالِ پری ہے دامنِ زین
بن گیا دشتِ دامنِ گلچیں
رہِ ردوں کے مشامِ عطر آگین
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزین
جس طرح ہو سپہر پر پروں
ران پر داغِ تازہ دیکھے وہیر
خاص بہرام کا ہے زیبِ سریر
مدعا عرضِ فنِ شعرِ نہیر
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقین
ہو گیا ہوں نزارِ زار و جزیر
دستِ خالی و خاطرِ غمگین

صرف اظہار ہے ارادت کا
مدح گستر نہیں دعا گو ہے
ہے قلم کو جو سجدہ ریز زمین
غالب عاجز نیا ز آگین
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ حبا و دال آسین

خاتمہ

دم واپس بر سر راہ ہے

عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے

مآخذ

- ۱- دیوان غالب - قلمی نسخہ بمطبعہ پال لاہور ۱۲۳۶ھ (مطبوعہ نسخہ حمیدیت)
 - ۲- میخانہ آرزو (فارسی نظم و نثر) قلمی نسخہ ۱۲۳۶ھ خدا بخش لاہور ۱۲۵۸ھ
 - ۳- دیوان غالب مطبوعہ (۱۸۴۲ء) میلو کہ خان بیاد سید ابو محمد کلکتہ پری پریٹ
 - ۴- نقل دیوان غالب فارسی (۱۸۴۲ء) قلمی نسخہ ۱۲۵۸ھ رام پور سٹیٹ لاہور ۱۲۵۸ھ
 - ۵- بیچ آبنگ اندیا آفس لاہور ۱۲۵۸ھ ۱۲۵۸ھ
 - ۶- دیوان غالب اردو قلمی نسخہ ۱۲۵۸ھ رام پور سٹیٹ لاہور ۱۲۵۸ھ
- کلیات نظم فارسی - کلیات نثر فارسی - اردو نئے سلا - عرب ہندی - خوش گویائی وغیرہ وغیرہ

- (۱) عیار الشرا قلمی نسخہ آفس لاہور ۱۲۵۸ھ
 - (۲) تذکرہ سرور - قلمی - اندیا آفس لاہور ۱۲۵۸ھ
 - (۳) گلشن چنار - قلمی - برٹش میرٹھ ۱۲۵۸ھ
 - (۴) دلی ریڈیو قلمی کے ریونیوریکارڈز
 - (۵) آثار العنادیہ ۱۲۵۸ھ
 - (۶) تذکرۃ الشعراء اردو - مولوی کریم الدین ۱۲۵۸ھ
- گلشن بیخوار - جسیرہ نثر - تذکرۃ غوثیہ - کلیات شیعہ و غیسرہ و غیسرہ

تصاویر غالب

غالب نے ۱۸۶۵ء میں اپنی ایک تصویر بڑودہ میں نواب میر ابراہیم علی خاں دانا کو بھیجی تھی۔ خیال تھا کہ اس سند تصویر کی ایک نقل ہم شایع کر سکیں گے۔ لیکن میرا انتظام علی خاں صاحب سے جو نواب مرحوم کے پوتے ہیں معلوم ہوا ہے کہ آج سے ۳۰-۳۵ سال پہلے مظہر دہلوی یہ تصویر دہلی لیکے گئے تھے۔ ہم نے خواجہ حسن نظامی صاحب کی دسالت سے دہلی میں اس تصویر کی تلاش کی۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

ہم تصویر کے متعلق مترود تھے۔ کہ حُسن اتفاق سے نواب میرا الدین دانی لودرا، نواب سورت میں تشریف لے آئے۔ آپ نہ صرف مرزا کے ایک قریبی عزیز ہیں۔ بلکہ آپ کو غالب سے ملاقات کا فخر حاصل رہا ہے۔ لودرا مرزا کا ایک خط آپ کے نام اردو کے معنی میں موجود ہے۔ آپ ازراہ کرم بخشی کئی مرتبہ غریب خانہ پر تشریف لائے اور گھنٹوں غالب کے متعلق سوالات کا جواب دیتے رہے جس سے اس کتاب کے کئی اندراجات کی تصدیق ہو سکی۔ تصاویر متعلق اپنے فرمایا کہ مرزا کی وفات سے دو تین سال پہلے اُن کی عکسی تصویر سدھار دی خاں نوٹو گرافر نے کھینچی تھی۔ اسکی نقیہ اب عام طور پر ملتی ہیں۔ اصل تصویر میرے پاس ہے۔ مرزا نے اسکی نقیہ مختلف دوستوں کو بھیجی تھیں اس تصویر کے علاوہ نواب ممدوح کے پاس مرزا کی آخری دستخطی تحریر ہے۔ جس میں انہوں نے مرنے سے چند مہینے پہلے نواب علامہ الدین کو اردو شاعری میں اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ مرزا اس زمانے میں خطوط دوسروں سے مکھواتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تحریر ایک سند تھی اسے انہوں نے تمام و کمال اپنے ہاتھ سے لکھا۔

گدشتہ چند سالوں میں غالب کی جو کئی تصویریں شایع ہوئی ہیں وہ ہم نے نواب صاحب کو دکھائیں لیکن انہوں نے کسی کی تصدیق نہیں کی۔ نیز حمید یہ میر غالب کی تصویر شایع ہوئی ہے وہ مہروانہ نقد ندر سے اچھی ہے لیکن یہ سبب اسے غالب غالب کے معیار میں کوئی پار نہیں دیکھا۔ غالب کی جوانی کی جو رنگین تصویر مکمل شمع کلام غالب میں شایع ہوئی ہے وہ تو یقیناً نائنہ حال کی ہے۔ تاریخ ادبیات اردو میں بھی غالب کی ایک نئی تصویر ہے یہ بھی اس کتاب کیلئے مال ہی میں حکیم محمد حسن مصور نے تیار کی۔ غالب کی ایک معاصرانہ تصویر لال قند دہلی میں موجود ہے۔ یہ غالب ابھی تک کہیں شایع نہیں ہوئی۔

مرکز اشاعتیں پریس لاہور میں بہت نام بخیر عظیم الدین منادی پرنٹر و پبلشر چھپرہ دکن مسلم گجرات سورت سے شائع ہوا۔ فیض کا

1

2

3

4

TITLE _____

T 2108.06

T 27

T 07.10.06

T 18.11.06

THE BOOK MUST BE

T 27

THE TIME

T 03.01.08

T 15.00.08

T 01.11.08

T 31.05.08.

USED TEXT BOOK

Date

N

T 31.05.08

CC 235

T 01.11.08

B 362/7

T 11.12.08

DD 1565



MAULANA AZAD LIBRARY

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

T 11.12.08

RULES:-

T 11.11.08

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of **Re. 1-00** per volume per day shall be charged for text-book and **10 Paise** per volume per day for general books kept over-due.